

مرتبہ

ممتاز منگلوری

سوغات

(شخصیّہ)

بخدمت استاد عالی مرتبت جناب

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

سابق صدر شعبہ اردو و عربی پنجاب یونیورسٹی
و پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

مرتبہ

ممتاز منگلوری

منجانب

مجلس ارادت مندانِ سیّد

لاہور

بار اول : اپریل ۱۹۶۷ع

تعداد اشاعت : ایک ہزار

قیمت : ۱۲ [redacted] روپے

طابع : ۱- انفائن پرنٹنگ پریس، لاہور
۲- جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور

مہتمم : مرزا نصیر بیگ

ملنے کا پتہ

مکتبہ خیابان ادب ۳۹- چیمبرلین روڈ
لاہور



استاذ الاساتذہ ڈاکٹر سید عبداللہ ایم ۔ اے ، ڈی لٹ

فہرست

پیش لفظ

(از عالی جناب جسٹس سجاد احمد جان صاحب ، جج ، مغربی پاکستان ہائی کورٹ ، لاہور و صدر مجلس ارادت مندان سید)

محترم سید عبداللہ صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جو بلندیٔ فکر ، گفتار اور کردار کے باعث اپنی شخصیتوں میں ایسا مقناطیسی اثر پیدا کر لیتے ہیں کہ لامحالہ اُن کے گرد و پیش ایک وسیع حلقۂ عقیدت پیدا ہو جاتا ہے - مجلس ارادت مندان سید اسی تاثر کی تخلیق ہے جس کی سر براہی پر مجھے اس لیے خوشی اور اطمینان ہے کہ سید صاحب کی ذات گرامی کے لیے میرا جذبۂ عقیدت کسی اور سے کم نہیں -

مجھے یہ بھی شرف حاصل ہے کہ میں اور وہ ہم وطن ہیں جس سے مخصوص وطنیت مراد ہے - ہم دونوں پیدائشی اور طفلی ماحول کے اعتبار سے ضلع ہزارہ کی پر کیف وادیوں اور پرفضا گھاٹیوں سے وابستہ ہیں - اپنے ضلع پر خدائے برتر کی گوناگوں نعمتوں کا تصور جب میرے ذہن میں آتا ہے تو ادبی اور سماجی اُفق پر سید محمد عبداللہ کا نام مجھے سر فہرست نظر آتا ہے - سید صاحب کو لاہور کے نئے مسکن نے اپنی علمی اور فنی جاذبیت سے جذب کر لیا ہے لیکن اُن کے وطن مالوف کی فضاؤں میں ماں کی گود کی طرح اُن کے لیے محبت اور تڑپ میں کوئی کمی واقعہ نہیں ہوئی -

میں اصطلاحی طور پر سید محمد عبداللہ صاحب کا شاگرد نہیں لیکن معنوی شاگردی کا دعویٰ کر سکتا ہوں - انکساری ، خلوص ، مقصد کے لیے بے لوث لگاؤ اور اس کے لیے انتھک محنت ، اسلامی شعار پر محکم یقین اور فخر اُن کی عملی زندگی کے ایسے سبق ہیں جو اُن کے عقیدتمندوں پر بلا تکلف نقش ہو جاتے ہیں - اگر وہ اُن کے اعمال میں پیوست نہ ہو سکیں تو یہ اُن اسباق کی افادیت اور اثر کی کمی نہیں بلکہ کردار کی پختگی میں خامی ہے -

" سوغات " اُن مضامین اور مقالات کا مجموعہ ہے جو گزشتہ اپریل میں سید صاحب کی ساٹھویں سالگرہ پر پڑھے گئے تھے ، جسے سید صاحب کے

شاگردوں اور مداحوں کا مختصر گروہ بڑے تزک و احتشام سے منانا چاہتا تھا لیکن وہ سید صاحب کی تحریک پر بڑی طمانیت اور سنجیدگی سے تجدید عزم کے جذبہ سے سر انجام پایا - اور اُن آہنی عزائم کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کیا گیا جو سید صاحب کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں اور جن کی تکمیل میں اُن کی تمام زندگی صرف ہوئی ہے اور جن کے حصول کے لیے وہ اپنی بقایا زندگی بھی وقف کر چکے ہیں یعنی اردو زبان کی قومی حیثیت کا استحکام اور ترویج اور پاکستانی معاشرہ کے لیے اُس کی اصلی اقدار کی پہچان اور ملی کردار میں اُن کی سرائیت - اُن کا یہ احساس بالکل درست ہے کہ ہم جب تک اجنبی زبان کے غلبہ سے نجات حاصل نہیں کریں گے ہماری اپنی اقدار کبھی بھی اُبھرنے نہیں پائیں گی بلکہ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اغیار سے مانگی ہوئی اور تصنع سے اپنائی ہوئی اقدار کے بوجھ تلے دبے رہیں گے اور مصیبت یہ ہے کہ اُن مصنوعی اقدار کی ظاہری چمک نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے -

''سوغات'' کے مضامین سید صاحب کے انہیں عزائم کو روشناس کرانے اور اُن کی ترویج کے لیے ایک قابل قدر کوشش ہے - میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سید صاحب اور اُن کے حلقہ بگوشوں کی ہمت اور ارادوں میں برکت ڈالے کہ وہ علی التواتر اپنے بلند نصب العین کے حصول کے لیے خاموش اور ٹھوس خدمت کرتے چلے جائیں تاکہ اردو کی کماحقہ' ترقی ہو سکے اور اسلامی معاشرہ پاکستان میں پوری آب و تاب سے پروان چڑھے اور اُفق عالم پر چھا جائے - آمین !

لاہور

۳۱ مارچ ۱۹۶۷ء

سجاد احمد جان

عرض سپاس

''سوغات'' پیش خدمت ہے۔ اگرچہ یہ استاذالاساتذہ مخدومی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی شخصیت اور علمی ادبی کارناموں سے متعلق مضامین کا مجموعہ ہے لیکن اس عذر کے ساتھ پیش خدمت ہے کہ شاید اس میں استاد معظم کی شخصیت اور ادب کا اور ان کی عظمت کا ایک ہزارواں حصہ بھی منعکس نہیں ہو سکا۔ اس کی چند در چند وجوہ ہیں۔ اول تو یہ کہ اس مجموعے کے لیے کوئی تازہ مضامین نہیں لکھوائے گئے بلکہ یہ صرف ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً استاذ گرامی قدر سے متعلق اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہے۔ یا ''تجدید عزم'' کی تقریب میں ۵ اپریل ۶۶ء کو استاذ معظم کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر پڑھے گئے۔

استاد گرامی منزلت نے اپنی شخصیت کو شہرت سے ہمیشہ چھپائے رکھا، اگر کبھی ان کے کسی شاگرد نے کچھ لکھنے کا ارادہ بھی کیا تو اس خوف سے قلم نہ اٹھا سکا کہ وہ ناراض ہوں گے کیونکہ ان کے بارے میں کچھ لکھ دینے کے بعد نہ صرف یہ کہ ڈانٹ سننی پڑتی ہے بلکہ مہینوں وہ روٹھے رہتے ہیں اور ان کا روٹھ جانا ان کے ارادتمندوں اور شاگردوں کے لیے کس قدر سوہان روح ہوتا ہوگا یہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں کبھی عزیز از جان محبوب کے روٹھ جانے کا تجربہ ہوا ہو۔ تجدید عزم کی تقریب میں بھی تلامذہ کو کچھ تو یہی خوف دامنگیر رہا اور کچھ ستم یہ بھی ہوا کہ قبلہ سید صاحب محترم نے میرے علم کے بغیر تقریب سے چند دن پہلے اپنے تمام شاگردوں اور ارادتمندوں کو ایک ہدایت نامہ بلکہ حکم نامہ جاری کر دیا جس میں سختی سے اس امر کی تاکید کی گئی تھی کہ تقریب میں ان سے متعلق کسی قسم کا مضمون یا مقالہ نہ پڑھا جائے بلکہ عام علمی ادبی مقالات پڑھے جائیں۔ اس لیے اکثر احباب نے میرے خطوں کے جواب میں احکام مرشد کے حوالے سے معذوری ظاہر کی۔

''سوغات'' درحقیقت اس تجویز کی ایک کڑی ہے جو مجلس ارادت مندان سید نے مارچ ۶۶ء میں جناب حکیم احمد شجاع صاحب کی صدارت میں ایک اجلاس میں منظور کرتے ہوئے فیصلہ کیا تھا کہ تقریب کے موقع پر تحائف کی بجائے استاد معظم کی خدمت میں ان کے ''تعلیمی خطبات'' اور ان کی شخصیت سے متعلق شائع شدہ مضامین کو کتابی صورت میں ان کی خدمت میں

پیش کیا جائے۔ ''تعلیمی خطبات'' تو تقریب میں کتابی صورت میں پیش کر دئے گئے لیکن یہ ''سوغات'' بوجوہ اس وقت تک مکمل نہ چھپ سکی۔ تقریب کے گزر جانے کے بعد کچھ میں سست ہو گیا کچھ وہ احباب جنہوں نے تقریب میں پڑھے گئے مقالات بھجوانے کا وعدہ کیا تھا اس طرح تاخیر در تاخیر ہوتی گئی اور آج جبکہ (یکم اکتوبر ۱۹۶۶ء) کو استاذ معظم باقاعدہ طور پر یونیورسٹی سے علیحدہ ہو رہے ہیں میں نے اس کتاب کو جلد منظر عام پر لانے کا عزم کرتے ہوئے احباب کے وعدوں کا مزید انتظار ترک کر کے یہ چند معروضات لکھنی شروع کی ہیں اگر اور کوئی ایسی مجبوری نہ آ پڑی جس کا حل میرے بس سے باہر ہوا تو انشا اللہ جلد چھپ جائے گی۔

میں نے اپنی طرف سے مضامین ایک خاص ترتیب سے پیش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کچھ حصہ اس ترتیب سے چھپا اور پھر یوم تجدید عزم کے بعد جب طباعت میں تاخیر ہو گئی تو چند مضامین اور بھی مل گئے جنھیں شریک کرنا ناگزیر تھا لہذا ترتیب کا مجوزہ خاکہ درہم برہم ہو گیا۔

جن احباب کے مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں، ان کے تعاون کے لیے شکر گزار ہوں اور جن احباب کے مضامین انتظار کے باوجود نہیں مل سکے ان کا افسوس ہے اور خصوصاً جناب سید مسعود احمد اثیر اور ملک حسن اختر صاحب کے مضامین کے شامل نہ ہو سکنے کا زیادہ افسوس ہے، یہ مضامین تقریب سے پہلے اخبارات کو اشاعت کے لیے بھجوائے گئے تھے لیکن اخبارات میں ان کی اشاعت کی بجائے ان کے مسودات سے بھی محروم ہونا پڑا جس کے لیے از حد معذرت خواہ ہوں۔

میں مجلس ارادت مندان سید کے صدر جناب جسٹس سجاد احمد جان صاحب کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس مجموعے کے لیے اپنے خیالات عالیہ پیش لفظ کے طور پر رقم فرمائے نیز مجلس کی کارکردگی میں دلچسپی کے علاوہ ان کاموں کی تکمیل کے لیے بہ کمال شفقت میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔

آخر میں مکرر عرض ہے کہ ''سوغات'' ارادت مندان سید کی عقیدت کا ایک مظہر ہے۔ یہ نہ تو اس عقیدت کی پوری پوری آئینہ داری کر سکتی نہ استاد گرامی منزلت کی عظیم علمی ادبی شخصیت کی پوری عکاسی۔ اس لیے میں خود بھی اسے ''برگ سبز است تحفۂ درویش'' سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔

یکم اکتوبر ۶۶ء
اردو نگر، شاہراہ ملتان، لاہور

ممتاز منگلوری
معتمد مجلس ارادت مندان سید

شمیم احمد

ڈاکٹر سید عبداللہ

آج تک میں نے اردو کے جن سپاہیوں کے بارے میں قومی زبان میں کچھ لکھا ہے ان کے لیے ہمیشہ میری خواہش یہ رہی ہے کہ وہ خود بھی میری تحریر کو پڑھیں لیکن اس بار میں دعا کر رہا ہوں کہ خدا کرے یہ تحریر ڈاکٹر سید عبداللہ کی نظروں سے نہ گزرے کیونکہ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اس سلسلے میں ان پر کچھ بھی نہیں لکھوں گا۔ ویسے ڈاکٹر صاحب نے خود بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی، چند جملوں کے علاوہ کچھ بھی مجھے حاصل نہ ہوا۔ میں ان سے شاکی بھی ہوں لیکن جتنا وقت گزرتا جا رہا ہے اُن کے کردار کی عظمت نکھرتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار ان سپاہیوں میں ہوتا ہے جن کی زندگی کا مقصد اپنے نصب العین کے لیے سب کچھ قربان کر دینا ہوتا ہے اور ان کی راحت اور سعادت کسی مقصد کے لیے جان قربان کر دینے میں مضمر ہوتی ہے۔ آج کے ''سپاہیوں'' کی طرح نہیں جو جرأت اور ہمت بھی اس لیے دکھاتے ہیں کہ اخبار میں ان کی تصویر آ جائے۔ اسی لیے جب میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے اورینٹل کالج پہنچا تو انہوں نے میری آمد کی غرض و غایت کو معلوم کر کے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا بلکہ کسی حد تک بے نیازی اور رکھائی ان کے لہجے میں پیدا ہو گئی۔ میرے اصرار پر انہوں نے کہا در اصل میں آپ کے انٹرویو کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں اور نہ ہو سکوں گا کیونکہ آپ جس عنوان کے تحت یہ انٹرویو لیتے ہیں میں نہ اس کا اہل ہوں اور نہ اپنی دانست میں اردو کے لیے وہ سب کچھ کر سکا ہوں جس کی بنا پر اس خطاب کا سزاوار خود کو سمجھ لوں۔ ڈاکٹر صاحب کے لہجے میں اس وقت بہت وقار تھا اور ان کی جھکی ہوئی گردن ایک دکھ کا اظہار بھی کر رہی تھی جسے صرف میں ہی محسوس کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہر کام کرنے والے کی تسکین صرف اس عمل میں ہوتی

ہے جو وہ کر رہا ہے ۔ میں پبلسٹی کا دشمن نہیں ہوں مگر یہ بھی اس وقت زیب دیتی ہے جب کسی شخص نے واقعی خدمات انجام دی ہوں ۔ میں آپ کے اس سلسلے میں کیسے شامل ہو سکتا ہوں جبکہ اپنے بارے میں مجھے یہ احساس ہے کہ میں اردو کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا ہوں" ڈاکٹر صاحب اس کے بعد خاموش ہو گئے ۔ مجھے کسی حد تک اس بات سے تکلیف سی محسوس ہوئی کے ان کی بے نیازی شاید مجھے نظر انداز کر رہی ہے لیکن جب انھوں نے بالکل ذاتی سوالات مجھ سے کرنے شروع کیے تو دل کے کسی گوشے سے یہ خواہش ابھری کہ ہماری قومی سطح پر اتنی بے غرضی اور نام و نمود کی خواہش سے احتراز پیدا ہو جاتا تو ہمارا معاشرہ واقعی ایک مثالی معاشرہ بن جاتا ۔ مگر افسوس! سوائے ذاتی منفعت، خود غرضی نام و نمود اور ہوس اقتدار کے اس وقت کوئی قدر معاشرے میں باقی نہیں رہی ہے ۔ ہمارا معاشرہ اسی لیے خلوص اور اقدار سے تہی ہوتا جا رہا ہے ۔

ڈاکٹر صاحب کو میں نے بہت کاوے دیے مگر وہ کسی طرح اپنے بارے میں ایک لفظ بھی زبان سے نکالنے پر آمادہ نہیں تھے ۔ اردو کے بارے میں میرے مخصوص سوالات کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ اس سلسلے میں اپنے خیالات کا میں اس قدر اعادہ کر چکا ہوں کہ آپ کو دہرائے ہوئے خیالات میں کوئی مزا نہیں آئے گا ۔ بعض سوالات پر البتہ وہ کچھ پسیجے ۔ اس میں ایک سوال مولوی عبدالحق مرحوم کے بارے میں تھا ۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ مولوی صاحب کی خدمات کا اندازہ ابھی نہیں کیا جا رہا ہے ، جتنا وقت گزرے گا اتنی ہی ان کے کارناموں کی اہمیت واضح ہو گی ۔ اردو کی خدمت کے علاوہ ان کی ایک اور حیثیت بہت بلند ہے اور وہ ہے ایک محقق کی ۔ جہاں تک تنقید کا سوال ہے آج کا نیا ذہن اُن کی تنقید کی اہمیت کو زیادہ محسوس نہیں کر رہا ہے لیکن اردو کی تنقید کا ارتقا جن حالات میں ہوا ہے اس اعتبار سے مولوی عبدالحق کی تنقید نے حقیقت پسندی اور ادب کو پرکھنے کے معیار مقرر کیے ہیں اور ابتدائی تنقید کو ایک سنجیدہ اور مستقل کام کی نوعیت قرار دینے میں مولوی صاحب کی تنقیدات کو بہت اہمیت حاصل ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مولوی صاحب پر ایک ایسی مستقل کتاب تصنیف کی جائے جو ان

کی ادبی حیثیت کو متعین کر سکے - اردو کے نفاذ کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کو ہمارے یہاں کے ایک طبقے کی ذہنیت پر بہت افسوس ہوتا ہے - ان کا کہنا ہے کہ یہ طبقہ جو اتفاق سے صاحب اقتدار بھی ہے ایک بیمار ذہنیت کا شکار ہو گیا ہے ، وہ اردو کے سلسلے میں ہمیشہ مخالفانہ منطق سے کام لیتا رہا ہے جبکہ مثبت کاموں میں یہ ذہنیت نہ صرف مضر ہوتی ہے بلکہ اجتماعی شعور کو شدید بحران میں مبتلا کر دیتی ہے- ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ مثبت کاموں' اجتماعی فائدے اور خواهشات کے سلسلے میں جذبے کی منطق سے کام لینا چاہیے اسی جذبے کی منطق سے جو تخلیق پاکستان کا سبب بنا' جو ہماری اجتماعی خواهشات کی علامت بن گیا تھا - اردو بھی تحریک پاکستان کی ایک بنیادی محرک رہی ہے اور پاکستان کی تخلیق کے بعد جب قومی خواهشات کے اعتبار سے صرف اردو ہی ایک اجتماعی علامت اور خواهش رہ گئی ہے اس کے لیے تو اور بھی جذبے کی منطق کی ضرورت تھی - ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ جب ہمیں قومی زبان اور اردو کی افادیت کا اعتراف ہے تو اس کے نفاذ میں ہمیں کسی قسم کی الجھن محسوس نہیں ہونی چاہیے - اسے اسی وقت نافذ کیا جا سکتا ہے اور یہ پاکستان کی اجتماعی نفسیات پر بڑا گہرا اثر مرتب کرے گی -

ڈاکٹر صاحب اس وقت صرف جذبے کی منطق ہی کو ثابت نہیں کر رہے تھے بلکہ اس منطق سے کام لے رہے تھے جس سے بڑے بڑے قومی مسائل حل کیے جا سکتے ہیں ، خالص سوچی سمجھی ہوئی سنجیدہ فکر ! وہ کہہ رہے تھے کہ ہر چیز بغیر کسی سپرٹ کے نہ پیدا کی جا سکتی اور نہ فائدہ مند ہو سکتی ہے - انھوں نے فرمایا کہ خود اردو کی تحریک کس طرح شروع ہوئی اور کیسے وہ آگے چل کر تحریک پاکستان میں تبدیل ہو گئی ، یہ صرف ایک سپرٹ کا کارنامہ تھا - ہندوؤں کی ضد یہ تھی کہ اردو کو ترک کر کے ہندی کو رائج کیا جائے کیونکہ ان کے تعصب کی منطق یہ تھی کہ اردو مسلمانوں کی تہذیبی علامت کی حیثیت رکھتی ہے - اس کو مٹا کر وہ مسلمانوں کی تہذیب کی آخری یادگار بھی مٹانے کے در پے ہو گئے تھے - ان کی مخالفانہ منطق پر جب اردو کی مثبت اور جذبے کی منطق کی تحریک شروع ہو گئی تو ہندوستان گیر انقلاب کا آغاز ہو گیا - یہ سب کچھ

کیا تھا ایک سپرٹ، ایک جذبہ ! ڈاکٹر صاحب نے بہت متاسفانہ لہجے میں کہا ''آج ہماری قوم سپرٹ اور جذبے سے محروم کی جا رہی ہے۔ یہ ہمیں ایک خطرناک راہ پر گامزن کر رہی ہے۔'' انھوں نے دعا کی کہ خدا کرے ہمارے معاشرے کے نوجوانوں میں یہ جذبہ اور سپرٹ پیدا ہو جائے تو ہمیں پھر کسی بات کی پروا نہ رہے۔

اگر آپ نے ڈاکٹر سید عبداللہ کو نہیں دیکھا ہے تو آپ اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ جو شخصیات خود ایک تحریک بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں وہ ہمارے لیے اتنی ''جاذب توجہ'' نہیں ہوتیں جتنی عموماً فنون لطیفہ سے متعلق شخصیات ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کامیاب لیڈر کی پہچان ہے کہ عام طور پر عام سطح پر ذرا اجنبی محسوس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے مل کر مجھے یہی احساس ہوا کہ وہ میرے لیے کشش کا سبب نہیں بنے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی گفتگو بڑی حد تک سنجیدہ اور اصولی ہوتے ہوئے بھی ایک تیکھا پن بھی رکھتی ہے، جو انھیں آپ کے قریب آنے سے روکتی ہے، حالانکہ ان کے الفاظ میں خلوص کی نرمی محسوس ہوتی ہے مگر منطق کا ٹھہراؤ انھیں ایک بظاہر خشک عملی شخصیت بنا دیتا ہے، بظاہر میں نے اس لیے کہا کہ ان کی تحریروں میں یہ بات نہیں نظر آتی، اس میں ایک گھلاوٹ محبت اور نرماہٹ ملتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انھوں نے اپنی اصل شخصیت پر بہت سے پردے ڈال رکھے ہیں اس کی ایک وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی پوری زندگی مسلسل کشمکش اور جد وجہد میں گزری ہے۔ انھوں نے ۳۵ سال تک مسلسل ریاضت اور جگر کاوی کے بعد اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ خدا جانے یہ بات میں نے کہاں تک صحیح کہی ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان کی تحریروں اور ان کی شخصیت میں اتنا فرق نہ محسوس ہوتا۔ وہ ایک تحریک بن چکے ہیں اور اردو کی تحریک اب صرف ان ہی کی ذات سے ایک زندہ اور فعال تحریک بنی ہوئی ہے اور ایک تحریک کے لیے جس سنجیدگی، وقار اور اصول پرستی کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہے اور ہمیں یہ اعتماد ان کی ذات پر اسی لیے ہے کہ وہ اگر ایک جذباتی آدمی ہوتے تو شاید اردو کی تحریک بھی جذباتی ہو کر رہ جاتی۔ لیکن اب ہمیں یہ یقین ہے کہ ان کی سرکردگی میں یہ تحریک ہمارے

معاشرے کی قوی ترین تحریک بن رہی ہے -

ڈاکٹر سید عبداللہ اس دور کی وہ واحد شخصیت ہیں جو صرف ایک رہنما اور تحریک کے روح رواں ہی نہیں ہیں (وہ عملی طور پر یقیناً اس منصب کے لیے مناسب ترین آدمی ہیں) بلکہ ان کی اہمیت عظمت میں اسی وقت مبدل ہو جاتی ہے جب وہ ہمیں ایک رہنما سے بڑے ادیب نظر آتے ہیں - یہی ان کی ذات کا سب سے گہرا اور عظیم عنصر ہے اور ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ان کا نام جب تک ادب کی لوح پر دمکتا رہے گا اردو کی تحریک بھی اس سے منسوب رہے گی - اس طرح ڈاکٹر سید عبداللہ کا کام صرف وقتی اور ایک مقصد کے لیے ہی وقف نہیں رہ جاتا بلکہ اس میں زندہ رہنے اور ادبی عظمت کے پہلو بھی شامل ہو جاتے ہیں -

ڈاکٹر صاحب نے گو کہ ہمیں خود اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا مگر اردو کے اس عظیم سپاہی کے بارے میں اگر ہم ابتدائی باتیں بھی نہ معلوم کر سکیں تو ہماری بد قسمتی ہو گی -

ڈاکٹر سیدعبداللہ، منگلور ، تحصیل مانسہرہ، ضلع ہزارہ میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم میٹرک تک ایبٹ آباد میں حاصل کی اس کے بعد تحریک خلافت کا جوش لاہور کھینچ لایا - لاہور میں مولانا احمد علی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے پھر علی گڑھ پہنچے اور کچھ عرصہ جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے، وہاں مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے لیکچر سنے، مولانا سورتی سے عربی پڑھی پھر واپس لاہور آ گئے اور اورینٹل کالج میں داخل ہوئے - ۱۹۲۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا ' ۱۹۲۵ء میں ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا ' ۲۶-۱۹۲۸ء تک پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں کیٹلا گر کی حیثیت سے کام کیا ، ۲۸-۱۹۳۲ء میں فارسی ریسرچ سکالر کی حیثیت سے ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ کے موضوع پر کام کرتے رہے - ۱۹۳۲ء میں ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا - ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری ملی اس کے بعد سے یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض کا آغاز ہوا - پہلے عربک اسسٹنٹ ہوئے، پھر صیغۂ فارسی کے صدر مدرس مقرر ہوئے، پھر اردو شعبے میں لیکچرار ، ریڈر اور پروفیسر مقرر ہوئے ۱۹۵۴ء میں اورینٹل کالج کے

پرنسپل ہوگئے اور شعبہ عربی کے اعزازی صدر بھی رہے - غرض کہ ڈاکٹر عبداللہ کی ساری زندگی علم سے متعلق رہی یہی ان کی وہ دوہری شخصیت ھے جو بہت کم لوگوں کو نصیب رہی ھے - ایک ادیب کی حیثیت میں ان کا ذکر ہر تذکرے اور تاریخ میں ہمیشہ آتا رہے گا ان کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ھے جو ان کے مرتبہ علم و ادب پر دال ھے - ڈاکٹر صاحب کی تصنیفات ' تالیفات ' مرتبات اور تراجم میں ''التنبیہات علی المکامل'' ''لطائف نامہ فخری'' ''نل دمن'' ''اردو ادب جنگ عظیم کے بعد'' ''شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن'' ''نوادرالالفاظ خان آرزو'' ''تذکرہ مردم دیدہ'' ''تعلیم کے مقاصد'' ''بحث و نظر'' ''ولی سے اقبال تک'' ''نقد میر'' ''مقامات اقبال'' ''سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کا فکری و فنی جائزہ'' ''فہرست مخطوطات پنجاب یونیورسٹی لائبریری'' اور ''ارمغان علمی'' جیسی کتابیں شامل ھیں ان کے علاوہ بے شمار مقالات رسائل میں شائع ہو چکے ھیں -

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں میں پہلے ھی لکھ چکا ہوں کہ وہ ایک عملی ادیب ھیں جن کا کام صرف ایک شعبے تک محدود نہیں ھے- ان کی خدمات کی یہ فہرست نا مکمل رہے گی اگر ان کی ایسی عملی خدمات کا تذکرہ نہ کیا جائے جنھوں نے ہمارے تمام شعبہ ھائے علم و ادب اور زبان پر گہرے اثرات چھوڑے - انھوں نے متعدد اہم کانفرنسوں کے انعقاد اور تنظیم میں گراں قدر حصہ لیا - ایسی کانفرنسوں میں پاکستان اوریئنٹل کانفرنس ، مغربی پاکستان اردو کانفرنس اور اردو تدریس کانفرنس بڑی اہمیت رکھتی ھیں علاوہ بریں یونیورسٹی اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ کمیٹی ، رسم الخط کمیٹی اور اردو کمیٹی کے کنوینر کے فرائض بھی انجام دیے - ڈاکٹر صاحب اس وقت پاکستان کے تمام اہم ادبی اداروں ' انجمنوں اور تنظیموں کے ایک سرگرم رکن ھیں' اس حیثیت میں ان کا فیض ہر جگہ جاری ھے - حکومت پاکستان نے ڈاکٹر صاحب کی ان طویل خدمات کے سلسلے میں صدارتی تمغہ اور پانچ ہزار روپے کا انعام عطا کیا ھے اس کے علاوہ حکومت ایران نے نشان سپاس بھی دیا ھے -

ڈاکٹر سید عبداللہ ہمارے اقدار سے تہی اور نصب العین سے خالی معاشرے میں خود ایک قدر اور ایک نصب العین کا درجہ رکھتے ھیں-

خلوص ، محنت ، لگن اور بے غرضی مگر نام و نمود کی خواہش سے عاری ایسی شخصیت ہمارے لیے باعث فخر بھی ہے اور طمانیت کا سبب بھی - خدا ہمیں ان کے نقوش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے -

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے مجھ پر یہ خوف پھر طاری ہو رہا ہے کہ کہیں ڈاکٹر صاحب میرے حقیر تاثرات کی جسارت سے ناراض نہ ہو جائیں وہ مجھے پکا وعدہ خلاف گردانیں گے مگر میں ان کی ناراضگی کے باوجود اتنا آپ سے کہوں گا کہ وہ صرف اردو کے سپاہی ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے سپہ سالار ہیں -

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

—×—

قومی زبان کراچی ، جولائی ۱۹۶۵ع

میر عبدالصمد

ڈاکٹر سید عبداللہ

ٹیلیفون پر جب ہم نے شاہ صاحب سے ملاقات کے لیے درخواست کی تو انھوں نے ٦ نومبر کو ساڑھے بارہ بجے کا وقت دیا - جب ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ وہ ابھی اپنے آپ کو اس مقام پر نہیں پاتے کہ ان کا انٹرویو شائع کیا جائے- انھوں نے بتایا کہ لاهور میں ایسی متعدد برگزیدہ ہستیاں موجود هیں جو ان کے اُستاد کی حیثیت رکھتی هیں - سید صاحب نے ڈاکٹر محمد شفیع، جناب جسٹس ایس اے رحمان اور بعض دوسرے ممتاز اصحاب کے علم و فضل، ادبی کارناموں اور صلاحیتوں کو سراھا اور فرمایا کہ وہ خود ان کے انٹرویو کے مطالعے سے کافی متاثر ہوئے هیں - هم نے اُن سے عرض کیا کہ علمی و ادبی حلقوں میں آپ کا بھی ایک نمایاں مقام ہے - سب آپ کو قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھتے هیں ، اس لیے هم استقلال کی وساطت سے بعض مخصوص مسائل کے بارے میں آپ کے خیالات کا لوگوں تک پہنچانا ضروری سمجھتے هیں - ڈاکٹر صاحب موصوف کا خیال تھا کہ هم انھیں اپنا سوالنامہ دیں وہ اس کے جواب میں جو کچھ لکھیں گے هم اُسے انٹرویو کی بجائے مضمون کی شکل میں شائع کریں - هم نے اپنا سوالنامہ اُن کی خدمت میں پیش کیا لیکن ساتھ هی یہ گزارش کی کہ اسے هم انٹرویو هی سمجھیں گے - هم نے انٹرویو کے اغراض و مقاصد اور اس کی ضرورت پر اتنا زور دیا کہ ڈاکٹر صاحب خاموش هو گئے - هم نے اُن سے عرض کیا کہ همارے انٹرویو کے سلسلے کا مقصد یہ ہے کہ عالم و فاضل حضرات اُن مسائل پر اپنے خیالات و افکار کا اظہار فرمائیں جو هماری معاشرت اور ثقافت سے تعلق رکھتے هیں تاکہ بعض بنیادی امور لوگوں کے بخوبی ذهن نشیں هو سکیں اور زندگی کے هر

شعبے میں اصلاح کی صورت پیدا ہو جائے - انھوں نے ۸ نومبر کو ۱۲ بجے ہمارے سوالنامے کا جواب دینے کا وعدہ کیا - جب ہم وقت مقررہ پر ان کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئے تو آن کا جواب نامہ تیار تھا - ہم نے آن سے گزارش کی کہ اسے انٹرویو کے طور پر شائع کرنے کی اجازت دی جائے - ہم سید صاحب کے نہایت شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ''اچھا جو آپ کی مرضی ہو'' کہہ کر ہمیں اس بات کی اجازت دی کہ ہم ان کے مندرجہ ذیل خیالات کو اپنے قارئین کے لیے انٹرویو کے عنوان کے تحت پیش کرنے کا فخر حاصل کر سکیں -

ہمارے اس سوال کا کہ پاکستان میں السنۂ شرقیہ کا مستقبل کیا ہے ؟ ڈاکٹر صاحب نے یہ جواب دیا :

میرا خیال ہے کہ السنۂ مشرقیہ اور علوم شرقیہ کے سوال کو دو الگ الگ مسائل کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے - میرے نزدیک اہم تر سوال علوم مشرقیہ کا ہے - السنۂ مشرقیہ کا سوال اس مقابلے میں ثانوی اور ضمنی حیثیت رکھتا ہے ـــــ علوم مشرقیہ سے میری مراد مشرق کی سب بڑی بڑی تہذیبوں ' زبانوں اور مذہبوں کا مطالعہ ہے اور ان میں (پاکستان کے خاص نقطۂ نظر سے) اسلام ، اسلامی تہذیب ، اسلامی زبانوں (عربی فارسی ترکی اردو وغیرہ وغیرہ) مسلمانوں کے علوم و فنون کے مطالعہ کو مرکزی اہمیت حاصل ہے ــــ اس سے یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ محض زبانوں کے مطالعہ کا مسئلہ اس وسیع دائرے میں صرف ایک قوس کی حیثیت رکھتا ہے -

جہاں تک السنۂ مشرقیہ کا تعلق ہے ان کا اس وقت بھی آرٹس فیکلٹی کے امتحانات میں کچھ نہ کچھ مقام متعین ہے - مگر مشرق علوم کے متعلق قوم کا نقطۂ نظر جب تک واضح نہ ہو ان کے مستقبل کے متعلق کوئی خاص پیش گوئی نہیں کی جا سکتی ــــ انگریزوں کے عہد حکومت میں علوم مشرقی (علوم اسلامی) کی حیثیت سیاسی اغراض کے ماتحت گھٹا دی گئی تھی - اور توقع تھی کہ قیام پاکستان کے بعد ان کو ان کا اصلی مقام پھر سے مل جائے گا - مگر فی الحال قوم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ــــ حالانکہ پاکستانی اعتقادات کا اولین تقاضا یہ تھا کہ غلامی کے زمانے میں ہم سے جو کچھ چھن گیا تھا آزادی ملنے کے بعد ہم اس کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے مگر انگریزوں کے

زمانے کے تعلیمی منصوبے اس قدر جم چکے ھیں کہ اب ان کو بدلنا دشوار ہو رہا ہے -

مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ایک ایسا ذہنی انقلاب برپا ہو گا جو ذہن و فکر کو علوم مشرقیہ کی بنیادی افادیت کے اعتراف پر مجبور کر دے گا ــــ اس کے بعد ہم اپنے نظام تعلیم میں معقول طریق سے مقتضیات زمانہ کے مطابق علوم مشرق کو جذب کر سکیں گے -

اس سلسلے میں ایک قدرتی سوال یہ ہے کہ علوم شرقیہ ھیں کیا ؟ ان کی ایک تعریف وسیع ہے یا عام مگر ایک دوسری تعریف بھی ہے جو محدود ہے یا خاص ــ عام تعریف میں تو مشرقیات (قدیم و جدید) کے تمام شعبے آ جاتے ھیں - اور خاص میں اسلام کے علوم دین اور ان کا صحیح ادراک پیدا کرنے کے لیے عربی ، فارسی اردو زبان و ادب ، یعنی معاون علوم اور علوم حکمیہ (جو پرانی علمی زبان کو سمجھنے کے لیے ضروری ھیں) - میرے نزدیک سر دست ہم سب سے زیادہ علوم مشرق کے اسی اسلامی حصے سے دلچسپی رکھتے ھیں مگر وسیع تر دائرے میں تمام مشرقیات کے مطالعہ کی بھی ضرورت سمجھتے ھیں -

میرا خیال یہ ہے کہ پرانے علوم کو زندہ رکھنا ملت کے دینی ، علمی اور تہذیبی پس منظر اور فکر اسلامی کی علمی روایات کو سمجھنے کے لیے از بس ضروری ہے - ھمارا دعویٰ ہے کہ ہم ایک مہذب قوم ھیں اور ھماری ایک تہذیب بھی ہے جس کی فکریات قرآن و حدیث سے ابھر کر تشکیل پاتی رھیں - اس کے ادراک کے لیے اسلامی ذہن کے تنوعات کا ھمیں پورا مطالعہ کرنا ہو گا ــــ یہ کام علوم مشرق کے سوا اور کون سا نظام علمی انجام دے سکتا ہے ؟

اس وقت عربی فارسی وغیرہ کی تدریس کے جتنے سلسلے (یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں تک) موجود ھیں وہ نا کافی ھیں - چنانچہ مندرجہ بالا مقاصد ان سے پورے نہیں ہو سکتے ــــ خصوصاً عربی کی استعداد تو بالکل ناقص ہوتی ہے اور عربی کے گریجویٹ عربی ادب اور علوم اسلامی سے تشفی بخش واقفیت حاصل نہیں کر پاتے - علوم مشرق کو اس نقطۂ نظر سے پڑھنے اور پڑھانے کے لیے کسی عقلی نظام کی ضرورت ہو گی - اس کا ایک حصہ موجودہ سکولوں اور کالجوں کی مدد سے تکمیل پائے گا مگر ایک حصہ ایسا بھی ہونا چاہیے جو ان سے الگ ہو ، جس میں

تخصص (Specialisation) ہو ، اس وقت یہ کام کچھ تو عالم فاضل امتحانوں سے لیا جاتا ہے اور بیشتر دینی مدارس میں ہوتا ہے مگر یہ ضروری کام اس سے مکمل تر تنظیم کے محتاج ہیں -

السنۂ شرقیہ اور طلباء

ڈاکٹر سید عبداللہ نے السنۂ شرقیہ (عربی ، فارسی ، اردو) سے طلبا کی دلچسپی سے متعلقہ سوال کے جواب میں فرمایا : افسوس ہے کہ گزشتہ ایک صدی سے تعلیم کی محض کاروباری غایت طلباء کے عام رجحانات پر غالب رہی ہے - انگریزوں کے دور میں علوم مشرق تو رو بزوال ہو گئے تھے مگر عربی ، فارسی اور سنسکرت کا ادبی مطالعہ برقرار رہا ——بڑی مدت تک عربی ، فارسی اور سنسکرت کی حیثیت تعلیم کے سب درجوں میں لازمی رہی —انگریزی زمانے کے آخر تک ایف-اے میں عربی ، فارسی ، سنسکرت میں سے ایک زبان مضمون کا درجہ رکھتی تھی - اس سارے عرصے میں کم از کم شمالی ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں میں ان زبانوں کی حیثیت معقول حد تک بلند رہی -

قیام پاکستان کے بعد ۵۵ع تک بھی یہی پوزیشن قائم رہی مگر اب سیکنڈری بورڈ نے اس حیثیت کو ختم کر دیا ہے - اس کی جگہ عربی فارسی کے لیے سپیشل گروپ کا سسٹم جاری کیا ہے ——مگر یہ نیا سسٹم طلبا میں مقبول نہیں ہوا - عالم فاضل امتحانات میں طلبا کی کثیر تعداد فارسی کی طرف متوجہ ہے ——مگر اس وقت طلبا کی اکثریت آرٹس فیکلٹی کے ایف - اے ، بی - اے کی خاطر او-ٹی امتحانات میں شریک ہوتی ہے - یہ امتحانات چونکہ عملی فوائد سے محروم کر دیے گئے ہیں اس لیے یہ نظام بھی افادیت سے محروم ہے -

سوال تھا کہ کیا آپ موجودہ نصاب میں تبدیلی کی کوئی گنجائش سمجھتے ہیں ؟ ڈاکٹر صاحب نے جواباً فرمایا : میرا خیال ہے کہ عالم، فاضل امتحانوں کے نصابوں میں کوئی بنیادی خرابی نہیں ، ان میں تو کمی بیشی کی جا سکتی ہے اور اصلاح ہوتی بھی رہتی ہے - اس لیے نصابوں کے سوال سے پہلے یہ متعین ہونا چاہیے کہ ان امتحانوں کا درجہ کیا ہے؟ یا ان علوم کو قومی زندگی میں رتبہ کیا دیا جاتا ہے ؟

اب تک تو ان کی حیثیت اتنی بھی نہیں جتنی ایک میٹرک پاس کی ہوتی ہے ۔ ایک مولوی فاضل اتنے سخت اور اعلیٰ امتحان کے بعد زندگی کے میدان میں مڈل سے بھی کمتر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ کمتری اس کی قابلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس سبب سے ہے کہ علوم مشرق کو انگریزوں کے زمانے میں کمتر حیثیت دے دی گئی تھی جو اب تک قائم ہے ۔ حالانکہ انہی نصابوں کے پڑھنے والوں میں غزالی ، ابن تیمیہ، بو علی سینا ، ابن خلدون اور آخری دور میں شاہ ولی اللہ رح اور بالکل آخر میں سرسید احمد خان ، شبلی ، حالی ، نذیر احمد ، وقارالملک محسن الملک بھی تھے جن کی قابلیتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ مگر اب یہی علوم تحقیر اور دانستہ تنقیص کے ماحول میں جی رہے ہیں (یا مر رہے ہیں) ، جس کے سبب ان سے وہ نتائج نہیں نکلتے جو کسی زمانے میں برآمد ہوا کرتے تھے ۔ میں مشرقی علوم کے نصابوں میں انگریزی ، اکنامکس ، علم سیاست وغیرہ کو شامل کرنے کے حق میں ہوں بشرطیکہ ان اصلاح یافتہ نصابوں کے مطالعہ کے بعد ان کے فارغ التحصیل لوگوں کو وہی درجہ دیا جائے جو آرٹس کے گریجویٹوں کو میسر ہے ۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انگریزی کو تفوق حاصل ہے یا جب تک پرانے علوم یا مشرق کی ہر شے کے خلاف تعصب باقی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ علوم مشرق کی معقول تنظیم آج بھی فائق شخصیتیں پیدا کر سکتی ہے ۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی عالم فاضل امتحانات کے فارغ التحصیل لوگوں کی فہرست میں صاحب فکر اور غیر معمولی افراد کی خاصی تعداد موجود ہے ۔ میرا خیال ہے کہ علوم مشرق کا سوال پاکستان کے دستور اساسی کے تحت اب مرکزی آئینی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس لیے اس پر غور و فکر کے لیے ماہرین کے ایک کمشن کے تقرر کی ضرورت ہے ۔

اردو ادب

اردو ادب سے متعلقہ سوالات کے جواب میں انھوں نے فرمایا: میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اردو ادب کی موجودہ حالت سے غیر مطمئن نہیں ۔ میری رائے میں گزشتہ پندرہ بیس برس میں اردو

ادب میں بڑی وسعت اور توانائی پیدا ہوئی اور تنقید اور خالص ادبی اصناف میں (ماسوا ڈرامے کے) بڑی حوصلہ افزا ترقی ہوئی ہے۔اس وقت اردو ادب دنیا بھر کے اعلیٰ ادبوں کی سپرٹ کو اپنے اندر جذب کرنے میں مصروف ہے - اور ان عالمی ادبی اور فکری تحریکوں سے منقطع نہیں جن سے رابطہ و تعلق کے بغیر، بیسویں صدی کا انسان اس ایٹمی ماحول میں اور ''ماہ کودکوں'' (Sputink) کی فضا میں زندہ ھی نہیں رہ سکتا - اردو ادب زندگی اور علوم کی اس پرواز کا پورا احساس رکھتا ہے -

یہ صحیح ہے کہ ۱۹۳۶ع کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر فکر کا ایک گوشہ ایسا بھی تھا جو مستعار ساز و سامان سے آراستہ نظر آتا تھا - مگر خود اسی تحریک کے دوسرے گوشے ایسے بھی تھے جن میں سب کچھ اپنے ھی ملک اور اپنے ھی سماج سے حاصل کیا ہوا تھا - کچھ دیر تک یہ ضرور ہوا کہ ایک انقلابی لہر ایسی آٹھی جس میں روایت اور قومی تہذیب بھی دریا برد ہوتی نظر آنے لگی تھی - مگر یہ دور بہت جلد ختم ہو گیا -

سوال یہ تھا کہ اردو میں Original Thinking کہاں تک کی گئی ہے -

ڈاکٹر صاحب کا جواب

جس چیز کی Original Thinking کہا جاتا ہے اس میں دراصل تھوڑا سا لفظی مغالطہ بھی ہے - اس آزاد فکر سے یہ تو کبھی مراد نہیں ہو سکتی کہ مطالعہ و استفادہ کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے ادبوں سے استفادہ کے وقت ایسی انتخابیت سے کام لیا جائے جس کی بنیاد آزاد احساس پر قائم ہو۔اور یہ آزاد احساس انا کے اس شعور سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے پاس بھی کچھ فکری اقدار ایسی ہیں جن سے عالم انسانیت مستفید ہو سکتا ہے - یہ آزاد احساس دوسرے ادبوں کے افکار کا بے ساختہ طور پر تجزیہ کرتا ہے اور صحیح اور غیر صحیح کے درمیان اپنے وجدان کی مدد سے امتیاز کر لیتا ہے -

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اردو کا ادیب اس آزاد فکر کی قدر و قیمت سے بے خبر نہیں اور اس میں آزاد فکر کی عملی صلاحیت بھی ہے۔ مگر اس کے راستے میں دو بڑی مشکلات ہیں۔ ایک تو یہ خلش کہ وہ جس زبان و ادب کو اپنے خون سے سینچ رہا ہے اس کی حیثیت خود اپنے ملک میں بھی صحیح معنوں میں ابھی تسلیم نہیں ہوئی چہ جائیکہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے ادب تک اس کے آزاد فکر کی گونج پہنچ سکے۔ دوسری مشکل: ہمارا غیر قومی نظام تعلیم جس میں اس قومی مزاج کی تربیت ہی نہیں ہوتی جو کسی ملی ادب کے رموز و لطائف سے کماحقہ، لطف اندوز ہو سکے۔ کسی قوم کا ملی ادب اپنی روایتوں سے ہی ابھرا کرتا ہے جن کی عمارت کا سنگ بنیاد اپنی زبان اور اپنی تاریخ ہے۔ آج ہمارا ادیب آزاد فکر کی کوشش بھی کرے تو کس جذبے اور کس تحریک سے کرے۔ ہمارا اعلیٰ اور حاکم طبقہ تو ادیب کی فکری زبان ہی سے نامانوس ہے۔ باقی رہا وہ طبقہ جو ادیبوں کے پیدا کردہ ادب سے مستفید ہوتا ہے سو اس کی اکثریت ناقص تعلیم کی بدولت ادبی ذوق ہی سے معرا ہے۔ ادیب کو اگر اور کچھ بھی میسر نہ آئے تو اسے (کم از کم) مخاطبوں اور سننے پڑھنے والوں کی تو ہر حال میں ضرورت ہوتی ہے مگر اردو کے ادیب کی بڑی دقت صحیح مخاطبوں کی کمی ہے۔ اس کمی سے اس کا دل ضرور افسردہ ہوتا ہے۔

ان حالات کے باوجود، اردو کا ادیب، فکر و نظر کے معاملے میں، اُمنگ اور اپج سے خالی نہیں۔ (مگر صحیح معنوں میں آزاد ملکوں کے ادیبوں سے اس کا مقابلہ کرنا غلطی ہوگی)۔

سوال: جدید فلسفہ اور نفسیات جیسے اہم علوم کے سلسلہ میں اردو کا کیا حصہ ہے۔ اس سلسلے میں اوریجنل کام نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟

ج: جدید فلسفہ و نفسیات کی کتابوں سے اُردو ادب یکسر خالی تو نہیں مگر یہ صحیح ہے کہ اس صنف کی کتابیں کچھ زیادہ نہیں۔ اور جو ہیں بھی وہ بھی کم و بیش ترجمہ ہیں۔ فلسفہ و نفسیات کی معدودے چند کتابیں جامعہ عثمانیہ وغیرہ سے متعلق ہیں۔ کچھ اس کے باہر بھی وجود میں آئیں۔ مولانا عبدالماجد، پروفیسر عبدالباری، پروفیسر منہاج الدین وغیرہ نے کچھ اوریجنل مگر بیشتر ترجمے کیے ہیں۔ حال ہی میں تدریسی

ضرورتوں کے تحت تعلیمی نفسیات پر بھی کچھ کتابیں لکھی گئیں مگر میں ان کوششوں کو ناکام سمجھتا ہوں ۔ ہمارے ملک میں اس سلسلے میں اوریجنل کام کی سردست بہت کم گنجائش ہے اور سبب اس کا ظاہر ہے کہ ان کتابوں کی مانگ نہیں ، نہ کالجوں میں نہ عام قارئین کے حلقے میں ، کالجوں میں فلسفہ و نفسیات کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے لہذا اردو کی کتاب کی ضرورت کیسے ہوگی ۔ عام قارئین میں فلسفے کا ذوق رکھنے والے لاکھوں میں دو چار سے زیادہ نہ ہوں گے ۔ ان حالات میں کوئی شخص فلسفہ پر اردو میں کتاب لکھے گا تو اس کو چھاپے گا کون؟ اور چھپ بھی جائے تو خریدے گا کون؟ میرا عقیدہ ہے کہ جب تک اعلیٰ تعلیم میں ذریعۂ تعلیم نہیں بدلے گا فلسفہ و نفسیات بلکہ کسی علمی شعبے میں اوریجنل تصانیف کا دور شروع ہی نہیں ہو سکتا——یہاں بھی قارئین کی موجودگی کا عنصر سب سے زیادہ مؤثر و محرک ہے—پھر اردو میں فلسفہ کی کتابیں لکھنے والے کہاں ؟ جدید اہل علم ، عہد اسلامی کی فلسفیانہ اصطلاحات سے بالکل بے خبر ہیں ۔ نہ انہیں عربی آتی ہے نہ پرانا فلسفہ ، پس فلسفہ پر کتاب لکھنے کے لیے وہ زبان و بیان کی مشکل کو کیسے حل کریں گے ۔ میں اسی لیے علوم مشرقیہ کی ترویج پر اصرار کرتا ہوں تاکہ پچھلی علمی روایت کے تسلسل سے ہمارا علمی حال و مستقبل تعمیر ہو سکے ۔

یہ بحث کہ موجودہ اردو ادب نے قومی تعمیر اور ذہنی نشو و نما میں کتنا حصہ لیا؟ غالباً موجودہ سے مراد بالکل جدید ادب نہیں ۔ اگر میرا قیاس درست ہے اور موجودہ سے مراد وہ سارا جدید ادب ہے جس کی ابتدا سرسید سے ہوئی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ سارا ادب زندگی کی بدلی ہوئی حالتوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا ، یہ قومی مسائل سے متاثر بھی ہوتا رہا اور قومی تعمیر میں حصہ لیتا رہا ۔ رفقائے سرسید سے لے کر اقبال کے ہمہ گیر قومی ادب تک ، تعمیر و تربیت کے بے شمار مراحل و منازل نظروں کے سامنے آتے ہیں ۔ ان میں ادب کا خاصا حصہ ہے اور ۱۹۳۶ع کے بعد تو خصوصیت سے اردو ادب کا اس عقیدے پر ایمان ہے کہ ادب اجتماعی زندگی کا ترجمان بھی ہے اور اس کا پاسبان بھی ۔ بعض ادیبوں کی معمولی لغزشوں کے باوجود اس سارے دور میں ادب کوئی نہ کوئی خدمت ضرور انجام دیتا رہا ۔ آزادی کی

جد و جہد ، اخلاق اجتماعی کی تطہیر ، فرقہ وار سوءالمزاجی کے زمانے میں انسانیت کی دعوت ، سماجی بگاڑ کے خلاف احتجاج ، شفقت و محبت کے جذبات کی تربیت ، غرض جدید اردو ادب ذہنی نشو و نما کا ایک قومی وسیلہ ثابت ہوا ۔

یہ صحیح ہے کہ ۱۹۳٦ع کے بعد کے ادب میں ایک لہر ایسی بھی آٹھی تھی جس نے جنسی کج روی ، فحاشی اور نپٹ بے حیائی کو تھوڑی دیر کے لیے مقبول بنا دیا تھا مگر قومی اخلاق کی اجتماعی حس چونکہ ابھی صحت مند تھی اس لیے خود ادب کے حلقے سے ھی اصلاح کی ایسی موثر آواز بلند ہوئی کہ ۱۹۴۷ع کے بعد کے ادیبوں کے قلم سنبھل گئے——اور اب عام ادبی لہر کی اخلاقی صحت (جہاں تک میں سمجھ سکا) اعتدال کی طرف مائل ہے ۔ اب اخلاق اجتماعی کی رعایت اجتماعی شعور کا ایک جزو بنتی جا رھی ہے ۔ بایں ہمہ ادب اردو کا ایک رجحان اس وقت ایسا بھی ہے جو روحانی صحت کے منافی ہے ، وہ ہے عام یاس و افسردگی جو کلبیت اور مردم بیزاری کی طرف لے جا رھی ہے ۔

یہ یاس و افسردگی افسانہ و شاعری دونوں میں موجود ہے——اس کا سبب احساس شکست خوردگی یا مقاصد حیات کے بارے میں بے یقینی کے سوا کچھ نہیں ۔ اس کا نتیجہ زندگی کی آرزو کے معاملے میں خنکی اور اضمحلال ہے ۔ آج کل جو نفسیاتی لہر ادب اور تنقید میں رواں ہے اس نے بھی انسانی شرافت اور سماجی شرافتوں کو خاصا مشکوک بنا دیا ہے ، شاعری میں داخلیت اور مجرد ''المیت'' کا رجحان بھی ترقی پر ہے اور میر کا مطالعہ اس کی شدت میں اضافہ کر رھا ہے ۔ ان بواعث سے یقین و اعتماد کا ضعف نمایاں ہے جس کا اثر روحانی صحت مندی پر بھی پڑ رہا ہے ۔ میرے نزدیک اقبال کے اثباتی فکر کی طرف رجعت اس خطرناک میلان کا مؤثر مداوا ہے ۔

طلباء اور اساتذہ

طلبا اور اساتذہ کے تعلقات کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان خیالات کا اظہار کیا :

طلبا اور اساتذہ کے تعلقات کی بحث اتنی سادہ نہیں جتنی بظاہر سمجھی جاتی ہے ۔ اس کا تعلق براہ راست اس نظام سے ہوتا ہے جو کسی

ملک میں رائج ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں۔۔خصوصاً پنجاب یونیورسٹی میں لندن یونیورسٹی کے نظام کا عمل دخل ہے۔ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں آکسفورڈ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں آستاد اور شاگرد کے درمیان شخصی رابطے کے مواقع بہت زیادہ ہوتے ہیں اور اس کے لیے آئین و ضوابط کے اندر گنجائش رکھی گئی ہے۔ جن یونیورسٹیوں میں ایسا نہیں کیا گیا وہاں استاد اور شاگرد کا شخصی رابطہ ایک رضامندی اور فرصت کا سوال بن جاتا ہے۔

آکسفورڈ میں شخصی رابطے کے لیے جو ٹیوٹوریل نظام قائم ہے وہ نہایت سخت ہے مگر یہ سب کچھ اس غایت پر منحصر ہے جو کسی یونیورسٹی کے مدنظر ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ کسی یونیورسٹی کے پیش نظر کس قسم کی شخصیتوں کی تخلیق ہے۔ کیمبرج علمی تخصص کی یونیورسٹی ہے۔ آکسفورڈ میں دنیاوی زیرکی اور ہوش مندی کے لحاظ سے کامیاب شخصیتوں کی تخلیق پر نظر رکھی جاتی ہے۔ لندن میں انواع علمی کے لحاظ سے جامع قابلیتوں کے اشخاص پیدا کرنے پر توجہ کی جاتی ہے۔۔ ہمارے ملک میں کسی یونیورسٹی میں خاص روایات اور غایات مد نظر نہیں۔ اس ملک میں اب تک اچھے ملازمت پیشہ حضرات کی تخلیق ہی سب سے بڑا مقصد رہا ہے، استاد شاگرد کے روابط کے سلسلے میں سب سے بڑا سوال فرصت کا ہے۔۔ اگر نظام الاوقات ہی آستاد شاگرد دونوں کے لیے گرانبار ہوگا تو شخصی رابطے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری اکثر یونیورسٹیوں میں ٹیوٹوریل نظام کمزور ہے اس لیے کہ یہاں اس کا منصب، وقار اور مجلسی حیثیت وہ نہیں جو دنیا کی دوسری یونیورسٹیوں میں ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں نصاب اور کتابوں کا مطالعہ مرکز توجہ ہے آستاد کا فیض نظر اور شخصی تربیت نہ ممکن ہے، نہ مقصود ہے۔

ہماری قدیم تعلیمی روایت میں آستاد ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ طلبا ایک مرکز سے دوسرے مرکز کا کتابوں کے لیے نہیں خاص استادوں کے لیے سفر کیا کرتے تھے اور سندات میں ان استادوں کا ذکر ہوتا تھا جن سے خاص علم یا خاص کتابیں پڑھی جاتی تھیں۔ پرانی روایت میں استاد اور شاگرد کا رابطہ، ایمان و اعتقاد کی طرح زندگی کی سب سے بڑی نعمت کا درجہ رکھتا تھا مگر آج یہ ممکن

نہیں ۔ اس وقت تعلیم ایک مرکب اور پیچیدہ شعبۂ حیات ہے ، اس کی تنظیم اب زیادہ سخت قواعد اور اصولوں پر مبنی ہے ۔ اب مضامین کی کثرت ہے اور غایتوں کے اعتبار سے 'ہمہ فن' ہونے کا رجحان عملی منافع زندگی کی خاطر بنیادی حیثیت اختیار کر گیا ہے ، اس لیے استادوں کی کثرت گہرے شخصی روابط میں ھارج ہے اور معاشی زندگی کی پیچیدگیاں اور مصروفیات کی عجیب و غریب بوقلمونیاں خود استاد کے لیے بھی وسیع پیمانے پر گہرے تعلقات کے راستے میں سنگ راہ ہیں۔ کالج اور یونیورسٹی ہو یا گھر ، استاد و شاگرد کے تعلقات کی نوعیت اب مجبوراً کاروباری ہے ۔ اس کی ذمہ داری اگر کسی پر ہے تو مشینی زمانے کی اس تہذیب پر ہے جس میں مادی افادیت ہر شے کی قدر اول ہے ۔ اب ہم اگر چاہیں بھی تو استاد و شاگرد کے روابط کو اس سطح پر نہیں لا سکتے جو پرانے زمانے میں ہوتے تھے ۔ ہاں اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے لیے زندگی کے پیمانوں اور معیشت کے سانچوں میں ایسی تبدیلی پیدا کر لیں جس میں یورپ اور امریکہ کے تعلیمی نظامات ہمارے سامنے نہ ہوں — اور ان معاملات میں تشکیل نو کا جذبہ ہم میں جامعہ ملیہ اور شانتی نکیتان یا دیوبند یا پاکستانی آکسفورڈ بنانے کی جرأت پیدا کر دے —— یہ چیز جرأت رندانہ یا مومنانہ کے سوا ممکن نہیں!

ڈاکٹر صاحب نے نفسیات کے مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ نفسیات کے سلسلے میں شیر محمد اختر اور اختر رضی صاحبان کے متعدد سہل اور عام فہم رسالے چھپے ہیں ، ان کے علاوہ پروفیسر عبدالحئی علوی ، ڈاکٹر عبدالرؤف ، مرتضیٰ شفیع اور شمس الحسن صاحبان نے بھی اس موضوع کو مقبول بنانے کی کوشش کی ہے مگر اول درجے کی اوریجنل کتابوں کی طرف توجہ نہیں ہوئی - اور یہ قدرتی بات ہے کیونکہ اس کے لیے نہ وسائل ہیں ، نہ استعداد ہے ، نہ ان کی مانگ ہے ۔

———

استقلال لاہور　　　　۱۵ نومبر ۱۹۵۷ء

الطاف حسین قریشی

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے ساتھ ایک شام

سمن آباد کی مین روڈ پر قصر سخاوت کے دامن میں ایک مختصر سا مگر حسین بنگلہ واقع ہے - جس میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب چار پانچ سال سے اقامت گزین ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کو اورینٹل کالج ، ادبی محفلوں اور علمی مذاکروں میں تو بارہا قریب سے دیکھا تھا ، لیکن انہیں اس عالم میں پہلے کبھی دیکھنے کا موقع میسر نہ آیا تھا ، جب ایک فرد کی شخصیت رکھ رکھاؤ اور تکلفات کی قیود سے آزاد ، اپنے اصلی رنگ و روپ میں دیکھے بغیر کسی شخصیت کے بارے میں صحیح رائے قائم کی ھی نہیں جا سکتی - ۱۹ جون کی ایک خنک شام کو ہماری آنکھوں نے سید صاحب کی زندگی اور شخصیت کی چند جھلکیاں دیکھیں- ایسی جھلکیاں جنہیں بار بار دیکھنے کے لیے نگاہیں دیوانہ وار اٹھتی رہیں گی -

سید صاحب کی عمر پچپن سال سے متجاوز ہے اور زندگی کے اس طویل اور کٹھن سفر کے نشانات چہرے کی کیفیات سے ظاہر ہیں - لیکن آنکھوں میں تقدیر کی گہرائیاں جھانک رہی ہیں اور ان میں موج حوادث سے کھیلتے رہنے کی آرزوئے ناتمام کروٹیں لیتی نظر آتی ہے گویا کہہ رہی ہو :

راہرو راہ محبت تھک نہ جانا راہ میں
لذت صحرا نوردی دوریٔ منزل میں ہے

ان کی گفتار سنجیدگی و مزاح کا ایک تیکھا انداز لیے ہوئے ہے - الفاظ میں محبت کی گھلاوٹ اور صبح کی شبنم کا ٹھہراؤ ہے - دل میں اعلیٰ اقدار کے تحفظ کی کسک اور لگن انہیں اکثر بے قرار رکھتی ہے

اور میں نے جب انہیں سفید قمیص اور شلوار میں ملبوس دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے قلب و روح کی پاکیزگی اور باطن کے نور نے سپید لباس کا روپ دھار لیا ہو - ان کی پوری زندگی مسلسل کش مکش اور جد و جہد میں گزری اور جب کوئی ان کی زندگی کا باشعور اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ عظمت و سر بلندی، مسلسل ریاضت اور جگر کاوی کا مطالبہ کرتی ہے اور جو اس کے بغیر اسے حاصل کرنے کے تمنائی ہیں وہ ''اہل نظر'' نہیں۔ ''بوالہوس'' ہیں -

ایک ملاقات ----- سوال و جواب

س : آپ کی ابتدائی زندگی کے حالات اور تعلیم و ملازمت کے کوائف مطلوب ہیں ؟

ج : از نام چہ پرسی کہ مرا ننگ ز نام است
و ز ننگ چہ پرسی کہ مرا نام ز ننگ است

ایک زمانے میں اس قسم کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے میں کہا کرتا تھا : ع

سیہ بختم ، پریشاں روزگارم ، خانہ بر دوشم

زندگی کی روداد مختصر طور پر شعروں ہی میں بیان ہو سکتی ہے اگر آپ کو شعر سے دل چسپی ہو تو یوں کہوں : ع

عاشق ہوئے اور مر مٹے ہم
اپنی تو یہ مختصر ہے روداد

مگر شاید ان شاعرانہ رموز سے زیادہ آپ کو اس وجود بے سود کے متعلق چند ٹھوس کوائف کی ضرورت ہوگی۔تو سنیے میں ۱۹۰۶ع میں ضلع ہزارہ تحصیل مانسہرہ کے ایک خوب صورت (پہاڑی کی چوٹی پر آباد) گاؤں منگلور میں پیدا ہوا - ایک زمانے میں یہاں سکھوں نے ایک گڑھی تعمیر کر رکھی تھی کیوں کہ یہ مقام اتنی بلند جگہ پر واقع ہے کہ یہاں سے ہزارہ کی تینوں تحصیلوں کے راستے اور رقبے پیش نظر رہتے ہیں - چاروں طرف نالے اور چشمے اور مرغزار اور وادیاں اور

آبشاریں ہیں ۔ اگر آپ کو دل چسپی ہو تو ان کے تذکرے میرے روز نامچے (صحیفۂ زندگی) میں کبھی ملاحظہ فرما لیجیے گا ۔

میرے والد حکیم سید نور احمد شاہ ، صاحب علم اور صاحب طریقت بزرگ تھے ، اپنے زمانے کے خوب صورت اور ذہین لوگوں میں سے تھے ۔ بڑے ضابطہ پسند ، صابر اور جابر ، مگر اس فولادی کردار کے اندر نرمی و ملائمت کے انداز رکھتے تھے ۔ ابھی میں چھٹی جماعت ہی کا طالب علم تھا کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا ۔ اس کی وجہ سے میری طبیعت زندگی بھر محبت کی پیاسی رہی اور اندر کا زخم کسی اور محبت سے بھر نہ سکا ۔

پرائمری اپنے گاؤں میں ، مڈل مانسہرہ میں ، نویں جماعت ایبٹ آباد میں پاس کی ۔ پھر جب کہ ابھی لڑکپن کا آغاز ہی تھا زمانے کی سب سے بڑی سیاسی تحریک خلافت میں شریک ہو گیا اور اسی کے سلسلے میں تعلیم کو ترک کرکے جامعہ ملیہ علی گڑھ میں پہنچا ۔ سوجھ بوجھ کچھ زیادہ نہ تھی مگر محمد علی ، ذاکر حسین ، عبدالمجید خواجہ ، مولانا سورتی ، مولانا اسلم جیراجپوری وغیرہ کو دیکھا اور سنا ۔ اس سے طبیعت میں سیاست ، آزادی اور علم کی لگن جاگ اٹھی ۔ تحریک خلافت کے سرد پڑ جانے پر جب کہ شیرازۂ احوال بکھر چکا تھا بے سر و سامانی کے عالم میں لاھور کی مسجدوں میں عربی کی تعلیم پائی اور اس ضمن میں مولانا احمد علی ، مولانا غلام مرشد ، حافظ محمد حسین ، مولانا عبدالواحد غزنوی سے استفادہ کیا ۔ اس کے بعد اورینٹل کالج میں مولوی عالم میں داخل ہو کر مولانا عبدالعزیز میمن کے علم و فضل سے سیراب ہوا ۔ اس کے بعد منشی فاضل اور اسی سلسلے سے صرف انگریزی کے سب امتحان پاس کرکے ۱۹۲۵ع میں ایم ۔ اے فارسی کا ۱۹۳۲ع میں ایم ۔ اے عربی کا ۱۹۳۵ع میں ڈی لٹ ، جرمن انٹرمیڈیٹ اور لائبریری سائنس کا امتحان پاس کیا ۔

اورینٹل کالج سے میرا تعلق ۱۹۲۴ع سے ہے اور اسی زمانے سے پروفیسر اقبال ، پروفیسر شیرانی اور پروفیسر شفیع سے یکے بعد دیگرے متعارف ہو کر بقدر استطاعت فیض یاب ہوا ۔ ان سب اساتذہ کا ممنون احسان ہوں ۔

میری ملازمت سب ایک ہی سلسلے کی ہے ۔ قلمی کتابوں کی فہرست

سازی (۲۷-۲۶ء) ریسرچ سکالرشپ (۲۷ءتا۳۲ء) لائبریرین عربی (۳۵ء تا۳۹ء) لیکچرار فارسی (۳۸ء تا۴۰ء) لیکچرار اردو (تا ۴۸ء) ریڈر اردو (تا ۵۳ء) پروفیسر اردو (از ۵۳ء تا حال)، پرنسپل اورینٹل کالج (از ۵۴ء تا حال) اس وقت میں صدر شعبۂ عربی بھی ہوں اور صدر شعبۂ اردو بھی— اور عربی فارسی اردو تینوں زبانوں کا استاد ہوں اور تینوں ادبوں کا خادم - تینوں زبانوں کے ادب کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا بھی ہے -

س : آپ ادب کا کیا تصور رکھتے ہیں ؟ زندگی کے سلسلے میں اس کی کیا اہمیت ہے ؟

ج : مناسب یہ ہوگا کہ پہلے فن پر کچھ گفتگو ہو جائے کیوں کہ ادب بھی ایک فن ہے - یہ اس لیے کہ آج کل اس کے متعلق بہت سی پریشاں خیالی پائی جاتی ہے - اگر غور کیا جائے تو فن ، انسانی طبیعت کے ایک ناگزیر داخلی تقاضے کو پورا کرتا ہے - اور اپنی اصل میں بڑی آزاد بے ساختہ اور معصوم چیز ہے - یہ دراصل ان جذبوں اور خیالوں سے متعلق ہے جن کی کڑی تنظیم ممکن نہیں - جذبے اور خیال طبع انسانی میں کچھ اس طرح آگ آتے ہیں جس طرح مرغزاروں میں خود رو پھول آگ آتے ہیں - شاعر یا فن کار ان پھولوں کے آگانے میں آزاد مگر مجبور سا ہوتا ہے - اور بڑی حد تک خارجی جبر و قید سے بے نیاز ، اندر کی تحریک سے اظہار پر مائل ہوتا ہے - ایسی صورت میں اس کے ارادے پر کسی خارجی مقصد کا دباؤ نہیں ہوتا ، نہ اس کے ارادے میں خیر و شر کا کوئی جھگڑا ، اچھائی برائی کی کوئی لڑائی ہوتی ہے—وہ تو مرغزار کے اس پھول کے اندر سے خود بخود ابھرا چلا آتا ہے - یا یوں کہیے شاعر کی مخصوص فطرت بے ساختہ اس کو بروئے کار لاتی رہتی ہے اور اس کے زیر اثر فن اور ادب کے پھول کھلتے رہتے ہیں ، کھلتے رہتے ہیں -

س : تو آپ کا مطلب یہ ہوا کہ فن اور ادب بلا ارادہ اور بے مقصد ظہور میں آتے ہیں ؟

ج : جی ہاں ! مگر ایک چیز کو نہ بھولیے کہ ادبی یا فنی اظہار ، کسی داخلی یا خارجی تحریک کا محتاج ہوتا ہے - یہ تحریک زندگی

کے شعور اور حسن کے احساس سے پیدا ہوتی ہے ــــ مگر زندگی کا شعور یا حسن کا احساس ، یہ دونوں چیزیں ناقابل تعریف ہیں اور ان کو عقلی تعریفوں اور تشریحوں میں مقید کرنا ممکن نہیں ۔ تو میں نے یہ کہہ دیا کہ فن اور شاعری ایک لحاظ سے وجدان و الہام کی طرح کی چیزیں ہیں جو کسی کے تابع نہیں ۔ حافظ نے اسی لیے کہا تھا :

بارہا گفتہ ام و بارہا دگر می گویم
کہ من دل شدہ ایں راہ نہ بخود می گویم
در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
ہر چہ استاد ازل گفت بگو می گویم

اور میں تو نظیری کی اس بات کو بھی کچھ اہمیت نہیں دیتا جس نے حافظ کی نقالی کرتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا :

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

یعنی خارج سے کوئی وجود یا شخص شاعری کرا رہا ہے ــ شاعری اور فن (لاکھ خارجی رنگ کے حامل ہوں) ان کی اصل داخلی ، شدید داخلی ہے ، وہ فطرت کی ان اتھاہ گہرائیوں سے نمودار ہوتا ہے جن کا راز خدائے کائنات کے سوا کوئی نہیں جانتا : ع

دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانڑے

س : ڈاکٹر صاحب! آپ نے تو فن کو بہت ہی مجرد شے بنا دیا ہے ۔ اس صورت میں اس کا خارجی زندگی سے گویا کچھ تعلق نہ ہوا ۔

ج : میں عرض کرتا ہوں کہ فن کی اصل مجرد ، منزہ ، پاکیزہ ہے ، معصوم ہے جس طرح سرچشمے کا پانی اپنے منبع میں ہر غل و غش سے پاک ہوتا ہے ۔ ادب کا بنیادی سرچشمۂ تحریک بھی بے لوث ہوتا ہے ، نیکی ، حسن اور معصومیت اس کی صفات خاص ہیں ۔ وہ ایک معنی میں بے نام عبودیت کے جذبے سے ابھرتا ہے، بے نام گداز سے ، بے نام خودی سے! البتہ اظہار کے مراحل میں فن کار خارجی وسائل اور خارجی مواد سے کام لیتا ہے ــ یہ مواد ایسا ہوتا ہے جو ماحول اور سوسائٹی کے احوال سے اسے ملتا ہے ۔ اس

معنی میں فن یا ادب ایک شعوری سماجی عمل بھی بن جاتا ہے اور یہیں پہنچ کر فن کار پر اخلاق اور سوشل ذمہ‌داریاں عائد ہو جاتی ہیں ، مگر اصل تحریک بے ساختہ آزاد اور معصوم ہوتی ہے -

س : ڈاکٹر صاحب! آپ کا موسیقی ، مصوری وغیرہ کے متعلق کیا خیال ہے ؟

ج : میرا خیال ہے کہ اگر یہ فنون اس ذوق عبودیت سے ابھریں یا اس بے نام اور معصوم بے خودی کا نتیجہ ہوں ، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے تو فن ایک غیر جانب دار اور معصوم بلکہ پاکیزہ فعل ہے - موسیقی تو درکنار ، مصوری کا عمل بھی ایک روحانی لگن کا نتیجہ ہے - اور ذات مطلق کی دریافت اور رسائی کا ایک وسیلہ ہے — یہ دراصل جستجو ہے اس ذات مطلق کی جس کی تجرید ذہن انسانی کے لیے معمہ بن جاتی ہے - اسی معمہ کی کشود ، ایک مصور کی آرزو ہوتی ہے — ذات مطلق کو دیکھنے کی کوشش ! ہرچند کہ آپ اسے کوشش ناتمام ہی کہہ سکتے ہیں -

س : مگر ڈاکٹر صاحب ! مسلمانوں کے زمانے میں عام رائے مصوری کے خلاف رہی ہے ؟

ج : میں نے جس حد تک مسلمانوں کے شعور کا مطالعہ کیا ہے اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ مصوری کے متعلق قدرے بے التفاتی کا رویہ اس لیے رہا کہ مسلمانوں کو اس کے رواج عام میں یا اس کی تقدیس میں افراط و تفریط کا وہ خطرہ نظر آیا جو بالآخر بت پرستی تک پہنچا سکتا ہے - میں اس سلسلے میں ایک مثال دیتا ہوں - میں جب کبھی الحمراء میں تصویروں کی نمائش دیکھنے جاتا ہوں تو بعض لوگوں کو عجب حالت میں دیکھتا ہوں - یعنی وہ پہروں تصویروں پر آنکھیں جمائے کھڑے رہتے ہیں اور استغراق اور بے خودی کا وہ عالم ان پر طاری ہوتا ہے جو مسلمانوں کے تصور میں عبادت رب العباد سے مخصوص ہے - عبادت کا لمحہ زندگی کا وہ لمحہ ہوتا ہے ، جب شعور انسانی ، محسوسات سے عارضی طور پر کٹ کر خدا سے جا ملتا ہے اور یہ حالت

لطیف مسلمانوں کے تصور میں مادی وسائل کی وساطت کے بغیر ہونی چاہیے۔ یہ شاید اسلام کا ایک بہت بڑا تجربہ ہے کہ اس میں عبودیت اور عبادت کے رشتے بلا واسطہ خدائے کائنات سے جوڑے جا سکتے ہیں۔ اور اگر کوئی آدمی اس معاملے میں کسی وسیلے اور واسطے کا محتاج ہے تو اس کے دل میں گویا ابھی تک سومنات اور اس کے بت موجود ہیں۔ مصور کی تصویر کو دیکھ کر تعجب اور تحسین اور گداز کی ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کو با شعور شخص عبادت اور عبودیت کے اس رنگ سے جدا کر سکتا ہے جو خالق کائنات سے ہم کلامی اور اس کے ذکر و فکر سے وابستہ ہے۔ ایسی مصوری یا فن پرستی سے بت پرستی کا کوئی خطرہ نہیں۔!

س : ڈاکٹر صاحب! آپ کا پاکستانی کلچر کے متعلق کیا خیال ہے؟

ج : میرے نزدیک کلچر اور ثقافت وغیرہ مغربی اصطلاحیں ہیں اور ہماری سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم ان اصطلاحوں کے غلام ہو کر اپنے اعتقادیات کو انہی سانچوں میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک پاکستانی کلچر مغربی اصطلاح کے تحت بھی ابھی ظہور میں نہیں آیا۔ کسی قوم کا کلچر، اس کے عقاید، ماحول اور زندگی کے طویل تجربے کے تابع ہوتا ہے۔ اس سے قوموں کی آزاد اجتماعی، عادتیں اور ذوقی رویے ابھرتے ہیں جن میں تعدیل حسن اور سلیقہ کی شان نمودار ہو جاتی ہے۔ لہذا کلچر میں حسن کا ہونا ضروری ہے۔ ہم لوگ، ہندوستانی پاکستانی، تاریخی واقعات کی پیداوار ہیں۔ ہمارا ایک 'ہند مسلمانی' کلچر تھا جس پر ہمارے ذوق و ذہن کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اب بھی پاکستان میں اس کے نقوش مل جاتے ہیں مگر انتشاری قوتیں اس ذوقی نظام کو منتشر کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ لہذا پاکستانی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ، مستقبل کا مسئلہ ہے۔ اس کی عمارت ان عقاید پر قائم ہوگی جن پر اس ملک کی وسیع آبادی جمی رہے گی۔ محض پاکستانی موسیقی اور مقامی مصوری کو پاکستانی ثقافت کہہ دینے کی حرکت بڑی قابل اعتراض ہے۔

س : ڈاکٹر صاحب! پاکستان میں اردو کے مستقبل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

ج : میں کام اور جد و جہد میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ملک کے صحیح الخیال لوگ، ملک کی وحدت کی خاطر اردو کے تحفظ پر ڈٹے رہیں تو اردو کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس وقت اردو کو کمزور کرنے کے لیے علاقائیت کا حربہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ دراصل انگریزی کے بے جا اقتدار کو برقرار رکھنے کی ایک سازش ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ قوم بہت جلد علاقائیت کے خطرے کا احساس کر لے گی۔ مغربی پاکستان میں حکومت نے اردو کو بارھویں جماعت تک لازمی قرار دے کر ملک کی وحدت کے لیے ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ اس سے پاکستان کو بہت فائدہ ہوگا۔

س : کیا عربی فارسی کی موجودہ پوزیشن سے آپ مطمئن ہیں؟

ج : میں سخت غیر مطمئن ہوں۔ عربی فارسی کو ان کا جائز کا حق نہیں ملا۔ اس سے علوم مشرقیہ، علوم اسلامیہ، زبان اردو اور ملک کی عام علمی ترقی کو شدید نقصان پہنچے گا۔ عربی، فارسی کو مثل سابق میٹرک یا ایف۔ اے میں لازمی مضمون بنانا چاہیے۔

س : آپ کا تعلیمی کمشن کی سفارشات کے متعلق کیا خیال ہے؟

ج : میرے نزدیک کمشن کی سفارشات میں بہت سی کار آمد دفعات ہیں اور قومی تعلیم کا ایک عمدہ فلسفہ ان سے مرتب کیا جا سکتا ہے۔ مگر نہیں کہہ سکتا کہ نافذ کرنے کے عمل میں کیا صورت پیش آتی ہے۔

س : آپ کے نزدیک معیاری تعلیمی منصوبے کے کیا لوازم ہیں؟

ج : دراصل ہر تعلیمی منصوبے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوا کرتا ہے اور ہر نظام تعلیم کسی تعلیمی فلسفے کے مطابق مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس سوال کا جواب دیتے وقت اسلامی اور قومی تصورات کو مد نظر رکھنا ہوگا۔ ایک اچھا انسان

بنانا اور با شعور شہری بنانا اچھے نظام تعلیم کا وصف ہونا چاہیے مگر پاکستانی نظریات کی رو سے ، پاکستانی تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہمارے کالجوں ، مدرسوں سے اچھے مسلمان پیدا ہوں ؟ جہاں تک میں نے دیکھا ، کمشن کی سفارشات میں 'مسلمان' کی تعریف مشکوک و مخدوش ہے - اس میں emphasis بے ضرورت اور بے محل ، ''ماڈرن'' پر رکھا گیا ہے مگر کسی جگہ یہ نہیں بتایا گیا کہ ماڈرن ضروریات ہیں کیا—یہاں تک کہ دینی تعلیم میں بھی محض سپرٹ کا ذکر ہے ، ارکان اسلام اور عبادت کے لیے تربیت کا کوئی سامان نہیں— میرے خیال میں ہماری تعلیم کا مقصد 'دین و دنیا' کی فلاح ہے مگر مسخ شدہ دین کی نہیں - ورنہ میں ذاتی طور پر ایسے تصور دین کے مقابلے میں ، خالص دنیاداری کو افضل خیال کروں گا -

س : آپ کا سیکولر طرز حکومت کے متعلق کیا خیال ہے ؟

ج : میرے خیال میں یہ مصیبت بھی مغربی اصطلاح کی آوردہ ہے - یہ عیسائی طرز استدلال ہے - میرے نزدیک ایک اچھی دنیاوی حکومت اور عادل نظام حکومت اسلامی طرز حکومت کا اولیں وصف ہے ، میں موجودہ حالات میں اچھی سیکولر حکومت کو بھی برا خیال نہ کروں گا - اس اثنا میں ایک نئے علم الکلام اور نئی فقہ کی تدوین کی ضرورت ہے جس کی روشنی میں مجوزہ عادلانہ سیکولر حکومت کے خاکے میں اسلامی رنگ بھرا جا سکتا ہے -

س : آپ اپنے ذاتی ذوق ، مسلک اور مشرب کے متعلق کچھ بتا سکتے ہیں -

ج : یہ سوال آپ کی طرف سے مجھ پر زیادتی ہے - اس سے اس لڑائی کا راز آشکارا ہو جانے گا جو مسلسل بیس برس سے میرے اور میرے نفس کے درمیان جاری ہے - میں ایک غم پسند آدمی ہوں - اس کے زیر اثر میں نے اپنا ایک فلسفہ مرتب کیا تھا جسے کبھی کبھی میں میر تقی میر کے تتبع میں فلسفۂ درد مندی کہہ لیا کرتا ہوں مگر میرا فلسفہ بار بار بکھرتا رہتا ہے اور میں

اسے پھر جمع کر لیا کرتا ہوں - درد مندی کے اس تصور میں ضمیرداری ، ہم دردی ، قربانی ، درگزر ، محبت عام اور ذوق بے خودی سبھی چیزیں شامل ہیں مگر کس کی محبت اور کیسی ضمیرداری ! آزمائش کی دنیا بڑی آزمائش میں مبتلا رہتی ہے - اور من کی دنیا میں تنہائی محسوس کرتا ہوں - زندگی میں میرا سب سے بڑا رفیق شعر ہے - میرا گنگنانا ہر جاگتے لمحے تک پھیلا ہوا ہے - اس کے بعد سب سے بڑا ندیم آسمانی دوست ہے جس کی ہم کلامی (دعا) سے بڑی تسکین ملتی ہے - مگر اب ایسے لمحے بھی آتے رہتے ہیں جب یہ دونوں رفیق میرا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور میں ایلی ایلی لما سبقتنی کہتا ہوا بھٹکتا پھرتا ہوں -

س : زندگی کا کوئی دل چسپ اور سبق آموز واقعہ ؟

ج : جب میری زندگی ہی بے نتیجہ ہے تو بڑا واقعہ کہاں سے آئے گا - البتہ چند واقعات نے گہرا اثر کیا - اس موقعہ پر صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں :

میں ایف - اے کا امتحان دے رہا تھا کہ لاہور کے بڑے کالجوں کے پرنسپلوں میں سے کوئی شخص پرائیویٹ طلبا کے فارموں پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا - مجھ سے کسی نے کہا لالہ رگھبیر دیال پرنسپل سناتن دھرم کالج سے ملو - میں گیا ، اپنی باری پر بلایا گیا - کرسی پر سے ایک شخص اٹھا - دو دست بستہ نمستے کہا - بٹھایا - فارم لیا - دستخط کیے اور کہا - کاکا جی ! جب بھی کوئی کام ہو بے تکلف آ جایا کرو - پھر بڑے انکسار سے دوبارہ نمستے کہا اور رخصت کیا -! میں جو کہ پندرہ روز سے بڑے بڑے پرنسپلوں کے دفتروں کے سامنے دھکے کھاتا رہا تھا ، حیرت زدہ ہوا اور سوچنے لگا ، شائستگی ہو تو منصب اور انکسار کا اجتماع ممکن ہے - واقعہ معمولی ہے مگر مجھ پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا -

س : ڈاکٹر صاحب ! زندگی کی کوئی آرزو ؟

ج : بھئی ! آرزوئیں تو بہت ہیں مگر ایک ایسی آرزو ہے جو اکثر

جان و دل میں بسی رہتی ہے اور وہ یہ کہ کاش میں اپنی زندگی میں دس پندرہ سطریں ایسی لازوال لکھ جاؤں جو انسانی دکھ درد میں کسی مور ناتواں کے لیے سفینۂ برگ گل بن سکے۔! میں اس قسم کی ایک سطر بھی ابھی تک لکھ نہیں سکا۔ سقراط دانش کی ایک چمک کے لیے پہاڑیوں کے گرد دیوانہ وار گھومتا تھا۔ میں سیاھی کے ایک قطرے کا آرزو مند ہوں جو تحریر میں ڈھل کر سریم بن جائے۔

———

وحید الحسن ہاشمی
ایم - اے

ڈاکٹر سید عبداللہ

تخیل کی دنیا اور اس کے ہنگامے اس جیتی جاگتی دنیا کے ہنگاموں سے بدرجہا دیرپا اور دیر اثر ہوتے ہیں - کبھی کبھی ہیجانی کیفیت وہ کام کر جاتی ہے جس سے عقل و ہوش کی دنیا بالکل عاری ہوتی ہے - آنکھوں کے اشارے اور نگاہ کی ایک معمولی سی گردش حیات انسانی کی بڑی سے بڑی قدر کو تہس نہس اور ملیامیٹ کر دیتی ہے - اجسام کی حکومت روح کی سلطنت میں کاغذی پھول سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی - میر تخیل کی دنیا کے بادشاہ ہیں - غالب ، مومن ، داغ پھولوں کی چادر مسلنا بھی چاہتے ہیں - ڈاکٹر عبداللہ انہیں میر کی مجلس کے ایک رکن ہیں جن کے یہاں ہنگامہ پروری کے الفاظ دماغ سے زبان تک تو آتے ہیں لیکن کھلی ہوئی فضا میں جب عمل کا وقت آتا ہے تو بظاہر ان کا تیر ناکام دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت میں شکار ان ہی کے قبضے میں ہوتا ہے - یہ دراصل ان کے ذہن کی اپج ان کے خیال کی گہرائی کا اثر اور ان کے دماغ کی کاوش کا زور ہے کہ وہ بات بات میں گھات کی باتوں کا بھی پتا لگا لیتے ہیں -

ڈاکٹر عبداللہ اردو ادب کے چوٹی کے نقادوں میں شمار کیے جاتے ہیں - وہ ایک سمجھے بوجھے ادیب اور جانے پہچانے قلم کار ہیں - ہندوستان اور پاکستان کا گوشہ گوشہ ان کے نام سے واقف اور ان کی خدمت کا کلمہ پڑھتا ہے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں آن کی شخصیت کو سمجھنے کا دعویٰ ہے وہ ایک عجب بھول بھلیاں میں کھوئے ہوئے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ انہیں جاننے کی کوشش میں سرگرداں ہیں - عوام کے ذہنوں میں موجود یہ تضاد خدا جانے ڈاکٹر صاحب کے علم میں ہے یا نہیں ، ان کی مزاجی کیفیت کا تضاد اظہرمن الشمس

ہے کیونکہ وہ پھولوں سے زیادہ کلیوں کے شائق ہیں لیکن ندیوں کے شور کے مقابلے میں سمندر کا سکوت بہتر سمجھتے ہیں - وہ جہاز کی سواری سے ، جو آسمانوں کی سیر کرا سکتا ہے ، کار کی سواری کو بہتر سمجھتے ہیں جو زمین کی چھاتی پر سبک خرامی کے ساتھ چلتی رہتی ہے - باد صرصر کے جھونکے انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتے لیکن نسیم صبح کی اٹھکھیلیوں پر انھیں بڑا پیار آتا ہے ، مگر جب وہ باد صرصر کا کام لینا چاہتے ہیں تو یہاں ان کی شخصیت کے نقوش صاف ابھر آتے ہیں - جو لوگ ان کے ذہنی ارتقا کا راز جانتے انھیں اس عمل سے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی لیکن ان کے قریبی دوستوں اور شاگردوں کو یہی عمل کبھی کبھی تضاد نظر آتا ہے -

یہ اللہ کا بندہ تقریباً پچپن سال سے اپنے کاندھوں پر اپنی زندگی کا بار لیے ہوئے اس کار گاہ عالم میں حیران و پریشان پھر رہا ہے - آج جسے دنیا لشکر اردو کا سپہ سالار کہتی ہے مانسہرہ تحصیل کے ایک گاؤں منگلور میں پیدا ہوا ، سید نور احمد شاہ کی پدرانہ شفقت نے بیٹے کا نام محمد عبداللہ رکھا - شہروں کے جھمیلوں سے دور کوہسار کی وادی میں پروان چڑھنے والا یہ بچہ علم کی وسعتوں کو کیا سمجھ سکتا تھا لیکن باپ کی زاہدانہ تلوار اور ماں کی مجاہدانہ محبتوں نے اسے وہ سب کچھ دے دیا جو ایک مسلمان سپاہی کے لیے درکار ہے - آج بھی ڈاکٹر صاحب کی فطرت کے یہی دو محاسن اجاگر ہیں - آغاز جوانی تھا کہ ایبٹ آباد کی پر رونق گلیوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا - وہیں سے میٹرک کرکے لاہور کی سعادت انھیں یہاں کھینچ لائی - مولانا احمد علی کی تربیت کا اثر کہو یا مذہب کے پرانے نقوش کی جلوہ گری کہ اسی لاہور سے عربی اور فارسی کی مختلف ڈگریاں لے کر علوم دنیا و دینوی پر ایسا دسترس حاصل کیا کہ آج تک اس دریا کے سوتوں سے ہزاروں سرچشمے بہہ نکلے اور ہزاروں شاگردوں نے استفادہ کیا - ابھی طالب علمی کا زمانہ تھا کہ گردش روزگار اور علم کی پیاس دریائے جمنا کے کنارے سرزمین علی گڑھ لے چلی ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' جامعہ ملیہ نے اس ناخواندہ مہمان کو اپنی آغوش میں جگہ دی - محمد علی جوہر کی نگاہوں نے اس ابھرتے ہوئے نوجوان کو تہور کی تعلیم دی ، ذاکر حسین کے جذبۂ اتحاد نے اسے صراط مستقیم پر چلانے

کی کوشش کی ، عابد حسین کی بلاغت افکار نے اس کے دل و دماغ میں بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھر دیں۔ایسی بجلیاں جن میں کڑک نہ ہو ، روشنی ہو - جامعہ ملیہ کا سکوت آمیز ہنگامہ اور ہنگامہ پرور سکوت اس طالب علم کی طبیعت ثانیہ بن گیا ، یہ دور وہ تھا جب خلافت کی بجلیاں مسلمانوں کے خرمن دل پر گر رہی تھیں - ہندو مسلمان سبھی ترکی کی محبت میں اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار تھے - انگریز دشمنی کا بیج یوں تو ۱۸۵۷ع میں ہی بو دیا گیا تھا لیکن اس کی ہری کونپلیں تحریک خلافت کے زمانے میں کھلیں - مولانا محمد علی کی دھواں دھار تقریریں ، حسرت کی جذبات میں ڈوبی ہوئی غزلیں ، شبلی کی حیرت انگیز نظمیں ، ڈاکٹر ذاکر حسین کی کار ہائے نمایاں کرنے کی تلقین اس نوجوان کی طبیعت کا خاصہ بن گئیں - عزم و ارادے سے بھرپور یہ جوان پھر لاہور کی گود کی زینت بنا اور اس تعلیم کی تکمیل میں منہمک ہوگیا - ۱۹۲۲ع میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کرکے ایم - اے فارسی کی دھن میں لگ گیا - ۱۹۲۵ع میں ایم - اے فارسی کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے منسلک ہو گیا - پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اردو فارسی وغیرہ کے تقریباً ہزاروں مخطوطات کے عنوان بہ زبان اردو اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوئے - ۱۹۳۲ع میں ایم - اے عربی فرسٹ ڈویژن میں کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کی تیاری کرنے لگا - ۱۹۳۵ع میں پنجاب یونیورسٹی سے ہی ڈاکٹر آف لٹریچر کا اعزاز حاصل کیا - ۱۹۳۸ع سے آج تک اورینٹل کالج کی حرمت و عزت ، آن بان اور شرف و وقار کے پاسباں ہیں ، اس دور میں انہوں نے پروفیسر شیرانی ، علامہ اقبال اور سر عبدالقادر کی نورانی برکتوں ، اور ادبی صحبتوں سے بڑا فیض حاصل کیا ، یہی سبب ہے کہ آج ان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اسلامی تنقید کی چھاپ نہ پڑی ہو -

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز سیاسیات سے کیا ، جوانی ادبیات میں کاٹی اور جوانی کے بعد والی زندگی اخلاقیات میں گزارنے کا ارادہ رکھتے ہیں - ان کے ہوش و خرد نے جس دور میں آنکھوں کھولیں وہ بڑا پرآشوب دور تھا - کانگرسی لیڈروں کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا - مسٹر گاندھی کی زہر

میں بجھی ہوئی تلوار سے مسلمانوں کے پرے کٹتے جا رہے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق آنجہانی مدن مالوی ، مسٹر گاندھی سے زیادہ سوجھ بوجھ کے مالک تھے - پنجاب میں مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک مرحوم آپ کے مخصوص دوستوں میں سے تھے لیکن جب انھوں نے سیاسی پہلو بدلا تو ڈاکٹر صاحب ان کی رفاقت اور قیادت سے منحرف ہو گئے -

ڈاکٹر صاحب کا تمام وقت یا تو تصنیف و تالیف میں گزرتا ھے یا تعلیم و تدریس میں—اب تک انھوں نے جو کچھ لکھا یا جو کار ھائے نمایاں انجام دیے ، اگر اس کی تفصیل بتائی جائے تو دفتر کے دفتر تیار ہو سکتے ھیں - آپ کی علمی صلاحیتوں کا لوھا موجودہ دور کے تمام نقادان فن نے مانا ھے - آپ کے مضامین مختلف جرائد کی زینت بن چکے ھیں - مغربی اور مشرقی علوم پر جتنا دسترس آپ کو ھے کسی اور کو نہیں - خیالات کی یک جہتی کی وجہ سے اور سیاسیات کی وحدت کی بدولت آپ کے محبوب نقاد اور تاریخ دان مولانا شبلی ھیں لیکن موجودہ دور کی تمام ذھنی تحریکات کا سرچشمہ وہ مولانا محمد حسین آزاد کو سمجھتے ھیں - ان کے قول کے مطابق تربیت ادب کے سلسلے میں مولانا آزاد ، حالی اور شبلی دونوں سے بہتر ھیں - حالی اور اقبال ڈاکٹر صاحب کے غم و الم کا مداوا نہیں کر سکے اسی لیے علامہ اقبال کی جھنکار اور حالی کی دھیمی لے ان کے کان تک تو پہنچتی ھے لیکن سینے تک نہیں اترتی - یہی حال حافظ اور غالب کا ھے - بہتر یہی ھے کہ انھیں کی زبانی سنتے چلیے -

”مجھے پندرہ برس کی عمر میں اقبال کا بیشتر کلام یاد ہو گیا تھا ، اسی زمانے میں مجھے قومی اور سیاسی شاعری سے محبت تھی چنانچہ میں اکبر ، شبلی اور ظفر علی خاں کی نظموں کی طرح اقبال کو بھی ضرورت ہو تو پہروں لگاتار سنا سکتا تھا اور اگرچہ حالی کی دھیمی لے سے کبھی متاثر نہیں ہوا پھر بھی مسدس کے بعض بند مجھے ازبر تھے -“

”بایں ھمہ اقبال کے یہاں علم کی چبھن دب سی گئی ھے اور مسلم ھے کہ علم کی چبھن کے بغیر ارتقا کی گاڑی آگے کی طرف بڑھ نہیں سکتی - ان کے پیغام میں ولولہ اور جوش کا عنصر اتنا زیادہ ہو گیا

ہے کہ بہت دبے ہوئے اور پامال شدہ دل ان کے خیالات کے شعلوں کی تاب نہیں لا سکتے ۔ معرکۂ حیات میں ان کی آواز پُر جلال اور قاہرانہ ہے ۔ حرب و ضرب اور تب و تاب ، جھپٹنا اور چیرنا پھاڑنا اس سے لہو میں گرمی تو پیدا ہوتی ہے مگر اس گرمی سے پہلے زخموں اور جراحتوں کا علاج بھی تو ضروری ہے'' (تقدیر)

''فکر اقبال میں مطالعے کے وقت اس قسم کی الجھنیں اکثر سد راہ ہوتی ہیں ۔ ان الجھنوں میں پڑ کر طبیعت میں بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اقبال کے نظام فکر میں انسان کی اسی مجبوری کا شاید کوئی حل موجود نہیں ۔ اقبال شاید اس مجبوری کو گوارا ہی نہیں کرتے ۔ دراصل جس نظام فکر میں جبریل بھی صید زبوں قرار پا جائیں اور یزداں بھی زیر دام آ سکیں اس شاعری میں مجبوری کا اعتراف ممکن بھی نہیں !'' (تقدیر)

علامہ اقبال سے فطری غیر آہنگی کے باوجود اقبال کی شاعری کو ایک ایسا دستور العل سمجھتے ہیں جس کی ہدایت و رہنمائی فلاح و بہبود کی ضامن ہے ۔ موجودہ لکھنے والوں میں ڈاکٹر صاحب کے نزدیک محمد حسن عسکری ایک خاص اسلوب کے مالک ہیں ۔ ان کی تحریروں کا مدعا قاری کے ذہنوں تک براہ راست پہنچتا ہے ۔ اور اگرچہ حسن عسکری اور خود ڈاکٹر صاحب میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن اپنے دل کی بات دونوں ایک خاص انداز سے کہتے ہیں ۔ دونوں ایک ہی راہ کے مسافر ہیں فرق صرف یہ ہے کہ ایک کی زبان میں چٹخارہ ہے اور دوسرے کی زبان میں سادگی ۔ فراق گورکھپوری سے وہ طبعاً اختلاف رکھتے ہیں ، ان کے نزدیک فراق کی لے بہت بلند ہے لیکن اس میں تصنع اور نمود اس قدر زیادہ ہے کہ وہ حقیقت کے راستے سے بھٹک گئے ہیں ۔ ترقی پسند شعراء میں ان کے محبوب شاعر فیض ، مجید امجد اور شان الحق حقی ہیں ۔

ان کی شائع شدہ کتابوں اور مضامین کی فہرست بہت طویل ہے جس میں سے چند ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے ۔

۱ ۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ۔
۲ ۔ اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ۔

۳ - نوادرالالفاظ خان آرزو (مع مقدمہ)
۴ - شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن -
۵ - بحث و نظر -
۶ - نقد میر -
۷ - تعلیم کے مقاصد -
۸ - مقامات اقبال -
۹ - ولی سے اقبال تک -
۱۰ - سر سید احمد خان اور ان کے رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ -
۱۱ - ارمغان علمی (تالیف)

ان جواہر پاروں کو دیکھ کر کون ایسا کافر ہے جو ڈاکٹرصاحب کی علمیت پر ایمان نہ لائے لیکن جس طرح مولانا شبلی کے قول کے مطابق ان کی بہترین تصنیف الفاروق ہے اور مولانا حالی کی مقدمہ شعر و شاعری اسی طرح سے ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق ان کی بہترین تصنیف نقد میر ہے - اس کے بارے میں نقادان فن کی آراء درج ذیل ھیں :

''فدائے سخن میر تقی میر کے حالات اور ان کی شاعری پر ایک نئے زاویۂ نظر سے تنقید - جس طرح میر تقی میر اردو کے شعری ادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ھیں اسی طرح یہ کتاب بھی اردو کے تنقیدی ادب میں ایک نمایاں حیثیت کی مالک ہے -''

''نقد میر اس اعتبار سے ایک عہد آفریں تصنیف ہے کہ اس نے ھمیں میر کے تخلیقی ذھن کو سمجھنے کے لیے نگاہ کی نئی وسعتوں اور سمتوں سے آشنا کر دیا'' (میرزا ادیب)

حقیقت یہ ہے کہ نقد میر ، میر تقی میر کی سر گزشت کے علاوہ خود مصنف کی بھی سرگزشت ہے جس کے ثبوت میں اس کا آخری باب کافی ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ میر نے نظم میں شاعری کی ہے لیکن مصنف نے نثر میں اپنے شاعرانہ کمالات کو عوام کے سامنے پیش کیا ہے - میر کا درد ، میر کا سوز اور میر کی گھٹی گھٹی سی کیفیت مصنف کے لیے کوئی نئی نہیں بلکہ ان سے منازل حیات خود مصنف بھی

گزر چکا ہے ۔ میر کی ذہنی ساخت اور ان کے شعور کی تجلیاں مصنف کی گرفت سے باہر نہیں ۔ میر کا خلوص یہ تھا کہ اس نے پیکار حیات کے جن گوشوں کا تجربہ حاصل کیا اسے بجنسہ اپنے فن کی بھٹی میں پگھلا کے آنے والی نسل کے سامنے پیش کر دیا ۔ مصنف کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس نے اس بھٹی کے پگھلے ہوئے سونے کو اور اسی سر زمین کے چمکتے ہوئے ذروں کو عالم میں اجاگر کر دیا ہے ۔ یہ ایک اہم کام تھا جس کے لیے ڈاکٹر عبداللہ نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا ۔ میر کے زخم دل کا مرہم ڈھونڈنے میں انھوں نے اپنے قلب کی جراحتوں کو کشادہ کر دیا ۔ میر کی درد مندی کا راز معلوم کرنے کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو سراپا درد بنا لیا ۔ میر خاموش طبیعت انسان تھے ، ڈاکٹر عبداللہ میر کی اس دردمندانہ طبیعت کے صحیح طور پر حقیقی جانشین ہیں لیکن زمانے کے فرق کے ساتھ ساتھ ماحول کے فرق نے بھی ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کو میر کی طبیعت سے جدا کر دیا ہے ۔ دنیا کی اذیتیں ، دنیا کے الم اور دنیا کے دکھ میر نے اپنے دل پر سہے لیکن ان کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسرت کبھی نہ آئی مگر مزاج ایک ایسا عنصر ہے جہاں ڈاکٹر عبداللہ میر کی منزل سے الگ دکھائی دیتے ہیں ۔ میر نے دوستوں کی صحبتیں آٹھائیں ، یاروں کی محفلوں میں رتجگے کیے لیکن ان کے دل کی کلی کبھی نہ کھل سکی ، برخلاف اس کے ڈاکٹر صاحب کی تحریر و تقریر میں ایک ہلکا سا مزاح ہے جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے ان کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے ۔ مثال کے طور پر لیکچر کے دوران علامہ اقبال کے درج ذیل مصرعے کو کچھ اس انداز سے پڑھتے ہیں کہ حاضرین دل ہی دل میں لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں :

تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اس مصرعہ کو ''کدوں'' سے ''پرانے'' تک ایک زیر لب تبسم کے ساتھ دھراتے ہیں جس سے کسی کی تحقیر مقصود نہیں بلکہ وہی مزاح کا پہلو پیش نظر ہے ، اسی طرح اپنے ایک مضمون میں اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ہسپتال کی ایک خاموش رات میں ان کی اہلیہ ان کے سرہانے بیٹھی ہوئی تنہائی اور خاموشی کے پیش نظر ایک مرتبہ ان سے کہنے لگیں

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ شہر خموشاں میں چلے گئے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے نقاہت سے سر ہلاتے ہوئے کہا ''نہیں ابھی ایک سٹیشن پہلے ہیں۔'' یہ اور اسی طرح کی بہت سی مثالیں ان کی نجی زندگی کے بارے میں دی جا سکتی ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا کمال اور فن وہی ہے، جو انھوں نے نقد میر میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں ۱۳ مضامین ہیں اور ہر مضمون دوسرے مضمون سے بہتر ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی سٹائل نہیں لیکن اس کتاب کا بارھواں باب میر کا ایک نقاد پڑھ لینے کے بعد کون ہے جو ان کے اسلوب بیان کو نہ پہچان سکے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی مخالفت اور ان کے افکار جلیلہ کی تردید اس انداز میں کی ہے کہ لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی اور سانپ بھی مر گیا، ایک مثال ملاحظہ ہو:

''مجھے اعتراف ہے کہ میں نے جب بھی میر کے متعلق آزاد کا تبصرہ آب حیات میں پڑھا مجھے اکثر دکھ ہوا، دکھ اس لیے نہیں کہ میر مجروح ہوئے بلکہ اس بات کا کہ میر پر زیادتی میرے محبوب مصنف آزاد کے قلم سے کیوں ہوئی!''

مندرجہ بالا سطور میں زیادتی اور محبوب کے الفاظ اسی قدر متضاد ہیں کہ با شعور مطالعہ کرنے والا یہ فوراً بھانپ لیتا ہے کہ مضمون کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کی یہی نگارش، ان کے لکھنے کا یہی اسلوب اور ان کے بات کرنے کا یہی طریقہ ان کے تمام مضامین کی جان ہے۔ دل خوش کن الفاظ، جس میں کبھی طنز اور مزاح کی بجلیاں تڑپتی ہوئی نظر آتی ہیں ڈاکٹر صاحب کے قلم سے ایسی ٹپکتی جاتی ہیں، جیسے ساون اور بھادوں کی جھڑی۔ اسی کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی جبلت اور اپنی فطرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کوئی بڑے نقاد ہیں بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ مدرس کہنے پر اکتفا کیا۔ طالب علم اس لیے کہ اس کی ذات ان قیود سے آزاد ہو جاتی ہے جو ایک نقاد کے لیے ضروری ہے، مدرس اس لیے کہ اپنے دل کی بھڑاس اور اپنے قلم کی جھلاہٹ سوائے اس پیشے کے کسی دوسرے پیشے میں نہیں نکل سکتی، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ مشرق میں

مدرس ایک ایسی ہستی ہے، جس کے ذہن کے سمندر سے ساری دنیا سیراب ہوتی ہے لیکن جس کی زندگی پر تمام عالم تأسف کرتا ہے۔ یہی تأسف میر کی حرمان نصیبی سے مماثلت اور مشابہت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو چونکہ اس طریقۂ زندگی کے صرف پہلے پہلو سے دلچسپی ہے اس لیے اکثر و بیشتر اپنے کو مصنف کے بجائے مدرس کہنا فخر سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت ہمہ گیر ہے اور جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے ان کے خاص دوست بھی انہیں سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ ایسا ہی ایک مغالطہ ڈاکٹر صاحب کے ایک قریبی دوست اور نقاد فارغ بخاری صاحب کو ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ادبیات سرحد جلد سوم میں ڈاکٹر صاحب کی تنقیدوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

"وہ ان دنوں طبعاً تسکین دوست ہو چکے ہیں، اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ تھکن اور یہ اضمحلال کی علامت ہے جس کا پیرانہ سالی اور غیر صحت مند قویٰ سے گہرا تعلق ہے۔"

جناب فارغ بخاری اردو کے ایک اچھے اور مرنجاں مرنج قسم کے نقاد ہیں ان کی علمی استعداد اور فنی سوجھ بوجھ سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو اتنا کم سمجھ سکیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ ادب کو خانوں میں بانٹنے سے ادیب کے ارتقاء کے دروازے بند ہو جاتے ہیں بالکل ٹھیک ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ سیاسی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی غرض ہر اس قسم کے پھل لگے ہوئے ہر ادب کو بے جان اور بے کار سمجھتے ہیں لیکن ان کا یہ خیال بھی ہے کہ اگر شاعروں اور ادیبوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رقص کرتے کرتے برہنہ ہو جائیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر ادیب کے لیے کچھ قیود اور پابندیاں ہونی چاہئیں۔ غالباً ایسا کہنے سے ڈاکٹر صاحب کی مراد منٹو کے وہ اقوال ہیں جن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ فطرت کی ودیعت کردہ ہر شے کا اظہار اور اس کی نمائش حقیقی فن ہے حالانکہ فطرت خود اس سلسلے میں بڑی ستم ظریف واقع ہوئی ہے کیونکہ اس نے انسان کے جسم میں روح، عقل اور شعور پوشیدہ ہی رکھا ہے اور اگرچہ انسان اس کی نمائش ہر طرح سے کرتا رہتا ہے لیکن صحیح تصورات عقل اور مکمل جذبات

دلی نہ واضح ہوئے ہیں اور نہ ہی واضح ہو سکیں گے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بخاری صاحب کو ڈاکٹر صاحب کے ان اقوال میں تضاد کہاں اور کیسے معلوم ہوا۔ بخاری صاحب کا خود یہ کہنا ہے کہ اس وقت دنیا کے لیے معاشی مسئلہ سب سے اہم ہے ایک وقتی سی بات ہے۔ جب وہ یہ جانتے ہیں کہ اعلیٰ ادب ہمیشہ مستقل اقدار کا حامل اور دیرپا اثرات کا ضامن ہوتا ہے تو پھر اس وقتی ادب کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مانا کہ انسانی حیات کے لیے روٹی ضروری ہے لیکن روٹی ساری زندگی تو نہیں، روٹی روٹی کرنے سے نسل انسانی بر قرار رہ سکتی ہے لیکن حیات انسانی کو گھن لگنے لگتا ہے اور اس کے جوہر کی چمک دمک ختم ہونے لگتی ہے۔ چونکہ موجودہ دور کے ادیب ایک ایسا مقصدی ادب پیش کر رہے ہیں جس کی بنیاد سطح آب پر ہے اس لیے ڈاکٹر صاحب کا ایسے حضرات سے اختلاف یقینی ہے کیونکہ وہ پائیدار ادب اور ناقابل تردید حقیقت کے پجاری ہیں۔ ان کے نزدیک ادب کا مقصد حیات انسانی کو فروغ بخشنا ہے۔ انسان کے کائناتی مطالعہ میں اگر اس کی ذات آئینہ بن کر سامنے آ جاتی ہے اور وہ اسے اسی طرح پیش کر دیتا ہے کہ تھوڑی دیر کو سہی ساری دنیا اس آئینہ میں اپنی تصویر دیکھ لے تو اس ادیب اور فن کار نے اپنا حق ادا کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں ادیب اور قاری جس منزل پر ہم خیال اور ہم مزاج ہوجائیں وہاں فن پورے عروج پر ہوتا ہے، یہ ایک نمایاں سی حقیقت تھی لیکن افسوس ہے کہ بخاری صاحب نے اس میں وہی بے ڈھنگے گوشے نکال کر اپنے قارئین کو بہلانے اور اپنے گروہ کی وکالت کی ایک ہلکی سی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تمام تصنیفات پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا دل اسلامی تعلیمات کی شراب سے مست اور ان کے ذہن پر الٰہیا کی مے کا نشہ چھایا ہوا ہے۔ اگر مولانا عبدالحق کے نزدیک ایمان کے بعد سب سے پیاری شے اردو ہے تو ان کے نزدیک اردو ہی ایمان کی ضامن ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب میں نے ان سے رومن رسم الخط کے بارے میں استفسار کیا تو وہ اپنے گھر میں صوفے پر تن کر بیٹھ گئے اور سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ انگریزی زبان کو آٹھ کروڑ پاکستانیوں پر مسلط کرنے کی سب سے پہلی چال ہی رومن

رسم الخط کا پرچار ہے - انھوں نے کہا ، یاد رکھیے کہ اگر موجودہ رسم الخط اختیار کیا گیا تو اردو ہی نہیں اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا - میں نے اس جملے کی مزید وضاحت نہ چاہی اور دل ہی دل میں ان کی بصیرت کی داد دیتا ہوا اور یہ مصرع گنگناتا ہوا ان سے رخصت لے کر لاہور کی ہنگامہ پرور فضا میں کھو گیا ع

واقعی بے مثال ہیں یہ لوگ

ہفت روزہ نصرت لاہور ۲۳ جولائی ۱۹۶۱ -

یونیورسٹی سے طویل رخصت
کے موقع پر
تاثرات اور ادارے

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

ڈاکٹر سید عبداللہ — شفیق استاد، عظیم محقق

"ڈاکٹر سید عبداللہ پنجاب یونیورسٹی میں ۳۱ سال تک تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد اپنے منصب سے قبل از وقت سبک دوش ہوگئے" "سنڈیکیٹ نے اپنی باضابطہ قرارداد کے ذریعے یونیورسٹی کے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ کی چالیس سالہ مخلصانہ اور بے لوث خدمات کو خراج تحسین ادا کیا اور کہا ان کے ریٹائر ہو جانے سے یونیورسٹی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔"

ہزاروں، لاکھوں پاکستانیوں نے یہ رنج دہ خبر دھڑکتے دل سے سنی۔ ہزاروں آنکھیں اشک بار ہوئیں اور نہ جانے کتنے ہی لوگوں نے اس المیے کو محسوس کیا ہوگا جس کی بھنک کئی دنوں سے تعلیمی حلقوں میں سنی جا رہی تھی۔ ایسے زمانے میں جب کہ ہمارا تعلیمی نظام ایک انتشاری صورت حال سے دو چار ہے اور استاد اور شاگرد کا روایتی تہذیبی رشتہ تار عنکبوت کی طرح ٹوٹتا جا رہا ہے، ایک ایسے استاد کی خدمات سے محرومی جو اس تہذیبی روایت کا دور جدید میں نمائندہ ہے، قومی المیے سے کم نہیں!

کتنے بد نصیب ہوں گے وہ طالبان علم جو اب اس سر چشمۂ فیض سے محروم رہیں گے، جہاں علوم و ادبیات کا درس ہی نہیں ملتا تھا، محبت، شفقت، اخلاق، آداب، درد مندی، جینے کا سلیقہ اور ہر وہ شے جو آدمی کو انسان بناتی ہے اور اب ہمارے کاروباری نظام تعلیم میں رفتہ رفتہ مفقود ہوتی جارہی ہے۔ نئی نسلیں مکتب کی 'کرامت' میں کھوئی رہیں گی۔ اور اس فیضان نظر سے محروم رہیں گی، جو بیک وقت علم آموز بھی ہے اور آداب آموز بھی۔ دور جدید میں ڈاکٹر سید عبداللہ ماضی کی اس عظیم تہذیبی، تعلیمی روایت کے ایک

بڑے نمائندے تھے جن کے فیض سے ہم اپنی بدنصیبی سے محروم ہو گئے ہیں -

ڈاکٹر سید عبداللہ ایک شفیق استاد کی حیثیت سے اپنی عظمت کا سکہ ہزاروں دلوں پر بٹھا چکے ہیں - پنجاب یونیورسٹی میں تحقیق و تصنیف کا کامیاب ثبوت دینے کے بعد بحیثیت استاد ان کی محبت و شفقت کا یہ سلسلہ ۱۹۳۸ع سے جاری ہوا جب آپ شادان بلگرامی کی جگہ استاذ فارسی مقرر ہوئے - ۱۹۴۰ع میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی جگہ استاذ اردو مقرر ہوئے - ۱۹۴۵ع میں ریڈر اردو اور ۱۹۵۳ع میں یونیورسٹی پروفیسر اردو مقرر ہوئے - ۱۹۵۹ع میں دوسرے منصبی فرائض (پرنسپل و صدر شعبۂ اردو) کے علاوہ صدر شعبۂ عربی کے فرائض بھی سنبھالے- ان مختلف مناصب کے تنظیمی امور سر انجام دینے کے ساتھ آپ نے ایم - اے اردو فارسی عربی کی تدریس میں بھی حصہ لیا - ایم - اے اور پی ایچ - ڈی کے تحقیقی مقالات کی نگرانی بھی کی، اورینٹل کالج کی تنظیم نو کر کے اسے ایک عظیم‌الشان ادارہ بھی بنایا اور مختلف علمی و تعلیمی کانفرنسوں کی تنظیم کر کے علوم مشرق اور اردو زبان کی ترویج کے ایسے کارہائے نمایاں سر انجام دیے جو ہماری علمی، تعلیمی اور تہذیبی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے - اور لوگ سوچیں گے کہ ایک تن ناتواں میں آخر وہ کون سی قوت تھی جو بیک وقت اتنے عظیم کام سر انجام دیتی رہی اور طرفہ تو یہ کہ ہر وقت ہشاش بشاش اور تازہ دم اور زندگی اور مسرت کا یہی احساس طلبہ اور رفقا میں بھی پیدا کرتی رہی ! ڈاکٹر سید عبداللہ نے درس و تدریس میں اس خلوص، شغف اور انہماک سے حصہ لیا کہ اس خدمت کو منصبی فریضہ ہی نہیں سمجھا بلکہ اس کو جذب و شوق کا بلند مقام دیا اور اسی میں مسرت و راحت کو تلاش کیا - جاننے والوں کو یہ حقیقت معلوم ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جب پنجاب یونیورسٹی میں ایم - اے اردو کی تدریس کا سلسلہ شروع ہوا تو ابتدا میں اساتذہ کا انتظام نہ ہو سکا اور ڈاکٹر صاحب تن تنہا ساٹھ ساٹھ ستر ستر طلبہ کو درس بھی دیتے اور ان کے تحقیقی مقالات کی نگرانی بھی کرتے رہے - یہ وہ زمانہ تھا جب تحقیقی مقالہ لازمی تھا - ان کے شوق کا یہ سلسلہ اب تک بدستور جاری رہا - کوئی کلاس خالی ہے - کسی

وجہ سے استاذ نہیں آیا ۔ سید صاحب پڑھانے کے لیے وہاں آ موجود ہوئے ۔ ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے ۔ چند برس ہوئے گنگا رام ہسپتال میں ڈاکٹر صاحب کا ہرنیا آپریشن ہوا ، جس روز صحت یاب ہو کر ہسپتال سے نکلے ، موٹر پر سوار ہوئے ، بیگم صاحبہ ساتھ تھیں ۔ موٹر گھر کی سمت روانہ ہوئی ۔ اچانک راستے میں ڈاکٹر صاحب نے موٹر رکوائی اور ڈرائیور سے کہا موٹر کالج کی طرف لے جاؤ ۔ سب حیران ، کالج میں جا کر ابھی کیا کرنا ہے ۔ خیر کالج پہنچے ۔ فرمایا ''میں طلبہ کو درس دے کر گھر جاؤں گا ۔ کئی روز سے یہ محرومی رہی'' یہ تو ایک واقعہ ہے ، کئی بار ایسا ہوا ، طویل سفر سے واپسی ہوئی ، سیدھے کالج پہنچے ، درس دیا ۔ صحن کالج میں بیٹھ کر اساتذہ سے ملے ۔ طلبہ سے باتیں ہوئیں ، اور پھر گھر روانہ ہوئے ۔

سید صاحب کے ہزاروں شاگرد فارغ التحصیل ہونے کے بعد مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کام کر رہے ہیں ۔ سب اس بات سے اتفاق کریں گے کہ سید صاحب کا طریق تدریس اتنا شگفتہ ، دلچسپ اور مؤثر ہوتا ہے کہ جی چاہا ''کاش! ہمیشہ طالب علم رہیں اور یہ درس سنتے رہیں ۔'' علم و ادب کے ٹھوس حقائق کو خوش مذاق کی آمیزش سے دلچسپ بنا کر اس طرح پیش کرنا کہ علم و حکمت کا ایک ایک نکتہ ذہن نشین ہو جائے سید صاحب کے درس کی نمایاں خصوصیت ہے ۔ ساٹھ منٹ کا پیریڈ ایک سو بیس منٹ پر جائے لیکن اکتاہٹ کا گزر تک بھی نہ ہو گا ، اور یہ بات صرف درس و تدریس تک محدود نہیں رہتی بلکہ طلبہ کے ہر درد کا درمان سید صاحب کی ذات بنی رہی۔ طلبہ اپنا اپنا دکھ درد لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں اور حوصلہ مندی ، اطمینان اور تبسم کی ملی جلی کیفیات لے کر لوٹ رہے ہیں ۔ یہ ایک ایسا دربار ہے جہاں کوئی ضابطہ نہیں ، سوائے ضابطۂ محبت کے ۔ بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں اس ضابطۂ محبت کے آگے جھک گئیں ۔ افسوس کہ یہ باتیں اب ہمارے تعلیمی نظام میں خواب و خیال ہوتی جا رہی ہیں ۔ طلبہ ایک مشفق استاد کی شفقتوں سے محروم ہو گئے لیکن ملک و قوم غالباً اب ڈاکٹر صاحب کی خدا داد صلاحیتوں سے زیادہ بہرہ ور ہو سکے گی ۔ کیونکہ وہ ایک شفیق استاذ کے علاوہ محقق، مصنف، ادیب، نقاد ، ماہر تعلیم اور تہذیبی و

معاشرتی قدروں کے ادا شناس بھی ھیں ۔ انھوں نے تصنیف و تالیف کے علاوہ بڑے بڑے علمی، تعلیمی اور تہذیبی منصوبوں کی داغ بیل ڈالی اور ان کو سرسبز و شاداب بنایا ۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ، پاکستان اوریئنٹل کانفرنس (۱۹۵۶ع) اردو کانفرنس (۱۹۴۸ع) اردو کانفرنس (۱۹۶۱ع) وغیرہ کی تنظیم کرنے کے علاوہ اردو اکیڈمی کی تعمیر و تاسیس کرکے اسے پاکستان کا ایک فعال ادارہ بنایا ۔ مختلف تعلیمی، معاشرتی اور تہذیبی موضوعات پر ڈاکٹر صاحب نے وقتاً فوقتاً جو بلند پایہ مضامین (اردو انگریزی) لکھے اور مختلف مجالس میں تقاریر ارشاد فرمائیں ان سے ملک کے اھل فکر و نظر نے بڑی بصیرت حاصل کی ھے شاید قدرت ان سے اس سلسلے میں مزید کام لینا چاھتی ھے ۔

———

نوائے وقت ۔ لاھور

ممتاز منگلوری

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ــــ عظیم استاد

۲۵ جنوری ۱۹۶۵ع کی دوپہر کو استاد محترم ڈاکٹر سید عبداللہ اورینٹل کالج میں اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے اساتذہ کے ساتھ مصروف گفتگو تھے کہ انہوں نے بڑی خاموشی سے اپنے ذاتی کاغذات میں سے ایک کاغذ نکال کر لفافے میں بند کرکے یونیورسٹی کے دفتر کو بھیج دیا ۔ میں اس کاغذ کی نوعیت سے باخبر تھا ۔ پاس ادب ، دل میں امنڈتے ہوئے طوفان کے اظہار میں مانع تھا ۔ اس محفل میں موجود اصحاب کو اس بات کا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ اس سکون کے ساتھ جو لفافہ بھجوایا گیا ہے اس میں قبلہ سید صاحب نے اورینٹل کالج اور پنجاب یونیورسٹی سے اپنی چالیس برس کی وابستگی کو منقطع کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔

بات پھیلتی گئی ۔ بیم و یاس کی گھڑیاں قریب تر ہوتی گئیں ۔ بالآخر ۱۳ فروری کی شام کو لاہور ریڈیو نے اپنی مقامی خبروں میں اور ۱۴ فروری کے اخبارات نے اس خبر کی تصدیق کر دی جسے سن کر اورینٹل کالج کے چمن کا بوڑھا برگد بھی اداس اور اشکبار تھا ۔ سنڈیکیٹ نے استاد محترم کو قبل از وقت ریٹائر ہو جانے کی اجازت دے دی تھی ۔

اس مادر علمی نے جس کا وجود پنجاب یونیورسٹی سے بھی پہلے معرض وجود میں آیا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی بدولت پنجاب یونیورسٹی نے جنم لیا ، ایک وہ دور بھی دیکھا تھا جب یہاں کا پرنسپل (ڈاکٹر وولنر) پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی ہوا کرتا تھا ۔ علوم مشرقی کی ترویج و تدریس کے لیے ہر ممکن وسائل سے کام لیا جاتا تھا اور ملک کے کونے کونے سے قابل اساتذہ کو یہاں لانے

کی کوشش کی جاتی تھی ۔

لیکن آزادی کے بعد اس کالج میں ابتلا کا وہ دور بھی آیا کہ کالج کی ہستی کا مسئلہ ہی کچھ مخدوش سا نظر آنے لگا ۔ فاضل جماعتوں کو یہاں سے نکال کر ثانوی تعلیمی بورڈ کے سپرد کر دیا گیا ۔ مشرق علوم کی اس تحدید کے ساتھ ساتھ مغربی زبانوں کی تدریس کا سارا سلسلہ بھی مفقطع کر دیا گیا ۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ اس کالج کو پیروئ مغرب اور انگریزی زبان کے تسلط کی راہ میں ایک روڑا تصور کیا جاتا تھا ہمارے محکوم ذہن انگریز کی تہذیب اور انگریزی کی صاحبی کے دلدادہ تھے اور یہاں وہی عربی ، فارسی ، اردو ، قدیم مشرق تہذیب اور اسلامی اقدار کی آبیاری ہو رہی تھی اس لیے اس کا مقہور اور معتوب ہونا بدیہی امر تھا ۔

لیکن قدرت کو ابھی اس عظیم درس گاہ کا ثبات منظور تھا ۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب مؤرخ تاریخ اوریئنٹل کالج . . . . . ''تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اوریئنٹل کالج آزمائش کے اس کڑے دور سے گزر کر اگر زندہ و سلامت رہا تو یہ امر فضل ایزدی کے بعد کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی ہمت و استقامت اور پاکستانی جمہور کے ملی شعور و احساس کا نتیجہ ہے ۔'' بقول سید صاحب ۱۹۵۸ع تک ''میر کے چراغ مفلس کی طرح اوریئنٹل کالج کا چراغ ہستی بھی حوادث کے تھپیڑوں میں فنا و زیست کے مرحلے طے کرتا رہا ۔'' جناب سید صاحب نے اس گرداب سے اوریئنٹل کالج کے سفینے کو نہ صرف صحیح سلامت ساحل مراد تک پہنچایا بلکہ اسے وہ استقامت اور عروج بخشا کہ آج یہاں طلباء کی تعداد اس دور کی نسبت پانچ گنا اور سات گنا دکھائی دیتی ہے اور یہاں کے فارغ التحصیل اوریئنٹل کالج کا طالب علم ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں ۔ تاریخ ، سید صاحب کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور اس کے لیے پوری قوم ان کی ممنون احسان ہے ۔

مشرق تہذیب و علم و ادب کی اس عظیم درس گاہ میں اپنوں نے جو رخنے پیدا کیے ، ان کے برے اثرات سے اسے بچانے کے لیے قبلہ سید صاحب نے کس عزم ، استقامت ، محنت اور جانفشانی سے کام کیا یہ بہت طویل داستان ہے ۔ جب آپ نے پہلے پہل قائم مقام پرنسپل کی حیثیت

سے درس گاہ کا چارج لیا تو نظم و نسق کی ابتری کی یہ حالت تھی کہ سارا دفتری ریکارڈ کھلے کاغذوں کے پلندے کی صورت میں الماری میں پڑا رہتا تھا ۔ اگر کبھی کوئی کاغذ درکار ہوتا تو سارے پلندے کی پھروں چھان پھٹک ہوتی رہتی ۔ اس بد نظمی میں کچھ نوازشات یونیورسٹی کے ارباب اقتدار کی بھی تھیں کیوں کہ یہ باور کیا جاتا تھا کہ ''اوریئنٹل کالج کے دفتری نظام کو چلانے کے لیے صرف ایک لیڈی سٹینو ھی کافی ھے ۔'' استاد محترم نے اس بد نظمی کو دور کرنے کے لیے روزانہ صبح سے رات گئے تک خود ھیڈ کلرک کی میز پر بیٹھ کر کام کیا اور نظام کو استحکام بخشا ۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ خیال نہیں کرنا چاھیے کہ صرف دفتری مسائل ھی قابل توجہ تھے بلکہ پنبہ کجا کجا نہم کے مصداق ملک میں علوم السنہ شرقیہ کی حوصلہ افزائی کے لیے فضا پیدا کرنا ، ان کی ترویج کے لیے تجاویز سوچنا اور ان پر عمل پیرا ہونا ، علوم السنہ شرقیہ کے مخالفین کے حملوں کا تدارک کرنا ، طلبا کے مسائل اور ان کا حل ، تحقیق و تصنیف کے لیے فضا پیدا کرنا ، رھنمائی کرنا اور خود تحقیق و تصنیف کا کام جاری رکھنا ، کالج کو دیگر علمی حلقوں میں باوقار بنانا الغرض ایسے بیسیوں محاذ تھے جن پر بیک وقت اور پوری قوت سے کام جاری رکھنا تھا ۔ اور ان سب فرائض سے بڑا فرض جسے استاد محترم اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ھیں اور جسے آپ نے ھمیشہ دیگر فرائض پر مقدم جانا ھے ۔ وہ درس و تدریس کا فرض ھے ۔ درس و تدریس سے والہانہ لگن کی یہ ایک ادنیٰ سی مثال ھے کہ آپ نے اپنی چالیس برس کی ملازمت میں ایک دن کی بھی چھٹی نہیں لی اور ان تمام ثانوی فرائض کی سر انجام دھی کے ساتھ ساتھ اردو ، فارسی ، عربی تینوں شعبوں میں لیکچر دیتے رھے اور آج تک تینوں مضامین پڑھاتے رھے بلکہ ان کلاسوں کے علاوہ آپ فاضل جماعتوں کو بھی پڑھاتے تھے ۔

اکثر سوچتا ھوں کہ سید صاحب اتنی بڑی ذمہ داریوں سے بیک وقت کس طرح عہدہ برآ ھو لیتے ھیں تو حیرت ھوتی ھے اور اقبال کا یہ مصرع سوالیہ بن کر رہ جاتا ھے ع

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

قبلہ سید صاحب یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں اور دیگر بورڈوں

کے علاوہ اوریئنٹل کالج کے پرنسپل ، صدر شعبہ اردو، صدر شعبہ عربی، صدر شعبہ تالیف و ترجمہ ، لائبریرین پنجاب یونیورسٹی کے عہدوں میں سے اکثر پر بیک وقت کام کرتے رہے - قومی زبان کی ترویج کے لیے آپ جو کام کرتے رہے وہ ان سے الگ ہیں ، جن میں مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے عظیم علمی منصوبوں کی تکمیل، اردو کالج کا نظم و نسق ، انجمن ترقیٔ اردو لاہور کی نظامت وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، اور قومی زبان کی ترویج کے لیے جس بے سر و سامانی کے عالم میں درجنوں کانفرنسیں جس کامیابی کے ساتھ منعقد کیں یہ آپ کے جذب صادق اور ذات باری تعالیٰ میں کامل اعتماد کا نتیجہ تھا -

استاد محترم کی شخصیت کے اس پہلو کا اثر اوریئنٹل کالج کے فارغ التحصیل طلبا میں نمایاں نظر آتا ہے ، یہاں سے جانے والے طالب علم صرف علم اور ڈگریاں ہی لے کر نہیں جاتے بلکہ استاد محترم کی عظیم شخصیت سے درویشی ، قناعت ، صبر ، نظم و ضبط ، خلق اور دردمندی کی صفات کا بھی گہرا اثر ساتھ لے جاتے ہیں ، یہاں سے علم و ادب کا ذوق لے کر نکلتے ہیں اور تمام عمر تحقیق و تصنیف کے میدان میں اس ذوق کی تسکین کے لیے محو تگ و تاز رہتے ہیں - لیکن قطرے کو گوہر آب دار بنانے کے لیے کتنے مدارج سے گزرنا پڑتا ہے ، تحقیق و تصنیف، علم و ادب کا یہ ذوق آسانی سے پیدا نہیں ہوتا ، اس کے لیے استاد کو طالب علم سے زیادہ ریاضت کرنی پڑتی ہے - ایک زمانے میں ایم - اے کے ساتویں پرچے میں تحقیقی مقالہ پیش کرنا لازمی ہوتا تھا - ان دنوں کالج کی بالائی منزل کے برآمدے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کلاسوں کے بعد طالب علموں کی قطار لگی ہوتی تھی اور سید صاحب ان سب تشنگان علم کی تشنگی بجھانے میں بے تکان مصروف رہتے - لیکن جب تحقیقی مقالے کی شرط اٹھ گئی تو بھی آپ دیگر تمام اساتذہ سے زیادہ مقالات کی نگرانی کرتے رہے ، اور بورڈ میں پیش ہونے سے پہلے پی ایچ - ڈی کے مقالات کی رہنمائی کے علاوہ پی ایچ - ڈی کے بے شمار مقالات کی نگرانی کی - کالج کے بعد بھی آپ گھنٹوں کالج کے چمن میں تحقیقی مقالات کی رہنمائی میں مصروف رہتے ، جس طالب علم کی نگرانی اپنے ذمے لیتے تو پھر اس میں محنت اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا

کرتے۔ آپ فرمایا کرتے ہیں ''ایم۔ اے میں تحقیقی مقالہ لکھوانا دراصل طالب علم کو آئندہ کے لیے ٹریننگ دینا ہے، اس کی غلطیوں پر برہم ہونا اور اس سے کہنہ مشقی کی توقع رکھنا کہاں کا انصاف ہے۔ استاد کا کام ہے کہ جس کا ہاتھ تھامے اسے ان رموز و اسرار سے باخبر کرتے ہوئے اپنے فن میں کامل بنائے۔''

استاد محترم کے فلسفۂ دردمندی کے متعلق اکثر غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اتنی ریاضت ہر کسی کے بس کا روگ نہیں، اس کے لیے پہلو میں دل درد آشنا اور دل خدا ترس کی ضرورت ہے۔ استاد محترم نے اتنی مصروفیات کے باوجود خود جو تحقیق و تصنیف کا کام کیا وہ اپنی جگہ ایک عظیم مقام رکھتا ہے اور ایک عمر کا کام ہے۔ آپ نے کم و بیش ۲۵ گراں قدر علمی و تحقیقی کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں سے دس کے قریب زیر طبع ہیں اور دو سو کے لگ بھگ تحقیقی و تنقیدی مقالات لکھے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک سند ہے۔ علاوہ ازیں مجھ جیسے ادنیٰ تلامذہ کی جانب سے جو بار پڑتا ہے وہ الگ ہے۔ مجھے آج بھی وہ الفاظ یاد ہیں جب میں نے ۹۶ اسناد تصدیق کے لیے ڈاک میں بھجوا دیں، تو دوسرے دن سب پر دستخط ثبت تھے لیکن ایک کاغذ کے پرزے پر یہ بھی لکھا تھا، مصروفیت کے دنوں میں اتنا بوجھ ڈالنا ذرا زیادتی ہے۔

اورینٹل کالج کی درویشانہ فضا میں استاد محترم نے جن اخلاق قدروں کی خون جگر سے آب یاری کی ہے اور مشرق تہذیب کے جن نقوش کو ابھارا ہے وہ اورینٹل کالج کا طرۂ امتیاز ہیں۔ آپ نے استاد اور شاگرد کے رشتے کی صحیح روح کو اس قدر ابھارا ہے کہ یہاں کا ہر طالب علم آج کے دور میں بھی اساتذہ کی سچے دل سے تعظیم کرتا ہے، ظاہر ہے پند و موعظت کی بجائے خود مثال بننا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ چناں چہ استاد محترم نے طلبا کے لیے اپنے آپ کو مثالی پیکر بنا کر پیش کیا ہے؛ انہیں خلوص، شفقت اور دردمندی کے جذبے سے سرشار کیا ہے۔ اپنے اور طلبا کے درمیان ایسے کسی بُعد کو قائم نہیں ہونے دیا جو شکوک و بدگمانی کی فضا پیدا کرے۔ آپ نے ہمیشہ طالب علموں کو شفیق باپ کی محبت دی ہے۔ طالب علم اپنی مشکلات آپ سے بیان کرکے اور آپ کی پدرانہ شفقت اور خلوص سے بھری

مسکراہٹ کے ساتھ ہمدردی میں ڈوبی ہوئی آواز میں دو بول سنتے ہی اپنا سارا غم بھول جاتا ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس مادر علمی کے ہر فرزند کا سر اپنے اس مشفق و محسن عظیم استاد کے حضور ہمیشہ فرط عقیدت سے جھک جاتا ہے اور جھکتا رہے گا ۔

استاد محترم نے ملک میں تعلیم کے دروازے ہر کس و ناکس پر کھول دینے کے لیے برسوں جس مستقل مزاجی سے جد و جہد کی وہ اب اپنا رنگ لا رہی ہے اور قبلہ سید صاحب کی یہ خدمات قوم کے لیے ناقابل فراموش ہیں ۔ آپ فرمایا کرتے ہیں کہ کسی مستحق طالب علم پر تعلیم کا دروازہ یہ کہہ کر کس طرح بند کر دوں کہ اس چھت کے نیچے تمھیں جگہ نہیں دے سکتا ، یونیورسٹی یا کالج کے وسائل محدود ہونے کا خمیازہ طالب علم کیوں بھگتے ۔ آپ کے اسی عقیدے کی بدولت آج ایم ۔ اے اردو میں تقریباً ساڑھے تین سو طالب علم زیر تعلیم ہیں اور اسی عقیدے نے دروازوں کی قید و بند کو توڑ کر کھلے آسمان کے نیچے کالج کے چمن میں کلاس لگانے کو اس بات پر ترجیح دی کہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے مستحق طلبا کو ان کے داخلے کے حق سے محروم کر دیا جائے ۔

ابھی کل کی بات ہے کہ استاد محترم نے اورینٹل کالج کے یوم تاسیس کے موقع پر اپنے خطبۂ استقبالیہ میں اورینٹل کالج کو اورینٹل یونیورسٹی بنانے کا عزم ظاہر کیا تھا لیکن تعجب ہے کہ اس خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے سے بہت پہلے آپ نے یک لخت ریٹائرمنٹ کا فیصلہ کیوں کیا ؟ تمام عمر علم و ادب اور قوم کی بے لوث خدمت کرنے والی اس عظیم شخصیت نے مشرقی علوم و تہذیب کی اس نمائندہ درس گاہ سے قطع تعلق کرنے کا فیصلہ کیوں کیا جس کے تحفظ کے لیے آپ نے عمر عزیز کا بیشتر حصہ صرف کیا اور بڑے سخت حوادث کا مقابلہ کیا ۔ ذاتی مفاد کو ہمیشہ قومی و ملی مفاد پر قربان کر دینے والی اس ہستی نے تنہائی کیوی پسند کر لی ؟ میں جانتا ہوں کہ استاد گرامی قدر اورینٹل کالج سے الگ رہ کر بھی قومی زبان اور علم و ادب کی خدمت جاری رکھیں گے انشاء اللہ! لیکن اس مادر علمی کو ایسا شفیق فرزند کہاں سے ملے گا جو علوم شرقیہ کے نور کو پھیلانے کے سوا اور کوئی خواہش دل میں نہیں رکھتا ہو ۔

کوہستان ۲۴ فروری ۱۹۶۵ع

ڈاکٹر سید عبداللہ کی سبکدوشی

اوریئنٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سید عبداللہ پنجاب یونیورسٹی میں تیس سال تک مشرقی علوم کی خدمت انجام دینے کے بعد اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے ہیں - ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پر نہیں ہو سکتا ، لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ ان کے درجے اور مرتبے کے معلم سے کسی تعلیمی ادارے کا محروم ہو جانا اس کی بہت بڑی بد قسمتی ہے -

ڈاکٹر سید عبداللہ اس دور میں جب کہ تعلیم کاروبار بن چکی ہے اور تعلیمی پیشہ اپنے تقدس سے محروم ہو چکا ہے ، عہد قدیم کے اساتذہ کا ایک عمدہ نمونہ تھے - یہی وجہ تھی کہ ان کے شاگرد انھیں اپنا استاد ھی نہیں اپنا باپ اور بزرگ بھی سمجھتے تھے - ڈاکٹر صاحب کو معلمی کے پیشے سے عشق تھا اور جو علوم وہ پڑھاتے تھے - ان سے بلا شبہ ان کو عقیدے کی حد تک محبت تھی - افسوس کہ پنجاب یونیورسٹی نے انھیں ھاتھ سے کھو دیا -

ڈاکٹر سید عبداللہ اب جب کہ یونیورسٹی سے چلے گئے تو یونیورسٹی کے حکام کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی جگہ کسی ایسے انسان کا تقرر کرے جو ان علوم کا ماہر ہو ، جن کی تعلیم کے لیے اوریئنٹل کالج وجود میں آیا ہے -

اچھے انسان کی طرح اچھے معلمین بھی پاکستان کی ایک اہم ضرورت ھیں - جو ملک اچھے معلمین سے محروم ہو ، یا جہاں اچھے معلمین کو نظر انداز کیا جاتا ہو ، وھاں تعلیم ، بالخصوص اعلیٰ تعلیم کا مستقبل تابناک نہیں ہوتا ، اس لیے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے جانشین کی حیثیت سے کسی ایسے معلم کا تقرر کریں جو سیاست دان اور کاروباری انسان نہ ہو -

اداریہ مشرق ۱۵ فروری ۱۹۶۵ع

ڈاکٹر سید عبداللہ کی خدمات

اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر سید عبداللہ نے اکتیس برس تک ادارے کی خدمت کرنے کے بعد قبل از وقت ریٹائرمنٹ حاصل کر لی ہے - پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے ان کی درخواست پر انھیں ملازمت کی باقی ماندہ مدت کے لیے رخصت دینے کا فیصلہ کر دیا ہے -

ڈاکٹر موصوف کی یونیورسٹی سے وابستگی کا زمانہ چالیس سال کے لگ بھگ ہے - اس دوران میں انھوں نے تحقیقی کام کے علاوہ عربی فارسی اور اردو کی ایم - اے کی کلاسوں کو پڑھایا اور طلبا کے تحقیقی کاموں کی نگرانی کی - اس پوری مدت کے دوران انھوں نے کوئی رخصت نہیں لی جو اس امر کی شاہد ہے کہ ان میں کام سے لگن اور نونہالان قوم کی تعلیم و تربیت کا جذبہ کس قدر ہے - ڈاکٹر سید عبداللہ ممتاز اساتذہ کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن میں ڈاکٹر لائٹنر، ڈاکٹر وولنر، مولانا محمد حسین آزاد، سر آرنلڈ، پروفیسر سوریہ کانت، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، پروفیسر محمود شیرانی، محمد شفیع، سر عبدالقادر اور ڈاکٹر برکت علی قریشی کے نام آتے ہیں - یہی وہ اساتذہ ہیں جنھوں نے اورینٹل کالج کی ساکھ کو موجودہ بلندیوں تک پہنچایا اور اسے عالمی شہرت دی - ڈاکٹر صاحب نے ملک میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں - انھوں نے اردو اکیڈمی قائم کی جو اردو میں سائنس کے مطالعہ کو مقبول بنانے کے لیے ٹھوس کام کر رہی ہے اور اکیڈمی کے زیر اہتمام قائم ہونے والا اردو کالج سائنس ڈگری کے طلبا کو اردو میں امتحان دینے کی تیاری کراتا ہے -

ہم ڈاکٹر موصوف کی ان خدمات کے معترف ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کو انھیں عمر دراز عطا فرمائے اور انھوں نے ملک میں اردو کی ترویج و اشاعت کے جس مشن کو شروع کر رکھا ہے وہ پورا ہو سکے -

اداریہ کوہستان ۱۵ فروری ۱۹۶۵ع

ایک گزارش

اردو ادب کے محسن عظیم اور معلم کریم ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب اورینٹل کالج لاہور کی سربراہی سے فارغ ہو رہے ہیں ۔ جناب سید عبداللہ کی منصبی فرائض سے سبکدوشی میں ہمارے لیے غم اور مسرت کے دونوں پہلو موجود ہیں ۔ غم اس امر کا کہ مشرقی زبانوں کا واحد منظم ادارہ اور ملک کی عظیم دانش گاہ آن کی علمی صلاحیتوں سے اور طلبہ ایک شفیق اور ہمدرد استاد کی رہبری سے محروم ہو گئے ۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ کی علمی اور تحقیقی عظمت مسلم ہے ۔ لیکن اس سے بڑھ کر آن کی شخصیت کا وہ پہلو ہے جس میں شفقت ، جاں سوزی اور ہمدردی کی دلکش لہریں موجود ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب صرف استاد ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے مربی اور محسن بھی ہیں ۔ آن کی تنقیدی عظمت کا نقش ہر دل پر ثبت ہے ۔ انھوں نے ولی سے اقبال تک کے عظیم شعرا پر عالمانہ بحث کی ہے ۔ نا خدائے سخن میر کا ذکر انھوں نے مخصوص اسلوب سے فرمایا ہے ۔ اردو ادب کے نازک موضوعات پر بحث و نظر کا حق ادا کیا ہے ۔ سید علیہ‌الرحمۃ کے رفقا کے علمی اور ادبی مقامات کو واضح کیا ہے ۔ ہندوؤں کی اردو اور فارسی کے سلسلہ میں خدمات کی تفصیل عطا فرمائی ہے اور ان موضوعات کے علاوہ بے شمار ممتاز دانشور آن کے حلقہ سخن میں زیر تربیت رہے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کو منصبی ذمہ داریوں سے فراغت حاصل ہو چکی ہے یہ امر بے حد مسرت انگیز ہے کہ اب وہ تنقید کی طرف التفات فرمائیں گے ۔ آج سے قبل آن کی تنقید کا خصوصی مرکز تعلیم رہی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ ان کی تنقید پر آن کی استادانہ شخصیت حاوی رہی ہے ۔ میر، غالب، مصحفی اور آتش وغیرہ پر آن کے رشحات قلم کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ، لیکن آن کا غالب پہلو ان اساتذہ کے

معانی و بیان کی گہرائیوں تک رہنمائی تھا - اب ہمیں توقع ہے وہ تنقید کو مزید وسعتیں عطا فرمائیں گے - آن کی تنقید تدریسی حدود سے باہر نکل کر رفعتوں کے نئے افق قائم کرے گی -

اس خبر میں مسرت کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ مولوی عبدالحق اور مولانا صلاح‌الدین احمد کے رخت سفر باندھنے کے بعد اردو کو ایک سرپرست مربی کی شدید ضرورت لاحق ہے - ہمیں دل کی خلوتوں سے یہ شہادت زبان پر لاتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ یہ خلاء محض سید عبداللہ کی بے غرض اور مسلسل خدمات سے ہی پر ہو سکتا ہے - یوں بھی آن کی اردو نوازی کسی تعارف کی محتاج نہیں (ط - ہ)

ڈاکٹر سید عبداللہ اور شعر حسرت

علم اور حلم کا چولی دامن کا ساتھ چلا آ رہا ہے۔ صحیح عالم عجز و انکسار کی تصویر ہوتا ہے، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کا شمار مغتنمات زمانہ شخصیتوں میں ہے جن کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا خدمت علم کے سوا کچھ نہیں ہوتا اگر ایسا نہ ہوتا تو جب سے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی اورینٹنل کالج سے علیحدگی کی خبر وحشت اثر پھیلی ہے یوں افسردگی کا اظہار نہ کیا جاتا۔

اس سلسلہ کی آخری تقریب اورینٹنل کالج کے سٹاف روم میں منعقد ہوئی جس میں کبھی ڈاکٹر وولنر اور ڈاکٹر محمد شفیع جیسے جید علمائے عصر اپنے شخصی فیضان سے تاریکیوں میں روشنیوں کی کرنیں بکھیرا کرتے تھے۔

اس موقع پر آقا بیدار بخت نے سید صاحب کی زندگی کے ان ایام کا ذکر بھی کیا جب ''جوانی چناں که افتد دانی'' کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ آقا صاحب نے انکشاف کیا کہ سید صاحب اس دور میں مولانا حسرت موہانی کی غزلیں۔۔۔

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں
شب کو اختر شماریاں نہ گئیں

بڑے ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح آپ نے مولانا ابوالخیر کی آواز اور اس کی لے کا بھی ذکر کیا۔ یہ مجلسیں آقا صاحب کے قول کے مطابق کشمیری بازار کے کوچہ کوٹھی داراں میں خواجہ نور الٰہی صاحب مرحوم کے گھر منعقد ہوا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں آقا صاحب کی جرأت آزمائی، دوست نوازی اور معرکہ آرائی کے بڑے دلچسپ قصے بیان کیے۔ ان دونوں بزرگوں کی باتیں سن کر میر کا شعر یاد آ گیا۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے علوم شرقیہ کے لیے اپنی طویل جد و جہد کا ذکر کرتے ہوئے باہمی اتحاد کی کئی مثالیں سنائیں جن میں یہ بات بہت دلچسپ تھی کہ وہ کس طرح صوبائی گورنر اور وائس چانسلر کو خط لکھتے وقت خود ہی اپنے دوستوں کے دستخط کر دیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں جس پُرخلوص اور صاف دلی کے ساتھ ان کے دوستوں نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا ــــــ یہ سعید ساعتیں بہت کم خوش نصیبوں کے حصہ میں آیا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اوریئنٹل کالج کو چھوڑ رہے ہیں لیکن اردو کے لیے ان کی جد و جہد کا اصل آغاز اب ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا دھیما مزاج اور کمزور جسم جو فولادی عزائم کی آماج گاہ ہے اردو کے درخشاں مستقبل کا آئینہ دار ہے۔

شریف فاروق - نوائے وقت ۴ مارچ ۱۹۶۵ع

کتابوں پر تبصرے

نیاز فتحپوری

ولی سے اقبال تک

یہ ڈاکٹر سید عبداللہ (پروفیسر اورینٹل کالج لاہور) کے بارہ انتقادی مقالات کا مجموعہ ہے جسے مکتبۂ جدید لاہور نے بہت اہتمام سے شائع کیا ہے۔[1]

اس مجموعہ میں ولی سے لے کر عہد اقبال تک کے اکثر مشہور شعراء کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے اور فاضل نقاد نے ان تمام شاعروں کے کلام کا وسیع مطالعہ کر کے اپنی آزادانہ رائے قائم کرنے میں بڑی سعی بلیغ کی ہے - پہلا مضمون ولی دکنی یا گجراتی پر ہے جسے اُردو شاعری کا ابوالابا کہا جاتا ہے - ولی پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ، لیکن ڈاکٹر صاحب نے بالکل نئے زاویہ سے اس کا مطالعہ کیا ہے اور ان کا یہ خیال کہ ولی کا خاص فن محض ایک خاص قسم کی طربیہ حسن پرستی تھی ، بالکل درست ہے - وہ یقیناً محبت کے باب میں میر کے ضد واقع ہوئے تھے - انھوں نے حسن کا مطالعہ زیادہ تر آنکھوں سے کیا اور میر نے دل سے - میر اعتراف حسن آہ سے کرتے تھے اور ولی واہ سے - اسی لیے ولی کے یہاں سوز و درد کم لیکن رنگینی و نغمہ آفرینی زیادہ پائی جاتی ہے -

دوسرے مضمون میں اُردو مثنوی کے دکنی دور کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس سلسلے میں فاضل نقاد نے دکن کی تمام مثنویوں کو سامنے رکھ کر ان کی موضوعی تقسیم کی ہے اور سراج کی مثنوی بوستان خیال

۱- یہ تبصرہ ولی سے اقبال تک کے پہلے ایڈیشن پر تھا اب مکتبہ خیابان ادب لاہور نے جو تیسرا ایڈیشن ٹائپ میں شائع کیا ہے اس میں سید صاحب نے چھ تازہ مضامین کا اضافہ کیا ہے - [م - م]

کو بہترین عشقیہ مثنوی قرار دیا ہے۔

تیسرے مضمون کا عنوان ہے ''کلام میر میں فکر و نظر کا عنصر''۔ میر کی غم آگیں و غم آفریں شاعری کے سلسلے میں بہت کم اس پر غور کیا گیا تھا کہ ان کے متشائم نقطۂ نظر کا مرکزی تصور کیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس پہلو کو لے کر بتایا ہے کہ میر کا مطالعۂ کائنات کس انداز کا تھا اور ان کے تأثرات اس باب میں کس حد تک وجدانی اور کس حد تک مفکرانہ تھے۔ میر کے باب میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل الم نصیبی اور الم آفرینی کے فرق و امتیاز سے تعلق رکھتا ہے، جس میں فطری رجحانات اور اکتسابی میلانات سبھی کچھ شامل ہوتا ہے اور فاضل نقاد کا ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اس نتیجہ تک پہونچنا بالکل درست ہے کہ ''میر کی فکر و نظر کے انداز گویا جنون و شعور کے ملے جلے انعکاسات ہیں۔''

تیسرا مضمون میر اثر کی مثنوی ''خواب و خیال'' پر ہے جس میں اس کی ٹکنیک اور نفسیاتی تجزیہ کو سراہا گیا ہے۔ اس کے بعد مثنوی ''گلزار نسیم'' پر اظہار کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد کہ ''یہ داستان لکھ کر صرف اپنے پرتکلف طرز بیان کا کمال دکھایا گیا ہے'' اپنی جگہ بالکل صحیح ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ مثنویت سے قطع نظر اس کے ''پرتکلف طرز بیان'' کی بے تکلفی بھی اپنی جگہ ایک خاص لطف رکھتی ہے اور اگر اس کے ساتھ اس کے ایجاز کو بھی سامنے رکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ صنف مثنوی نگاری میں گلزار نسیم کی حیثیت اگر تختۂ گل کی سی نہیں تو ایک ''دستۂ گل'' کی سی یقیناً ہے۔

چھٹا مضمون خواجہ آتش پر ہے۔ بہت زمانہ ہوا جب آتش کے متعلق میں نے ظاہر کیا تھا کہ اس کو صوفی کہنا یا اس کے کلام کو متصوفانہ کہنا غلط ہے اور اس پر بعض حضرات بد مزہ بھی ہوئے تھے۔ اس لیے مجھے بڑا اطمینان ہوا یہ دیکھ کر کہ اس باب میں ڈاکٹر صاحب بھی میرے ہم خیال ہیں۔ محض چند مفروضات و اصطلاحات تصوف کے استعمال کا نام صوفیانہ شاعری نہیں، بلکہ اس کا تعلق محض وجدان سے ہے، جو آتش میں یقیناً مفقود تھا۔ آتش

ایک رند مشرب ، آزاد طبیعت ، قلندرانہ فطرت رکھنے والا انسان تھا اور اس کی یہی خصوصیات اس کی شاعری کی جان ہیں ، جن کو ڈاکٹر صاحب نے کافی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

اس کے بعد ساتواں مضمون مصحفی کی شاعری پر ہے ۔ مصحفی کے ساتھ مصنف آب حیات نے جو بے انصافی کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اہل فکر بھی اسی رو میں بہہ گئے اور مصحفی کو وہ حق نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس حق تلفی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ مصحفی نہ صرف یہ کہ وہ بڑا متنوع الخیال شاعر تھا بلکہ عہد آفریں شاعر بھی تھا ، جس نے غزل کو نیا اسلوب ، نئی وسعت اور رنگینی عطا کی ۔ نگار کے مصحفی نمبر میں ، میں نے بھی یہی لکھا تھا اور مجھے بڑی خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ ڈاکٹر صاحب بھی اس باب میں میرے ہم نوا ہیں ۔

آٹھواں مضمون ناسخ پر ہے اور اس سلسلہ میں کتنی معقول بات کہی ہے ڈاکٹر صاحب نے کہ : ''ناسخ ساری عمر زبان کو سنوارتے رہے اور شاعری کو بگاڑتے رہے ۔'' یہ مختصر سا فقرہ ایک بڑی وسیع تنقید اپنے اندر رکھتا ہے ۔ ایک جگہ اور وہ یہ لکھتے ہیں کہ :

> ''ناسخ کا المیہ یہ نہیں کہ وہ زبان کی تہذیب و تنقیح میں منہمک رہ کر محض علمی مشغلہ کے آدمی بن کر رہ گئے ، بلکہ ان کا حادثہ وہ سیاسی زندگی بھی ہے جس میں ان کے کردار کو خلوص ضمیر کی قربانی دینی پڑی اور وہ شاعری سے زیادہ شاطری کرتے رہے ۔
>
> جہاں تک ان کی فطری قابلیتوں کا تعلق ہے ، اگر زمانہ مختلف ہوتا تو وہ لکھنؤ کے دوسرے سودا بن سکتے تھے ، مگر لکھنؤ کی معاشرت میں دہلی کا احساساتی پیوند لگنا قدرے مشکل تھا ــــ وہ ناسخ تھے اور ناسخ ہی رہے ۔ اور یوں رفتہ رفتہ منسوخ ہو کر رہ گئے ۔''

حقیقت یہ ہے کہ شاعروں میں تو نہیں لیکن ''متشاعروں'' میں وہ بڑا ''متشاعر'' انسان تھا ۔

اس کے بعد دو مضمون غالب پر نظر آتے ہیں ، ایک غالب کی غزل پر جو بہت مختصر ہے لیکن نہایت پر مغز۔ دوسرا مضمون جس میں غالب کے ''حاسۂ انتقاد'' پر روشنی ڈالی ہے ، نئی چیز ہے۔ غالب کے اس ادبی پہلو کو اکثر حضرات نے نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ مضمون غالب کی خودی کی داستان ہے جو لطف و افادہ دونوں پر مشتمل ہے۔

گیارھواں مضمون داغ کے ''شہر آشوب دھلی'' سے متعلق ہے اور خوب ہے۔

آخری مضمون اقبال کے سیاسی تفکر سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال کے سیاسی افکار میں باھمدگر تضاد پایا جاتا ہے اور اگر ان سب کو سامنے رکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اقبال کا واقعی پیغام کیا تھا اور وہ خود بھی کسی بات پر مطمئن تھے یا نہیں۔ ان کے یہاں ملوکیت ، مذہبی آمریت ، جمہوریت ، اشتراکیت ، قومیت و وطنیت سبھی نظریوں کا ذکر ملتا ہے ، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں جستجوئے راہ کی سی تھیں تعین منزل کی نہ تھیں۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی اسی ذھنیت پر اظہار خیال کیا ہے اور کافی حق و صداقت کے ساتھ۔

ڈاکٹر صاحب اس عہد کے بہترین نقادوں میں سے ھیں اور اس لحاظ سے کہ دوسرے نقادوں کی طرح وہ مغربی انداز فکر و گفتگو سے کام نہیں لیتے ، وہ اپنے عہد کے منفرد صاحب فکر نقاد ھیں۔

مولانا صلاح الدین احمد

"شعرائے اردو کے تذکرے اور فن تنقید نگاری"[1]

ہماری یونیورسٹی کی تعلیم میں اردو زبان و ادب کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے جو مقام حال ہی میں عطا ہوا ہے۔ اس کا تقاضا تھا کہ ہمارا سنجیدہ ادب بالخصوص اس کا تنقیدی حصہ بڑی سرعت سے فروغ پائے اور ہمارے مصنفین اور ناشرین اپنی متحدہ کوششوں سے ایک قلیل عرصے میں کم از کم اتنا مواد ضرور فراہم کر دیں۔ جو ہمارے طلباء کی بنیادی ضروریات کا کفیل ہو سکے۔ افسوس ہے کہ اس تقاضے کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا گیا اور گزشتہ تین برس کے عرصے میں کوئی قابل ذکر کوشش اس بارے میں نہیں کی گئی۔ ایسے حالات میں اگر کوئی اچھی کتاب اتفاق سے چھپ جائے جو بیک وقت طلباء کے لیے بھی مفید ہو اور عام شائقین کے ذوق علمی کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچائے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی تصنیف "شعرائے اردو کے تذکرے اور فن تنقید نگاری" اسی نوع کی ایک کتاب ہے جو حال ہی میں بڑی خوبصورتی سے ٹائپ کے حروف میں شائع ہوئی ہے۔

تالیف زیر نظر کی سب سے بڑی خوبی اس کی ترتیب و تقسیم ہے۔ فاضل مصنف نے اپنے موضوع کو بڑے سلیقے سے واضح طبقات میں تقسیم کیا ہے اور ہر طبقے کے نمایاں رجحانات اور خصوصیات کو بڑی خوبی سے بیان کرنے کے بعد آخر میں فن تنقید نگاری کے نام سے تذکرہ نویسی اور سیرت نگاری کے مختلف نظریات کا ایک متوازن جائزہ لیا ہے۔

۱۔ کتاب کا اصل نام "شعرائے اردو کے تذکرے اور فن تذکرہ نگاری ہے۔" [م - م]

جس سے کتابت کی افادیت بدرجۂ غایت بڑھ گئی ہے ۔ اس جائزے کے اختتام پر سید صاحب نے یہ نہایت درست نتیجہ نکالا ہے کہ میں ان اصحاب سے متفق نہیں ہوں جو محض اس لیے کہ قدیم تذکروں کے معیار اور اقدار ان کے ذاتی معیار اور اقدار سے مختلف ہیں ، قدیم تذکروں کو سراپا عیب سمجھتے ہیں ۔ ہمیں ہر قدیم ادبی کارنامے کے متعلق رائے قائم کرتے وقت پرانے زمانے کے معایب اور اقدار کا لحاظ رکھنا پڑے گا ۔ بقول مولانا عبدالحق ہمارے شعراء کے تذکرے گو جدید اصول کے مطابق نہ لکھے گئے ہوں ، تاہم ضمنی طور پر ان میں بہت سی کام کی باتیں مل جاتی ہیں جو ایک محقق اور ادیب کی نظروں میں جواہر ریزوں سے کم نہیں ۔ ان سے شاعروں کے ضروری ضروری حالات اور ان کا ماحول ہمارے مشاهدے میں آ جاتا ہے ۔ مولانا کے اس ارشاد کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان تذکروں کے مطالعے سے ان ایام کی معاشرت اور زندگی کے نقشے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں ۔ ان سے ان لوگوں کا معیار اخلاق و معاشرت ہمیں معلوم ہو جاتا ہے ۔ ان تذکروں ہی میں ادبی و علمی حلقوں کے مشاغل اور تفریحوں کا حال ، ان کی رقابتیں اور کش مکش ، وضع داریاں اور اور پاس داریاں ، باہمی سلوک و مراعات اور ان کے رد و قبول اور پسند و ناپسند کے معیار ، غرض سارے نظام معاشرت کا روشن تصور آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے ۔ بلاشبہ یہ تذکرے ہماری ادبی تاریخ کا قیمتی سرمایہ اور ہماری قدیم معاشرت اور تہذیب کی بڑی قابل قدر یادگاریں ہیں ۔ ان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ کتاب کے متن میں جن تذکروں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے ان میں میر تقی میر کا تذکرۂ نکات الشعراء بہت نمایاں ہے ۔ مصنف کا خیال ہے کہ میر کا تذکرہ نہ صرف بجائے خود اپنے شرف اولیت کے باعث ممتاز ہے بلکہ وہ تذکرہ نگاری کے ایک پورے دبستان کی بنیاد رکھتا ہے اور اس دبستان میں میر کے مقلد اور معترض دونوں شامل ہیں ، چنانچہ گردیزی ، جو میر کا سب سے بڑا حریف اور معترض ہے ، خود اس کا تذکرۂ ریختہ گویاں عمومی طور پر انہی صفات سے متصف ہے جو نکات الشعراء سے خاص ہیں اور جنہیں میر کی اولیت اور فوقیت نے رواج دیا ۔ واقعات میں اختصار اور اصلاح سخن ان تذکروں کی مشترک کیفیت

ہے اور اگرچہ انداز نظر میں کہیں کہیں اختلاف ہے لیکن اسلوب نگارش کم و بیش یکساں ہے ۔

طبقۂ ثانی کے تذکروں میں سوانحیت کا رنگ غالب ہے ۔ ان میں منتخب شعراء کے حالات قدرے تفصیل سے ملتے ہیں اور واقعات کی تاریخیں بھی متعین کی گئی ہیں ۔ اس طبقے کے ممتاز تذکروں میں گلزار ابراہیم ، گلشن ہند اورگارساں دتاسی ، کریم الدین اور امام بخش صہبائی کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔ تذکرۂ آب حیات سے تذکرہ نویسی میں ادبی تاریخ کا دور کہہ سکتے ہیں ۔ سید صاحب نے آب حیات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور ازروئے انصاف ان بعض اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے جو ایک ادبی رواج کے طور پر اس زندۂ جاوید تالیف پر کیے جاتے ہیں ۔ آب حیات کے بعد شائع ہونے والے تذکروں کا موجودہ تالیف میں جائزہ نہیں لیا گیا ۔ صرف خم خانۂ جاوید کے متعلق بعض اشارے کیے گئے ہیں ۔ بحیثیت مجموعی تذکروں کا یہ تذکرہ ایک نہایت مفید اور دلچسپ تالیف ہے اور اس قابل ہے کہ ہر صاحب ذوق کے کتب خانے کی زینت بنے ۔ اس کتاب کی قیمت دو روپے ہے اور مکتبۂ جدید لاہور نے اسے شائع کیا ہے ۔

کتابوں کی باتیں ، ریڈیو پاکستان لاہور ، ۲۴ ستمبر ۵۲ ع

اعجاز حسین

نقد میر

ڈاکٹر سید عبداللہ کی تصنیف "نقد میر" آئینہ ادب چوک انار کلی لاہور نے چھاپی ہے[1] - قریباً چار سو صفحے کی اس کتاب کی قیمت ساڑھے چھ روپے ہے - سر ورق چغتائی کا بنا ہوا ہے -

ڈاکٹر سید عبداللہ ادبیات شرقیہ کے استاد ہیں - اُردو ادبیات سے انھیں گہری دلچسپی ہے - ان کا انداز تنقید محققانہ اور انداز تحریر عالمانہ ہوتا ہے - مگر اس کتاب کا موضوع چونکہ میر اور کلام میر ہے اور اس سے ڈاکٹر سید عبداللہ کو جذباتی لگاؤ ہے - اس لیے اُن کے عالمانہ انداز تحریر میں جذبات کی چاشنی کا رچاؤ بھی آ گیا ہے -

ایک اعتبار سے ہمارا عصر میر کی تجدید اور میر کے کلام کو از سر نو پرکھنے اور اُردو شاعری میں اس کا نیا مقام متعین کرنے کا دور ہے - آج کل کے اُردو شاعروں کے ہاں جو میر کا رنگ جھلکنے لگا ہے یہ محض حادثہ یا نقالی کی کوشش نہیں ہے، یہ لمبی بحروں کے استعمال اور میر کی سی اداس ردیفوں کا اثر ہے - میر سے اس وابستگی کی جڑیں گہری ہیں - فراق گورکھپوری نے کہا تھا "میر ہندوستان کی اداس روح کا اُداس شاعر ہے -" بہت ممکن ہے کہ اس دور کی اُداسی اور میر کے عہد کی دلسوزی میں کوئی ایسی قدر مشترک ہو جس نے میر کو عہد حاضر کے قریب تر کر دیا ہے - اس خیال کی طرف اشارے اور اس یگانگت کا سراغ تو زیر نظر کتاب میں بھی جا بجا مل جاتا ہے -

---

۱ - اب نقد میر کا دوسرا ایڈیشن اردو مرکز لاہور نے اضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے - (م - م)

''نقد میر'' اپنے موضوعات کے لحاظ سے دلچسپ بھی ہے اور متنوع بھی ۔ یہ کتاب تیرہ مقالات کا مجموعہ ہے ۔ اس کے تنوع کا اندازہ کرنے میں چند مقالات کے عنوانات مدد دے سکتے ہیں مثلاً ''میر کا رنگ طبیعت'' ''کلام میر میں فکری عنصر'' ''میر کے قبول عام کی بنیادیں'' ''تقلید میر یا شارع عام'' ''میر کا ایک نقاد — محمد حسین آزاد'' اور آخر میں ''میں اور میر'' ۔ اس طرح اس مجموعے کے تیرہ مضامین میر کی شخصیت اور شاعری کے الگ الگ شعبوں کو منور کرتے ہیں ۔ بیشتر مضامین میر کے کلام ، اس کی شاعری ، اس کے گداز اور اس کے لہجے سے متعلق ہیں ۔ کچھ اس تنقید کے بارے میں ہیں جو میر کو اپنے ہمعصروں اور بعد میں کرنے والے نقادوں سے حاصل ہوئی ، اور کچھ عہد حاضر سے میر کے رشتے کی تفصیلات کو سمجھنے اور نمایاں کرنے کا بیان ہیں ۔ لیکن اس کمی کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ اس کتاب میں میر کی زندگی اور حالات کا ذکر کم ہے ۔ ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ ادب کے جس طالب علم کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ بہر حال میر کی زندگی اور اس کی تلخیوں سے شناسا ہے ۔ لیکن شعر میر کے اس دل گداز بیان کے ساتھ ساتھ اگر شاعر کی زندگی اور اس کے حالات کی طرف بھر پور اشارے ہوتے تو بے محل نہ ہوتا ۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کلاسیکی انداز کے نقاد ہیں اور چونکہ اہل مدرسہ میں سے ہیں اس لیے ان کی تنقید کی علمی حیثیت ، محققانہ انداز اور ناقدانہ قوت مسلم ہے ۔ لیکن اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے یہ تنقید میر کی محبت میں ڈوب کر لکھی ہے اور میر کی تمام شاعری کو محض عالمانہ طور پر نہیں بلکہ جذباتی طور پر بھی جذب کرکے قلم اٹھایا ہے اور کمال یہ ہے کہ اس وابستگی کے باوجود نہ کہیں پاس داری سے کام لیتے ہیں نہ غلو کرتے ہیں ، نہ میر کے مخالفوں سے اُلجھتے ہیں ، نہ میر کے مدعی بن کر دوسروں کا درجہ کم کرتے ہیں ۔ وہ تو بس میر کے ''فقیرانہ آئے صدا کر چلے'' والے انداز میں آہستگی اور متانت سے بات کرتے چلے آتے ہیں ۔ ''میں اور میر'' اس مجموعے کا دلچسپ مضمون ہے ۔ اس میں میر کے ساتھ اپنی ذہنی اور جذباتی وابستگی کے بیان میں وہ لکھتے ہیں :

''انسانی روابط اور تعلقات میں بھی میر کی شاعری سے میں نے بہت

سے فائدے حاصل کیے - میر کی شاعری نے مجھے تعلقات میں حوصلہ مند اور متحمل بنایا ھے - مجھے میر نے مسکرانے کا فن سکھایا ھے - یہ مسکراہٹ الم کے سرچشموں سے ابھرتی ھے مگر اس میں طنز اور احتجاج نہیں ، خوئے تسلیم کے رنگ ھیں - آھستگی ، برداشت ، تحمل ، مظالم اور جور و جفا کے باوجود ایک ایسا توازن رکھنا جس میں نفرت و انتقام کا شائبہ تک بھی پیدا نہ ھو - یہ راستہ مجھے میر نے دکھایا ھے اور واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں تحریر و تنقید کا یہی رنگ نمایاں ھے - ایک طرف تو اس تصنیف سے میر کے غم کی آفاقیت ، ان کے لہجے کی دردمندی، اُن کے مزاج کی نامرادی اور بے بسی واضح ھوتی ہے - دوسری طرف میر کے بارے میں بعض مروجہ غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا ازالہ ھوتا ہے - مثلاً میر کی بد مزاجی، کم آمیزی، تنک مزاجی اور خود نگری کو آج تک جس غیر ھمدردانہ طریقے سے دیکھا اور پرکھا گیا ھے اس سے میر کی روح تک پہنچنے ، اور اس کے حزن کو سمجھنے کے راستے میں دیواریں حائل ھوتی رھی ھیں - شعر تو بظاھر مجموعۂ الفاظ کے سوا کچھ نہیں لیکن الفاظ کے اُن پر پیچ راستوں سے گزر کر اگر کسی شاعر کی روح تک رسائی درکار ھو تو اس سے ھمدردی بلکہ شیفتگی شرع اول ھے - اس کے بغیر انسان صوت و معانی کی پرچھائیوں تک تو پہنچ سکتا ھے لیکن اس کار گاہ تک رسائی حاصل نہیں کرتا جہاں الفاظ تحلیل ھو کر معنی کا روپ دھار لیتے ھیں - اس سلسلے میں ”میر کا ایک نقاد ـــــ محمد حسین آزاد“ ایک اھم مقالہ ھے - مولانا آزاد نے ”آب حیات“ میں میر کا تذکرہ جس انداز میں کیا اس نے میر کی تنک مزاجی اور خود پرستی کی ایسی چھاپ لگائی کہ آنے والے تمام نقاد اس سے متأثر ھوتے چلے آئے - مولانا آزاد خود اُن بیانات سے شدید طور پر متأثر ھوئے جو میر کے ھمعصروں نے اپنی ذاتی کدورت کی وجہ سے لکھے تھے - میر کی بد مزاجی اور خود نگری درست ھی ھوگی لیکن سوال اس کی بری بھلی عادتوں کے مطعون کرنے کا نہیں سوال تو یہ ھے کہ اس تنک مزاجی اور خود نگری کے پیچھے جو حزن اور زندگی سے روٹھے رھنے کی جو

کیفیت تھی وہ میر کے اشعار میں کس طرح صورت گر ہوئی - یہ مقالہ نقاد کے اس تعصب پر بڑی محبت سے گرفت کرتا ہے جو ایک دفعہ دل میں بال آ جانے سے نقاد کے لفظوں سے بھی نمایاں ہونے لگتا ہے -

اس تصنیف میں میریات کے گہرے مطالعے کے علاوہ جو باتیں اور جو تذکرے موضوع کے حاشیے کا کام دے رہے ہیں ، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں - محمد شاہی دور میں سلطنت کا انحطاط اور شعر و فن کی نئی نہج الگ دلچسپی کی چیزیں اور بعض بیانات تو اجتہاد کا درجہ رکھتے ہیں - مثلاً یہی بیان دیکھیے ''ـــــــہماری شاعری پرانے معاشرے میں صدیوں سے ایک اجتماعی تفریح کی صناعت سمجھی جاتی رہی ہے - حالانکہ فنون اور تمام فنون میں شاید سب سے زیادہ شاعری کا فن بنیادی طور پر محض تنہائی کی ریاضت ہے . . . شاعری کو ناٹک یا [اگر زیادہ سلیقے سے بات کی جائے تو] اجتماعی ورزش بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عموماً یہ سمجھ لیا گیا کہ شاعری میں کوئی شخص دوسرے کی نقالی کرکے بڑا شاعر بن سکتا ہے -'' اردو شاعری میں انفرادیت کے موضوع پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے :

''ہمارے یہاں انفرادیت کی اکثر صورتیں لہجہ و بیان کے امتیاز تک محدود ہیں اور احساساتی ریاضتوں سے تربیت یافتہ انفرادیت جو مضامین اور تجربات میں متشکل ہو کر سامنے آتی ہے کم ہے اور جہاں بھی ہے بڑی طویل اور مہیب یک رنگی اور خوفناک یکسانی کے بعد جلوہ گر ہوئی ہےـــــــ''

غنیمت ہے کہ یہ بیان ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے بزرگ نقاد کے قلم سے نکلا ورنہ اگر یہی بات جدید شاعروں یا نئے نقادوں میں سے کوئی لکھتا تو لوگ جدیدیت کا شوق فراواں کہہ کر ٹال دیتے - شاعری، فن اور تنقید پر اور اسی طرح کے بیشمار بیان ہیں جوبر سبیل تذکرہ اس کتاب میں در آئے ہیں اور اپنی جگہ قابل توجہ اور دلچسپ ہیں - البتہ میر کی حسن سماعت اور اس کے فن نقاشی کے بارے میں جو نتیجے ڈاکٹر صاحب موصوف نے نکالے ہیں ان سے کلی اتفاق مشکل ہے بعض اشعار میر کی توجیہہ انہوں نے یوں کی ہے کہ میر کی حسن سماعت الجھی ہوئی تھی - اور بعض اشعار کی صورت گری اور ان کے الفاظ اور

تصاویر سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میر فن مصوری کی باریکیوں سے کما حقہ واقف تھے ۔ ان تشریحات اور نتائج سے اختلاف کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن واقعہ ہے کہ یہ سب میر تک پہنچنے اور اس کے کلام کو بہتر طور پر سمجھنے اور اس کے قریب تر ہونے کی کوشش مسعود ہے، اور اس اعتبار سے ڈاکٹر عبداللہ کی ''نقد میر'' ہمارے جدید تنقیدی ادب میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھے گی اور میر جی کو سمجھنے اور سمجھانے کے بہت سے چراغ اسی سے جلیں گے ۔

تبصرہ از ریڈیو پاکستان لاہور ، ۲۷ اگست ۱۹۵۸ع

ابن انشا

نقد میر

میر کی بزرگی اور استادی کا اعتراف تو اردو شاعری کے بڑے سے بڑے لندھور بن سعداں کو ہے - کسی کو میر کا انداز پانے کی حسرت رہی - کوئی معتقد میر ہونے پر نازاں ہے - کوئی مقلد میر کہلانے پر فخر محسوس کرتا ہے - کوئی ان کے بہتر نشتر کا قتیل ہے لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں کہ جیسا کچھ میر صاحب کی روح اور مزاج کو اس زمانے میں سمجھا گیا ہے ایسا پہلے کسی دور میں نہیں ہوا - حقیقت یہ ہے کہ اسے سمجھانے میں جس دل سوزی سے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے کوشش کی ہے یہ بھی ان ہی کا حصہ ہے - وہ خود ذہنی اور وجدانی طور پر دبستان میر سے تعلق رکھتے ہیں اور معروفیت کا دعوئ فضول درمیان میں نہیں لاتے - پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میر پر محض عقلی اور سماجی تنقید بے مزہ رہتی ہے میر کی تہہ بہ تہہ شخصیت کو جاننے پہچاننے کے لیے ایک جذباتی تہذیب اور درد مندی ضروری ہے -

یہ کہنا محض بیکار ہے کہ میر صاحب آہ تھے یا مرزا صاحب واہ تھے - یا ”سودا دریایست بے کراں و میر نہریست عظیم‌الشان“ پھر قواعد و زبان میں برتری کا ذکر کرنا تو ھجو ملیح ہے - یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میر کے سمجھنے کی ابتدا ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے دیباچہ کلام میر اور انتخاب کلام میر سے ہوتی ہے - اس کے بعد جعفر علی خاں اثر ، فراق گورکھپوری وغیرہ نے میر کے جوہر کو نمایاں کیا - حال کے زمانے میں محمد حسن عسکری صاحب نے میر کی آفاقی اپیل کی طرف توجہ دلائی اور بھی بہت سے مضامین اور کتابیں میر پر نکلی ہیں لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ کو جو خصوصیت خاصہ اس

میں حاصل ہے کسی اور کو نہیں ۔ اس وقت میر پر ان کے طویل اور تفصیلی مقالات کا ایک مجلد نقد میر کے نام سے میرے سامنے ہے جسے آئینہ ادب لاہور[1] نے شائع کیا ہے قیمت ساڑھے چھ روپے ہے کل مقالات تیرہ ہیں اور ان کے عنوانات سے ان کی نوعیت کا اندازہ ہو جائے گا ۔ پہلا مضمون ہے میر کا انداز ، دوسرا میر کا رنگ طبیعت ، پھر کلام میر میں فکری عنصر ، میر اور نیرنگ نظر ، میر تقی میر اور نقاش کا فن ، میر کے قبول عام کی بنیادیں ، تقلید میر یا شارع عام ، غالب معتقد میر ، میر و غالب کی ہم طرح غزلیں ، میر کی مثنوی نگاری ، میر کے ادھورے گیت ، میر کا ایک نقاد اور آخری مضمون ہے میں اور میر ۔ یہ سب مضامین گزشتہ چھ سات برس میں مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں ۔ اس مختصر جائزے میں یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے نظریات کا خلاصہ پیش کیا جائے یا ان پر محاکمہ کیا جائے مجموعے کا آخری مضمون ''میں اور میر'' فی الاصل پیش لفظ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ میر کی تفہیم کے لیے موصوف کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑا اور کس طرح حافظ ، اقبال اور غالب کے ساتھ وہ تھوڑی دور چل کر رہ گئے اس کی داستان پرلطف ہے ۔ اور اس سے ان کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ، ان کا کہنا ہے کہ میر کا مطالعہ فکر و احساس کی پختگی کا طالب ہے ، کوئی ناتجربہ کار عیش کوش نوجوان اس کا صحیح قاری نہیں ہو سکتا ۔ اس کا صحیح مخاطب حکیمانہ مزاج کا پختہ کار آدمی ہی ہو سکتا ہے ۔ جس طرح ارزاں جذبات پرستی کا زمانہ مطالعہ میر کے لیے سازگار نہیں اسی طرح خشک عقلیت کا دور بھی میر سے مانوس نہیں ۔

میر کی زندگی میں دو خاص قسم کی نفسی لہریں نمایاں ہیں ۔ ایک ، مجذوب نیم دیوانے سودائی اور جنونی کی باتوں کے انداز میں منعکس ہوتی ہے ۔ دوسری لہر ایک سیلانی جنگل جنگل پھرنے والے درماندہ مسافر کی ہے اس کا پس منظر ان کی طبیعت کے علاوہ ان کے گھر اور زمانے کے حالات ہیں ۔ ان کے والد اور چچا عشق کے بغیر زندگی کو

---

۱ ۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ اردو مرکز نے شائع کیا ہے ۔ [م-م]

• بال خیال کرتے تھے اور آشوب زمانہ استغنا کا سبق دیتا ہے حالت یہ ہے کہ :

چور اچکے سکھ مرہٹے شاہ و گدا سب خواہاں ہیں
چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر بھی اک دولت ہے یہاں

یہ استغنا انہیں ہمت عطا کرتی ہے -

آب حیات وہی نا جس پر خضر و سکندر مرتے تھے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ ، یہ بھی ہماری ہمت ہے

ڈاکٹر عبداللہ نے میر کی درد مندی کے سرچشمے اور ان کے کلام کی تاثیر کے بھید تلاش کرنے میں بڑی کاوش کی ہے - ان کے مزاج اور ان کی طبیعت کو وہ بھگتی تحریک کے گیتوں اور دوھوں سے بھی متاثر قرار دیتے ھیں - ان کے لہجے کا تجزیہ مشکل امر تھا لیکن ڈاکٹر صاحب بڑی خوبی سے اس سے عہدہ برا ہوئے ہیں - چونکہ میر ہماری روح عصر سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہیں لہٰذا ان کے کلام کے ساتھ ساتھ ان کے اس تعارف کا مطالعہ بھی ضروری اور سود مند ہوگا -

---

نئی کتابوں پر تبصرہ از ابن انشا - ریڈیو پاکستان کراچی ۵ ستمبر ۱۹۵۸ ع

عابد علی عابد

مباحث

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے اپنی عمر عزیز بیش تر بلکہ یوں کہنا چاہیے کلیۃً تحقیق و تدقیق ، راهنمائی و رهبری بالعموم علمی و ادبی خدمت اور بالخصوص آردو کے فروغ کی کوشش میں گزاری ہے ۔ اللہ نے ان کی تحریروں کو حسن قبول بھی عطا کیا ہے اور اپنے خلوص احساس اور ذهنی دیانت کے باعث انھوں نے جو کام بھی کیا ہے (چاہے اس کی بیل منڈھے چڑھنی کتنی ہی مشکل کیوں نہ نظر آتی ہو) پورا کر ھی کے چھوڑا ہے ۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں ادبی تحقیق ، تنقید و تدقیق کے دل نشین اسلوب اختیار کیے گئے ھیں ۔ آردو تذکروں کے متعلق ان کی ایک مختصر سی کتاب ہے لیکن اتنی محنت سے لکھی گئی ہے کہ اس فن پر کام کرنے والا اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ۔

سید صاحب نے تصانیف تو شاید زیادہ تر شائع کروا دیں ، (اگرچہ میرا خیال ہے کہ ان کے پاس اب بھی کئی چیزوں کے مسودات موجود اور محفوظ ہوں گے جن کی اشاعت کی باری نہیں آئی)۔

بہت مسرت کا مقام ہے کہ تاج صاحب کی ترغیب پر کہ ان کے علمی کارنامے ایک جگہ جمع ہو جانے چاہئیں ، انھوں نے اپنے مختلف مضامین مدون کرنے کا وعدہ کیا ۔ یہ وعدہ ''مباحث'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے ۔ اس کا ذیلی عنوان ہے ''تحقیقی اور تنقیدی مضامین''

اس تالیف میں چار قسم کے مضامین مندرج ھیں:

۱ ۔ لسانی اور تحقیقی ۔ ۲ ۔ اصولی بحثیں ۔ ۳ ۔ تنقیدی تجربے ۔
۴ ۔ اصناف ۔

پہلے حصے میں ''تخلص'' اور ''شہر آشوب'' پر بہت گراں مایہ

مضامین شامل ہیں - ''اصولی بحثیں'' کے عنوان کے تحت ''ادب یا دکھوں کی تجارت'' بہت خیال افروز مضمون ہے - ''تنقیدی تجربے'' کے عنوان کے تحت غالب پر دو مضمون مختصر لیکن معرکے کے شامل ہیں اصناف کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے اس بات سے خوب سیر حاصل بحث کی ہے کہ ''کیا غزل نیم وحشی صنف ادب ہے -'' مندرجہ ذیل اقتباس ''مرزا غالب کا حاسۂ انتقاد'' سے لیا گیا ہے - .....

خطبہ استقبال

میں مجلس علوم اسلامیہ گورنمنٹ کالج لائل پور کے گیارھویں سالانہ اجلاس میں آپ کی شرکت پر سب حضرات کو صدق دل سے خوش آمدید کہتا ہوں اور شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہماری عزت افزائی فرمائی ۔ میں عالی جناب استاذ الاساتذہ جناب سید صاحب کا بطور خاص ممنون ہوں کہ انھوں نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشا ۔ اپنی گوناگوں علمی مصروفیات میں سے ہمارے لیے وقت نکالا اور بمع اپنے رفیق کار اس جلسے کو مشرف فرمایا ، ہم اس عنایت کے لیے ان کے بے حد مشکور ہیں اور اسے ان کا خاص کرم سمجھتے ہیں ۔

حضرات ! ہمارے مہمان خصوصی جناب سید صاحب ایک عظیم محقق ، بلند پایہ نقاد ، شفیق استاد اور دردمند مسلمان ہیں جنھوں نے اپنی گراں مایہ زندگی کے بیش بہا چالیس برس مشرقی علوم اور اسلامی اقدار کی آبیاری میں گزار دیے ہیں ۔ آپ کی شخصیت کا تعارف تو اس مجلس کے سرپرست اعلیٰ جناب سید کرامت حسین صاحب کرا چکے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ذات ، جو ایک ادارہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے ، کا تعارف اور آپ کی علمی ، ادبی اور ملی خدمات کا جائزہ اس مختصر وقت میں پیش ہی نہیں کیا جا سکتا ۔

عمرھا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

آپ کی شخصیت کیا ہے آپ ہی کی زبان سے سنیے ۔ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں :

”میری آرزوؤں کی دنیا بہت محدود ہے ۔ ان آرزوؤں میں ایک یہ ہے کہ خدا مجھے ایسا قلم عطا کرے جو زیادہ نہیں تو دس فقرے ہی ایسے لکھ جائے جو دلوں کا رشتہ رب العالمین سے جوڑ

سکیں ۔ میری دوسری آرزو یہ ہے کہ تہذیب اسلامی کی جمالی روح کے آئینۂ مصفا پر سے غلط فہمیوں کی گرد کو دور کر سکوں اور نئی زبان میں بات کہہ کر اپنے مخاطبوں کے لیے قابل فہم بن سکوں ۔ میری تیسری آرزو یہ ہے کہ میں انسانی ضمیر کو کچھ اس طرح جگاؤں کہ انسان کا دل انسان کے لیے شفقت سے بھر جائے اور انسان دکھ درد کی سطح پر پھر سے ایک ہو جائیں ۔ میری ایک آرزو یہ بھی ہے کہ میں اپنے ملک میں ایسی علمی روح پیدا کر دوں جس کی ترجمانی کا فرض اردو زبان اختیار کر سکے ۔ میں ان مقاصد کی پیش خدمت میں لگا رہتا ہوں اور مدرسی کے وقت کو چھوڑ کر (جو میرے لیے نشاط زیست کا وقت ہوتا ہے) باقی ہر لمحہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل طلبی میں گزراتا ہوں اور ایسے زمانے میں بھی جب میرا دل بھیانک خلا محسوس کرتا ہے ، اور مجھے یوں لگتا ہے گویا میری ہستی راکھ کا ڈھیر ہے ، میں مقاصد کی لگن سے اس راکھ کو آتش خاموش کی مانند پر سوز بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں اور خوش ہوں کہ یہ راکھ ابھی بالکل مردہ نہیں ہوئی ۔

یہ ہیں ہمارے مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ

پروفیسر افتخار احمد چشتی صدر علوم اسلامیہ گورنمنٹ کالج لائل پور نے ۲۷ مارچ ۶۶ء کو مجلس علوم اسلامیہ کے گیارھویں سالانہ اجلاس میں پڑھا

خطبۂ استقبال

صدر محترم اور معزز خواتین و حضرات !

آج کے اجلاس کے مہمان خصوصی محترم ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ہیں ۔

محترمی سید صاحب !

میں اس کالج کے شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی طرف سے، شعبۂ اردو اور حلقۂ ادب کی طرف سے آپ کا ممتاز صاحب کا اور تمام حاضرین کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں ۔ میرا یہ نہایت خوش گوار فرض ہے کہ میں آج کے اس اجلاس میں آپ کی تشریف آوری پر آپ کا شکریہ ادا کروں ۔

ایسے موقعوں پر عام طور سے کچھ پر تکلف الفاظ اور تعریفی کلمات میں مہمان خصوصی کی صفات کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسی صورت بھی ہو جاتی ہے کہ مہمان خصوصی کی صفات تعریفی کلمات کے احاطے سے باہر ہوتی ہیں، آج ہم ایسی ہی صورت سے دو چار ہیں ۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ آپ کی ذات جن صفات کی حامل ہے ان کی تعریف کے لیے انتہائی زوردار کلمات بھی نا کافی ہیں ۔ آپ کی بے لوث خدمات ، دردمندی اور لگن جو ادب ، ثقافت ، اسلامی شعور اور سب سے بڑھ کر انسانیت کی ترویج و ترقی میں صرف ہوئی ہیں ان سے کوئی با ہوش شخص آنکھیں بند نہیں کر سکتا ۔ ۱۸۵۷ع کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃالثانیہ اور ادب ثقافت کی تشکیل جدید میں جو کام سرسید نے شروع کیا تھا ۱۹۴۷ع میں کچھ اس سے ملتا جلتا کام آپ نے سنبھالا ۔ جس تن دہی اور بے غرضی کے ساتھ آپ ان اعلیٰ مقاصد کی تکمیل میں منہمک رہے ان کا اعتراف نہ کرنا ایک قومی بد دیانتی ہوگی ۔ آپ کو قریب سے دیکھنے والے ہی نہیں ، دور کا تعلق رکھنے والے بھی آپ کی ان صلہ و ستائش سے بے نیاز خدمات کا

پورا شعور رکھتے ہیں وہ آپ کی ادبی اور ثقافتی تصانیف سے اسی طرح بہرہ مند ہیں جس طرح وہ خوش نصیب حضرات جنھیں آپ سے بالمشافہ اور براہ راست استفادہ کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں اردو کے محسنوں کی فہرست میں آپ کی خدمات بلا شبہ ہر اختلاف و اعتراض سے بالاتر ہیں۔ پاکستان کی تخلیق کے محرکات میں مذہب کے بعد اردو زبان سب سے بڑا محرک تھی۔ چنانچہ اردو کو قومی اور ملکی زندگی میں اس کے شایان شان مقام دلانے میں جو کام آپ کی کوششوں سے انجام پایا اس کی اہمیت سے بے نیاز ہونا دراصل اپنے ملی شعور و وجود سے بے نیازی کے مترادف ہوگا۔ آپ نے مارچ ۱۹۴۸ء میں آل پاکستان اردو کانفرنس کے انعقاد میں جو عملی کردار ادا کیا اس کے نتیجے میں آج اردو کو وہ مقام مل رہا ہے جس کی وہ مستحق تھی۔ نظام تعلیم میں اردو کو فوری طور پر داخل کیا گیا۔ سکولوں اور کالجوں میں اردو کو ایک مضمون کی حیثیت دی گئی اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کو انٹرمیڈیٹ کلاسز تک لازمی قرار دے کر ایک اہم قومی ضرورت کو پورا کیا گیا ہے۔ آج اردو کو ایم۔ اے اور ایم۔ ایس سی کی تعلیم کے لیے ذریعۂ اظہار بنانے کے نیک ارادے بالواسطہ اور براہ راست آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہیں۔

اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔ اے اردو کلاسز کا اجرا جن مشکل حالات میں ہوا اور جس طرح آپ کے خلوص نے مشکلات پر قابو پا کر اردو کی تدریس کو ایک مرتبہ اور مقام بخشا اس کی زندہ شہادتیں اس وقت مغربی پاکستان کے بہت سے کالجوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کے شعبوں کی شکل میں موجود ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اردو کی ایم۔اے کلاسز کے اجرا کے وقت اورینٹل کالج لاہور میں اساتذہ کی کمی کو آپ نے اپنی تن تنہا کوششوں سے محسوس نہ ہونے دیا۔ ہم لوگ ذرا سی مشکل سے گھبرا جاتے ہیں لیکن آپ نے تن تنہا جتنے اہم تعلیمی و تدریسی فرائض انجام دیے وہ کسی طرح معجزہ سے کم نہیں۔ آپ بہ یک وقت درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور تحقیق و تنقید کا کام اس طرح انجام دیتے رہے جیسے آپ کی ذات میں ایک پورا ادارہ کام کر رہا ہو۔

ان صبر آزما مراحل کے ساتھ ساتھ ملک میں السنہ شرقیہ کی ترویج کی عملی کوشش، مخالف حالات کا مقابلہ اور ان مضامین کو ایک باعزت مقام دلانا آپ ہی کا کام تھا - اوریئنٹل کالج لاہور جن ریشہ دوانیوں کا شکار رہا اور جس طرح اس کا وجود مستقل خطروں میں گھرا رہا اس سے ہم میں سے بہت سے واقف ہیں - لیکن یہ حقیقت ہے کہ خداوند کریم کے فضل کے بعد آپ کی ہمت، استقلال اور قومی درد نے اس ملکی اور قومی نشان کو مٹنے سے بچا لیا - اس خلوص اور قومی درد کا اجر تو آپ کو اللہ ہی دے سکتا ہے ہمارا کام یہی ہے کہ ہم آپ کی ان ملی اور قومی خدمات کا احساس کریں اور آپ کے شکر گزار ہوں -

میں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ علوم شرقیہ اور السنہ شرقیہ سے متعلق طبقہ (جن میں اساتذہ اور طلبہ بھی شامل ہیں) ایک طرح کے احساس کمتری کا شکار رہا ہے یہ احساس کمتری ہماری صدیوں کی غلامی کا نتیجہ تھا - مغربی مادہ پرستی کی یلغار نے ہمارے ذہنوں کو معکوس کر دیا تھا - ذہنیت کی یہ منفی تبدیلی قومی کردار کو جس طرح متأثر کرتی ہے اس سے کون واقف نہیں ! آپ نے اس کا علاج علوم شرقیہ اور اسلامی اقدار کی اہمیت کو واضح کرکے کیا - مجھے آپ کے مضامین اور خطبات میں ہمیشہ اس مشرق شعور اور روحانی بصیرت کا پرتو نظر آیا جس نے اسلامیان عالم کو اقوام عالم میں ایک ممتاز مقام عطا فرمایا تھا - اس وقت ہمارا ملی شعور جو اسلام اور مشرق کی ثقافت سے بہرہ مند ہے اس کے لیے ہم اپنے تمام بزرگوں کی مساعی کے ساتھ آپ کے بھی ممنون ہیں کیوں کہ ان اقدار کی ترویج میں آپ کا بہت بڑا حصہ ہے -

اردو کی جو خدمت آپ نے اپنے ذمہ لی ہے اور جس طرح اپنی تمام عمر گیسوئے اردو کی مشاطگی میں لگائے رکھی ہے اس کے لیے ملک کا اردو دان اور با شعور طبقہ آپ کا احسان مند ہے - ہم سب کو آپ کی مثال سے سبق لینا چاہیے کہ انسان اس دنیا کے مکروہات میں اپنے آپ کو گم نہ کر دے بلکہ اپنی ذات کو اس قدر ہمہ جہتی بنائے کہ مخالف حالات دم توڑ دیں اور انسان کامیاب و کامگار نکلے -

پاکستان میں اردو کے اساتذہ کی بہت بڑی تعداد آپ کی ساختہ و

پرداختہ ہے اور یہاں جو شمع اردو آپ نے فروزاں کی ہے اس سے ہزاروں چراغ روشن ہوتے جا رہے ہیں - پروانوں کی بھی کمی نہیں - اردو کا مستقبل روشن ہے پھر بھی ہمیں ہر قدم آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے - ہم میں سے ہر شخص کو اس روشنی کے مینار سے ہدایت حاصل کرنا ہے جس نے ہماری ثقافتی اور ادبی سمت کا تعین کیا ہے -

آج کل کی دنیا بڑی مصروف اور منہمک دنیا ہے ، وقت کی کمی اور کام کی زیادتی کی شکایت عام ہے - ہم لوگ کوئی ٹھوس کام نہ کر سکنے کا عذر وقت کی کمی کے سر ڈال دینے کے عادی ہو گئے ہیں - ہمیں چاہیے کہ ہم آپ کی مصروفیت اور آپ کے علمی و ادبی کارناموں کی عملی روح سے سبق حاصل کریں کہ کس طرح ایک فرد واحد بہ یک وقت اپنے فرائض منصبی کی ادائگی کے ساتھ ساتھ دوسری اہم ذمہ داریوں اور ثقافتی سرگرمیوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے - ہم سب کو چاہیے کہ آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تعلیم کو آزادی ، شرافت اور اسلامیات کے عناصر سے آراستہ کریں - تعلیم کی ترویج میں کسی سہل انگاری اور تامل سے کام نہ لیں - نہ اس میں وقت کی کمی کا عذر لنگ شامل ہو اور نہ مخالف حالات کا - اردو کا حق ادا کرنا ہمارا فرض ہے ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اردو کی ترویج اور مشرق اقدار کے احیا میں ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے - خدائے بزرگ و برتر ہمیں عزم و استقلال عطا فرمائے (آمین) -

آج مجلس علوم اسلامی کے سالانہ اجلاس میں آپ نے ادیب کے لیے جو راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے وہ یقیناً ہمارے ادب اور ہماری اجتماعی شخصیت کی تشکیل میں معاون ثابت ہو سکتا ہے -

اس وقت ہمارے ادیب کے سامنے بہت سے مسائل ہیں - ان مسائل کے ہجوم میں ہمارا ادب اپنا توازن کھوتا ہوا نظر آ رہا ہے - بعض خاص نظریات اس طرح اپنائے جا رہے ہیں کہ ادب اپنے محور اور مقصد سے ہٹتا ہوا محسوس ہو رہا ہے - آج ہماری تنقید اور ہماری ادبی تخلیقات مخصوص مکاتیب فکر میں جکڑ کر کچھ ایسی صورت اختیار کر گئی ہیں کہ ہمارے بہت سے نو آموزوں کے لیے بھٹک جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے - ایک طرف الجھے ہوئے مسائل در آئے ہیں جن کا بسا اوقات خود اس ادب کے خالق کو واضح تصور نہیں ہوتا تو دوسری طرف

زبان و بیان میں وہ ماورائیت پیدا ہو گئی ہے جس سے ابلاغ کی راہیں بند ہو گئی ہیں ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ادب ایک خاص طبقے کے لیے پیدا کرنا چاہیے یا اس کا فیض عام ہونا چاہیے ۔ پھر کیا ایسا ادب پیدا کرنا ممکن ہے جو عام قاری کے لیے مفید اور دلچسپ ہوتے ہوئے بھی ادب کے اعلیٰ معیار پر پورا اترے ۔ ہم ادب کو کسی خاص طبقے کی میراث نہیں بنانا چاہتے لیکن کیا اس سے مفر ممکن ہے ؟

محترمی سید صاحب ! میں توقع کرتا ہوں کہ آپ ہمارے اور ہمارے طلبہ کے لیے اس مسئلہ کے حل کی طرف اشارہ فرمائیں گے ۔

محترمی سید صاحب ! آج یہاں آپ کی موجودگی ہم سب کے لیے باعث فخر ہے ۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی طرف سے اور شعبۂ اردو کی طرف سے محترم سید کرامت حسین صاحب جعفری (پرنسپل) برادرم افتخار احمد چشتی (صدر شعبۂ اسلامیات) اور جناب عصمت اللہ خاں (نگران حلقۂ ادب) کی مساعی اور تعاون کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جن کی کوشش سے ہمیں آپ کی تشریف آوری کی سعادت حاصل ہوئی ۔

میں اس خوش گوار موقعہ پر تمام معزز حاضرین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

محترمی سید صاحب ! میں ایک دفعہ پھر آپ کا اور ممتاز صاحب کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں ۔

---

۱ ۔ پروفیسر تقی الدین انجم صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لائل پور نے ۲۷ مارچ ۶۶ء کو حلقۂ ادب کی خصوصی نشست میں پڑھا ۔

یوم تجدید عزم

۵ اپریل ۶۶ء

[ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی ساٹھویں سالگرہ کے موقعہ پر پڑھے گئے مقالات ، پیغامات ، اور منظومات اور اس تقریب کی روداد وغیرہ]

استاذی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی ساٹھویں سالگرہ سے متعلق پیغامات

۱ - جناب مولانا غلام رسول مہر صاحب کا پیغام :

بے انتہا مسرت ہوئی کہ آپ نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی ادبی و قومی خدمات کے سلسلے میں ایک خاص تقریب کا انتظام فرمایا - میں دلی اخلاص سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں - یقیناً ادبی و قومی دائرے میں موصوف کی خدمات کا دامن بہت وسیع ہے ان کے نمایاں اور روشن کارناموں کے متعلق کچھ عرض کرنا تو تحصیل حاصل ہوگا لیکن انھوں نے ایک نہایت اہم کارنامہ اس زمانے میں بھی انجام دیا تھا جب نہ وہ ڈاکٹر تھے نہ پروفیسر اور نہ پرنسپل - یہ عاجز اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا -

ترک موالات کے طوفان میں مد کے بعد جزر رو نما ہوا تو ملت اسلامیہ کے لیے مستقل قومی پالیسی کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا - آپ جانتے ہیں کہ کسی ہنگامہ خیز تحریک میں افسردگی پیدا ہونے کے بعد دلوں اور دماغوں کو کسی صحیح تعمیری منہاج پر لگانا سہل نہیں ہوتا - اس نازک وقت میں جو اصحاب بروئے کار آئے اور مسلسل و متواتر صحیح اصول کا راستہ ہموار کرنے میں زیادہ سے زیادہ سعی و جہد کرتے رہے ان میں سے ایک سید عبداللہ بھی تھے - بلکہ مجھے یہ کہنے میں قطعاً تامل نہیں کہ ان کا درجہ اکثر سے ارفع و اعلیٰ تھا - اس زمانے میں انھوں نے ''زبیر ہزاروی'' کے فرضی نام سے بے شمار مقالے لکھے اور جذبات سے بالکل الگ رہ کر مسلمانوں کو فکر و بصیرت کی دعوت دی - یہ مقالے اتنے متوازن تھے کہ جن اصحاب کو ان سے اختلاف تھا وہ بھی جواب میں کوئی جچی تلی اور پائدار و استوار بات نہ کہہ سکے - کاش کوئی صاحب ڈاکٹر سید عبداللہ کی

خدمات جلیلہ کے اس حصے کو بھی بہ طریق احسن نمایاں کر سکیں۔ ضروری ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے لیے ایسی تقریبات ہر سال پوری گرم جوشی سے منائی جائیں ۔ میں یہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے لیے نہیں کہہ رہا بلکہ پر خلوص خدمت گزاری کے فروغ و تقویت کا ذریعہ یہی ہے ۔

---

۲ ۔ جناب اختر حسین صاحب صدر انجمن ترقیٔ اردو پاکستان ، کراچی کا پیغام :

مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی ساٹھویں سالگرہ پر ایک تقریب منعقد کی جا رہی ہے ۔ جس میں موصوف کی علمی اور ادبی خدمات پر مقالے پڑھے جائیں گے ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ہمارے ملک کے ممتاز اہل علم میں سے ہیں ۔ ان کی علمی ، ادبی اور تعلیمی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا انہوں نے زندگی بھر علمی خدمت کی ہے ۔ ان کی تصانیف ہمارے ادب میں تنقید و تحقیق کا بلند معیار پیش کرتی ہیں ۔ میری دعا ہے کہ وہ آئندہ بھی پوری مستعدی سے ادب کی خدمت کرتے رہیں ۔

---

۳ ۔ جناب امتیاز علی عرشی صاحب (رامپور ، انڈیا) کا پیغام :

مجھے یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہوئی کہ صدیق مکرم جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی ادبی ، تعلیمی اور لسانی خدمات کے اعتراف کے لیے مجلس ارادت مندان سید ایک تقریب منعقد کر رہی ہے ۔

سید صاحب کا شمار بجا طور پر ہمارے اہم محققوں اور نقادوں میں ہوتا ہے ۔ ان کی تیس پینتیس سالہ کاوشیں ہمارا قابل قدر سرمایہ ہیں جن سے نہ صرف موجودہ نسل بلکہ آئندہ نسلیں بھی استفادہ کرتی رہیں گی ۔

سید صاحب نے اپنے کام کا آغاز تحقیق سے کیا تھا اس کے بعد وہ تنقید کے میدان میں گامزن ہوئے مگر جو امتیاز انہوں نے تحقیق کا

ھفتخواں طے کرنے میں پیدا کیا تھا ، اسے تنقید کے میدان میں بھی برقرار رکھا ۔ دعا ھے کہ خدائے بزرگ و برتر آن کی عمر میں برکت عطا فرمائے تا کہ عرصے تک ان کے علم و فضل کی روشنی رھروان راہ ادب کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی رھے ۔

---

۴ ۔ جناب میاں حیات بخش صاحب صدر انجمن فیض الاسلام راولپنڈی کا پیغام :

سید صاحب کی طویل خدمات تعمیر ملت کے سلسلہ میں بے مثال اور بے لوث ھیں اور ان سب میں خدا سے تعلق نمایاں طور پر نظر آتا ھے ۔ آپ کی یہ ھمیشہ سعی رھی ھے کہ مسلمان طلباء میں اسلامی کیریکٹر پیدا ھو کیونکہ اسلام کے علاوہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا کوئی راستہ نہیں ۔ یہ سید صاحب ھی کا کام تھا کہ انھوں نے عوام و خواص اور حکومت پر یہ واضح کیا اور کرایا کہ عیسائیوں کے مشنری سکولوں اور پبلک سکولوں کی موجودگی نے تعلیمی مساوات کے اصولوں کو قریباً ختم کر دیا ھے جس کے نتیجے میں عام درسگاھوں میں پرائمری سے لے کر اعلیٰ درجوں تک کی تعلیمی حالت ناگفتہ بہ ھے ۔ انھوں نے ھمیں اور حکومت کو بتایا کہ ان اداروں کی پشت پناھی کر کے ھم ایک ایسے ذھن کو فروغ دے رھے ھیں اور ایسے کلچر کو لا رھے ھیں جس کا پاکستانی مزاج سے دور کا بھی تعلق نہیں ۔ ان اداروں کو سپیشل گرانٹ اور خاص مراعات سے نوازا جاتا ھے ۔ اس کے برعکس عام ادارے جائز ضروریات کے لیے محتاج اور محروم التفات ھیں ۔

سید صاحب نے ھمیشہ سے ھی اپنے تلامذہ میں پاکستانی اقدار زندگی اور اسلامی فکر و عمل پیدا کرنے کی کوشش کی اور بفضلہ تعالیٰ اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی بھی ھوئی ۔

سید صاحب نے اسلام کی سر بلندی اور صحیح پاکستان کی تعمیر کے لیے جو خدمات انجام دی ھیں وہ ناقابل فراموش ھیں :

---

۵ - جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کا پیغام :

مجھے یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہوئی کہ ۵ اپریل کو جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر ''مجلس ارادت مندان سید'' یوم تجدید عزم منا رہی ہے۔

سید صاحب موصوف نے جس گہرے اور بے لوث جذبے کے ساتھ اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے جد و جہد کی ہے اور اس سن و سال میں بھی کر رہے ہیں وہ تمام محبان اردو کے لیے ایک مثال ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سید صاحب کی صحت و عمر میں برکت عطا فرمائے تاکہ ان کی خدمات سے قوم عرصہ تک مستفید ہوتی رہے اور ان کے ذریعہ وہ دل بھی اردو کی طرف مائل ہو جائیں جو فی‌الحال اپنی کوتاہ اندیشی یا احساس کمتری کے باعث اردو کی ترقی میں مزاحم ہو رہے ہیں۔

---

۶ - جناب ایم اسلم صاحب کا پیغام :

جناب محترم ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے متعلق کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ موصوف نے لٹریچر کے میدان میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے یہ اللہ کی دین اور ان کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اردو کے ایک عظیم ادیب بھی ہیں نکتہ داں نقاد بھی ہیں اور بہت سی گرامی قدر ادبی، تنقیدی اور تاریخی کتب کے نامور مصنف بھی ہیں۔ ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' ڈاکٹر صاحب کی ایک معرکۃالآرا تصنیف مانی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے قدرت نے انہیں صرف علم و ادب کی خدمت کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔ ادب کے معماروں میں ان کا نام ہمیشہ سر فہرست نظر آئے گا اور ان کے ادبی کارنامے اردو ادب کے زریں ابواب متصور ہوں گے۔ ایک طرف ڈاکٹر صاحب علم و فضل کا ایک بحر بیکراں ہیں تو دوسری طرف وہ ایک بڑے بامروت دوست، بڑے خلیق استاد، ایک مخلص انسان اور اس دور کے اردو زبان کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اصل زندگی

بھی یہی ہے کہ ع

زمانے میں رہنا تو مشہور رہنا

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ دن بھی دکھائے جب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے قدردان ان کی صد سالہ سالگرہ بھی منائیں ۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

---

۷ ۔ جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی کا پیغام :

محترم ڈاکٹر عبداللہ صاحب نے علم و ادب سے متعلق بہت ٹھوس کام کیا ہے اور کئی بلند پایہ کتابیں شائع کی ہیں ۔ ان کے وہ تحقیقی مقالات جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اردو) میں شامل ہیں بہت گراں قدر ہیں اور انہیں ایک مدت تک زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں ۔ آن کو فراموش کر دینا بڑی نا انصافی ہوگی اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انہیں فراموش بھی نہیں کر سکتا ۔

پاکستان میں اردو کے جن اساتذہ نے علمی اور ادبی کام کیا ہے ان میں ڈاکٹر صاحب موصوف ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ پاک ان کو قائم و دائم رکھے اور ان کے فیوض سے ایک عالم کو بہرہ مند فرمائے ۔ آمین!

---

۸ ۔ جناب مالک رام (دہلی ۔ انڈیا) کا پیغام :

جب تک کسی قوم میں زندگی کی اعلیٰ اقدار کا احساس اور اعتراف موجود ہے ، وہ قوم زندہ ہے ۔ ان اقدار کے سب سے بڑے محافظ، ادیب اور معلم ہوا کرتے ہیں ۔ اس کی وجہ ظاہر ہے ۔ انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں اخلاق اور تہذیب و تمدن کا معیار ان کے سامنے ہوتا ہے ، وہ جانتے ہیں کہ کسی خاص دور میں سماج پر زوال آیا تو کیوں ؟ اور پھر جب از سر نو اس میں ترقی ہوئی تو کیوں اور کیسے ؟ مختلف ممالک کے حالات کے متواتر مطالعے سے انہیں خود اپنے

ماحول سے متعلق غور و فکر کی عادت سی ہو جاتی ہے - معلم یا ادیب
جب اس علم اور اپنے غور و فکر کے نتائج کو دوسروں تک پہنچاتا ہے
تو وہ گویا غیر شعوری طور پر زمانے کے اور آئندہ نسل کے اخلاقی
معیار کو بلند سے بلند تر کر رہا ہے - پس صحیح معنوں میں ادیب
اور مدرس ہی کسی ملک اور قوم کے اخلاق اور اقدار اعلیٰ کے
نگہبان اور محافظ کہلانے کے مستحق ہیں -

یہ حسن اتفاق ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ ادیب بھی ہیں اور
معلم بھی - ان کی ساری عمر تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں
گزری ہے - وہ ملک کی پچھلی دو نسلوں کے استاد رہے ہیں - انہوں
نے جو شمع ہدایت ان جوانوں کے ہاتھ میں دی تھی آج وہ اپنے اپنے
دائرۂ عمل میں اس سے دوسروں کی راہ روشن کر رہے ہیں - اس طرح
خدا نے چاہا تو روشنی پھیلتی جائے گی اور گرد و پیش کا اندھیرا
سمٹتا جائے گا -

یہ بات میرے لیے باعث اطمینان و مسرت ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ
کی ساٹھویں سالگرہ پر آن کے ارادت مند اور قدر دان اور احباب آن کی
خدمات کا اعتراف کرنے کو جمع ہو رہے ہیں - دیکھا جائے تو
در حقیقت یہ ثبوت ہے قوم کی اپنی زندگی کا اور زندگی کی اعلیٰ اقدار
میں اپنے یقین کا ، موصوف تو بہرحال اس اعزاز کے مستحق ہی ہیں
لیکن اگر آج ہم اس کا برملا اعلان کر رہے ہیں تو ہماری حیثیت
'مادح خرشید' سے زیادہ کی نہیں - ہم اس طرح سے گویا خود اپنی مدح
کا سامان مہیا کر رہے ہیں کہ ہماری آنکھیں صحت مند اور روشن
ہیں - میری دلی دعا ہے کہ خدائے کریم ڈاکٹر صاحب قبلہ کو
صحت و عافیت کی لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ وہ اپنی مفید اور نافع اللناس
سرگرمیوں کو بدستور جاری رکھ سکیں ، آمین!

---

۹ - جناب میجر آفتاب حسن صاحب صدر شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ
کراچی یونیورسٹی کا پیغام :

میں ڈاکٹر صاحب کے ارادت مندوں میں سے ہوں اور ان کے دم

کو اردو کی زندگی کے لیے غنیمت جانتا ہوں - اردو نے جب بھی ترقی کی تو اپنے خدمت گزاروں اور عقیدت مندوں کی کوششوں کے سبب ہی کی اس زبان کو سرکاری سرپرستی کبھی بھی حاصل نہیں رہی - سرکاری سرپرستی ہوتی تو کیا ہوتا اس مسئلے کا تصفیہ تو محققین ہی کر سکتے ہیں - لیکن اردو کی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ اجتماعی کوششوں سے زیادہ انفرادی کوششوں نے اس کو پروان چڑھایا اور ڈاکٹر عبداللہ صاحب ان چند منفرد ہستیوں میں سے ہیں جن پر اردو زبان ناز کر سکتی ہے -

حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں ادیب اور شاعر سے زیادہ ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے جد و جہد کرتے رہیں - ان کا مرتبہ میرے نزدیک شعرا اور تمام ادبا اور اُن سے بلند ہے جو اردو کی خدمت تحریری طور پر کرتے ہیں - ظاہر ہے کہ اگر زبان ہی نہیں رہی تو شعرا اور ادبا کتنے دنوں رہیں گے اُن کی کاوشیں بھی اگر ابھی نہیں تو کچھ عرصہ بعد ختم ہو جائیں گی -

میں دعا کرتا ہوں کہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی ایسی سالگرہیں بار بار آئیں اور ہم اُن کی کوششوں میں اضافے اور کامیابیوں کو دیکھتے چلے جائیں -

---

۱۰ - پروفیسر سید احتشام حسین صاحب صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی (انڈیا) کا پیغام :

سب سے پہلے تو ''ارادت مندان سید'' کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اردو کے ایک قدیم خدمت گزار، ایک پختہ کار معلم اور ایک عظیم المرتبت ادیب کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر ایک ادبی جشن منانے کا اہتمام کیا ہے جسے ڈاکٹر سید عبداللہ کے کارناموں اور حوصلۂ خدمت کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر ''یوم تجدید عزم'' کہا گیا ہے - اگر وہاں ہوتا تو یقیناً میں بھی کسی نہ کسی حیثیت سے اس مجلس سے وابستہ ہوتا اور اس طرح ڈاکٹر عبداللہ صاحب سے اپنی ارادت مندی کا اظہار کر کے فخر محسوس کرتا - بہرحال دوری کے

باوجود مجھے اس میں شریک سمجھیے ۔ میں نے جب سے اپنی ادبی زندگی شروع کی ہے سید موصوف کی تحریروں سے استفادہ کر رہا ہوں ۔ اظہار عقیدت و ارادت کی محرک اس سے بڑھکر اور کیا چیز ہوسکتی ہے ۔ ڈاکٹر عبداللہ کی سب سے اہم خصوصیت مجھے یہ معلوم ہوئی کہ انھوں نے کبھی اپنے ذہن کا دریچہ بند نہیں کیا اور تحقیق و تنقید دونوں میں مسلسل خوب سے خوب تر کی راہ پر گامزن رہے بلکہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے عمر کے ساتھ آن کی توانائی اور پختگی ہی نہیں بڑھ رہی ہے ، خیالوں کی تازگی اور شگفتگی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے ۔ دعا ہے کہ موصوف بہت دن تک اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے صحت مند رہیں ۔

---

۱۱ ۔ سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب شریک ناظم دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ [یو-پی انڈیا] کا پیغام :

دارالمصنفین [شبلی اکیڈمی] کے ارباب علم ڈاکٹر سید عبداللہ کی قدر نہ صرف ایک ممتاز ادیب اور اہل قلم کی حیثیت سے کرتے ہیں بلکہ ان سے قلبی لگاؤ بھی رکھتے ہیں کیونکہ انھوں نے دارالمصنفین کے بانی مولانا شبلی پر مضامین لکھ کر ان کی ادبی باریکیوں ، علمی نکتہ چینیوں اور تاریخی موشگافیوں کے بعض پہلوؤں کو کچھ اس طرح پیش کیا کہ پڑھنے والوں پر یہ اثر ہوا کہ جو باتیں مولانا شبلی سے متعلق اب تک ظاہر نہ تھیں وہ واضح ہو گئی ہیں ۔ انھوں نے مولانا شبلی کی رتبہ شناسی کر کے اپنی دیدہ وری کا بھی اظہار کیا ہے ۔ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی متاثر رہے ۔ آن کی بہت ہی اہم اور مستند تصنیف "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" ہے ۔ اس میں انھوں نے بڑی فراخدلی سے اعتراف کیا ہے کہ اس کو لکھتے وقت انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و تعلیمی ترقی کو ایک مستقل ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے ۔ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی بھی شروع ہی سے ان کی علمی اٹھان اور سلامت روی کے قائل رہے اور جب ان کا کوئی مضمون معارف میں اشاعت کے

لیے آیا تو اس کو بڑی خوشی سے شائع کیا ۔ ان کو کئی بار یہ کہتے سنا کہ پنجاب سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی صورت میں ادب و تحقیق کا ایک قابل قدر اهل نظر نمودار هو کر رهے گا ۔ یہ پیشین گوئی صحیح ثابت هوئی ۔

یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کی جب کوئی تصنیف یا مضمون پڑھنے کا موقع ملا تو یہ محسوس هوا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا هے اس سے نہ صرف ان کی غیر معمولی توجہ ، بصیرت ، محنت اور دیدہوری ظاهر هوتی هے بلکہ تحریر کا حسن سلیقہ بھی ، فاضلانہ نکتہ رسی بھی ، محققانہ جگر کاوی بھی اور دلائل بھی ، تصنیف و تالیف کا اُن کا یہ سلیقہ بالکل قدرتی هے ۔ قدرت کے اس عطیہ کا مصرف انھوں نے خاطر خواہ طریقہ سے کیا هے ۔

دعا هے کہ وہ ادبی ، علمی اور تحقیقی خدمات کے لیے ایک مدت مدید تک زندہ رهیں تاکہ اردو زبان اُن کے اهم کارناموں سے مالا مال هوتی رهے ۔ آمین ثمہ آمین!

---

۱۲ ۔ جناب میاں افضل حسین صاحب چیرمین ایگریکلچرل ریسرچ کونسل حکومت پاکستان و سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کا پیغام :

For a teacher there is no greater source of satisfaction and happiness than the knowledge that his pupils appreciate his efforts and pay him tribute for his learning. There is no test more authentic of the capabilities of a person than the testimony of those who have received their lessons from him. I offer my sincere congratulations to Dr. Syed Mohammad Abdullah that he has attained such a degree of success as has made him the focus of the admiration, affection and devotion of his pupils and fellow workers. This is indeed a great achievement.

Unfortunately I do not belong to that lucky group which sat at his feet and listened to his discourses and learnt wisdom. My association with Syed Mohammad Abdullah dates back to

October 1938, when I took charge of the responsibilities of the Vice-chancellor of the University of the Panjab. Since then I have always been greatly impressed with the enthusiam and devotion with which Dr. Syed Mohammad Abdullah furthered the cause of Oriental Languages, particularly Urdu, and made contributions in this field.

His long connection with Oriental College, as a student and teacher, has made him love the tradition of his institute. His loyalty to his *alma mater* is so intense that the will not even tolerate a suggestion that the institute should have a name expressive of its much widened activities, for which Dr. Abdullah was responsible.

I offer my congratulations to Dr. Syed Mohammad Abdullah on attaining the mature age of sixty, and I pray that he may have many many more years to continue his noble task, and render services to the cause of Oriental Learning.

———

ممتاز منگلوری

کچھ اس تقریب کے بارے میں

جناب صدر! خواتین و حضرات!

مجلس کی طرف سے مجھ پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ میں مختصر الفاظ میں آج کی تقریب کے مقصد پر روشنی ڈالوں تاکہ اس کا صحیح مفہوم سب کے علم میں آئے اور تقریب کا مقصد پورا ہو۔

اس تقریب کی غرض و غایت فقط یہ ہے کہ ایک مخلص استاد کی خدمات کا اعتراف کیا جائے جس نے گزشتہ تیس برس کے عرصے میں، تدریس کو فرض منصبی ہی خیال نہیں کیا بلکہ ایک سچے استاد کی طرح، اس کو اعلیٰ مقاصد کی تبلیغ کا ذریعہ بھی بنایا۔ عام طور سے لوگوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ بلند پایہ استاد قوم کو میسر نہیں، خوش قسمتی سے ہم میں ایک ایسا استاد موجود ہے جس کے ہوتے ہوئے کم از کم اس شکایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ استاد جس کی تعریف خود استاد محترم نے اپنے ایک مضمون میں ان الفاظ میں کی ہے:

''اچھے استاد کی ذات میں ایسی تجلیات ضرور ہوتی ہیں جن کے انعکاس سے وہ اپنے معاشرے کو پوری طرح منور کر سکتا ہے۔ ایسی ہستیوں کے پرتو سے ظلمتیں نور میں اور کدورتیں محبتوں میں بدل سکتی ہیں۔''

چنانچہ استاد بزرگ کی ذات گرامی قدر خود اس قول کا عملی نمونہ ہے اور انہیں دیکھ کر ہمیں اس قول میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ ''بااصول مدرسی جزوے پیغمبری ہے۔''

استاد محترم نے دوسری حیثیتوں میں بھی قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں مگر ان کا تعلق پوری قوم سے ہے۔ اس تقریب کے محرک اول ان کے صدہا شاگرد ہیں جو ان کی تدریس سے فیض یاب ہوئے۔ ان کے کانوں میں آج تک وہ دل نشین کلاس لیکچر گونج رہے ہیں جن میں

علم اور بذلہ سنجی کا عجیب امتزاج ہوتا تھا ـــــ استاد محترم کی شخصیت کا جادو ، انہی کلاس لیکچروں کے ذریعے سر پر چڑھ کر بولتا تھا ـــــ اور پھر آہستہ آہستہ دل میں اتر جاتا تھا ـــــ علم ، لطیفہ ، مسکراہٹ اور درد مندی کچھ اس طرح شیر و شکر ہو جاتے تھے کہ طالب علم کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا تھا کہ خود کو محو کر دے اور موتیوں سے اپنا دامن بھر لے - یہ درس وہی زمزمۂ محبت تھا جو طفل گریز پا کو ہر لمحہ گھیر کر ، کھینچ کر مکتب میں لے آتا تھا -

میں عرض کر چکا ہوں کہ اس تقریب کا خیال ، اول مرحلے پر ، ان کے شاگردوں کو آیا کیونکہ وہ اپنے عظیم استاد کے احسانات کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے مگر ادیب دوستوں اور تعلیمی حلقوں تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے شاگردوں سے بھی زیادہ گرم جوشی کا ثبوت دیا اور اس تقریب کے لیے وسیع پروگرام تجویز کیے مثلاً یہ کہا گیا کہ (۱) ایک سید عبداللہ کالج کھولا جائے (۲) - اوریئنٹل کالج کے کسی ہال کا نام ان سے منسوب کیا جائے - (۳) ان کے نام سے تمغے اور وظیفے جاری کیے جائیں - (۴) ان کے نام سے منسوب علوم مشرق کی ایک یونیورسٹی قائم کی جائے - (۵) ان کے نام سے ایک رسالے کا اجرا کیا جائے - (۶) ان کی خدمت میں علمی مضامین کا ایک مجموعہ کتابی صورت میں پیش کیا جائے - (۷) ان کی خدمات کے اعتراف کے لیے ایک تقریب منعقد کی جائے ، یہ تقریب لاہور سے باہر بھی منعقد ہو - (۸) ان کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر اخبارات اور رسائل کے خصوصی شمارے شائع کراوئے جائیں - (۹) ان کے نام سے ہر سال اچھے ادب پر انعام دیا جائے - (۱۰) ان کی خدمت میں ساٹھ ہزار روپے کی تھیلی اردو کی ترویج کے لیے پیش کی جائے - (۱۱) ان کے تعلیمی خطبات کتابی صورت میں شائع کرکے تقریب میں ان کی خدمت میں پیش کیے جائیں - (۱۲) انہیں کوئی موزوں خطاب دیا جائے - اور بعض دوستوں نے محبت کا اظہار اس تجویز کے ذریعے کیا کہ انہیں پھولوں کے ساتھ تولا جائے اور ان کی بیگم کو ایک گھڑی اور سونے کی ایک موٹی سی چوڑی بطور سوغات دی جائے کیونکہ وہ بھی اردو کے جہاد میں بلکہ زندگی کے سارے جہاد میں ان کی رفیق اور ان کے ساتھ

شریک رہی ہیں -

مجھے یہاں عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ اس تقریب کے خیال کا بڑے وسیع پیمانے پر خیر مقدم ہوا مگر اس کے بارے میں خود استاد محترم کی طرف سے سخت عدم تعاون ہوا جس سے ہماری مشکلات میں بے حد اضافہ ہوا - استاد محترم نے مذکورہ بالا سب تجویزوں کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ میں غالباً ان اعزازات میں سے کسی ایک کا بھی مستحق نہیں - اگر ہوتا تو مجھے میری قوم میرے شاگردوں سے جدا نہ کرتی - وہ سرے سے اس تقریب کے حق میں ہی نہ تھے - اور بصد مشکل یہ کہہ کر رضامند کیا گیا کہ یہ آپ کی عزت افزائی نہیں مدرسی کے منصب کی عزت افزائی ہے ، پھر بھی انہوں نے قدغن لگا دی کہ اس تقریب میں میرے متعلق کچھ نہ پڑھا جائے ، اسے تقریب کی بجائے تحریک بنایا جائے اور ان' مقاصد کی تکمیل کے لیے از سر نو عزم کیا جائے جن میں میری زندگی گزری ہے - ان کے ان ارشادات کو ماننا پڑا چنانچہ انھی وجوہ سے اسے ''یوم تجدید عزم'' کہا گیا ہے -

۵ اپریل کو یعنی آج سید صاحب کی زندگی کا ساٹھواں سال پورا ہوگیا ہے - عام طور سے ، اس عمر کے بعد لوگ گوشہ نشینی اور آرام کو ترجیح دیتے ہیں ، مگر سید صاحب کا یہ ارادہ ہے کہ منصب اور ملازمت کی زندگی کے بعد جو اب ختم ہونے کے قریب ہے ، زیادہ دل جمعی اور اطمینان سے ان سب تحریکوں کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں جو ملازمت کے زمانے میں ، پابندیوں اور مجبوریوں کی وجہ سے اچھی طرح نہ چل سکیں -

ان حالات میں سید صاحب کے ارادت مندوں نے ایک مجلس کی تشکیل کی - اس کا ایک اجلاس ۲۰ مارچ کو جناب حکیم احمد شجاع صاحب کے زیر صدارت انجمن ترقی اردو کے دفتر میں ہوا - اس مجلس نے جو پروگرام وضع کیا آج کی تقریب کم و بیش اسی کے مطابق منعقد ہو رہی ہے - آج کی تقریب میں شرکت کے لیے سید صاحب کے معتقد مغربی پاکستان کے متعدد مقامات سے آئے ہوئے ہیں - یہ مجلس ان دوستوں کو خوش آمدید کہتی ہے - اور ان سب مقامی حاضرین کی بھی شکر گزار ہے جو اس تقریب میں شریک ہیں -

تقریب کے مقصد کی گفتگو ختم ہوگئی ہے - میں اب اجمالاً سید

صاحب کے حالات زندگی اور ان کی مختلف خدمات کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں ۔

سید صاحب ۱۹۰۶ع میں بتاریخ ۵ اپریل ضلع ہزارہ تحصیل مانسہرہ کے ایک گاؤں منگلور میں پیدا ہوئے ۔ مجھے اس پر ہمیشہ فخر رہا اور رہے گا کہ میرا تعلق بھی منگلور کی اسی بستی سے ہے جس نے استاد محترم جیسی عظیم شخصیت پیدا کی ۔ سید صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی ، پھر براہ راست چوتھی جماعت کا امتحان دے کر ، مڈل کا امتحان مانسہرہ مڈل سکول سے ، لویں کا گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد سے پاس کیا ، دسویں کے لیے اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے داخلہ جانے والا تھا کہ تحریک خلافت میں شریک ہوکر علی گڑھ چلے گئے اور کم عمری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علم ہوکر ، مولانا محمد علی رئیس الاحرار کے خاص شاگرد ہوئے اور ڈاکٹر ذاکر حسین ، مولانا محمد سورتی اور خواجہ عبدالحی فاروقی سے متعلقہ مضامین پڑھے ـــــ ۱۹۲۱ع میں ۶ ماہ قید تنہائی میں بسر ہوئے ـــــ رہا ہوکر جاٹ اخبار نکالا ـــــ تحریک خلافت کے زوال کے بعد ، پھر تعلیم کا سلسلہ شروع کیا ، کبھی پرائیویٹ اور کبھی باقاعدہ پڑھ کر پہلے ایم - اے فارسی پھر ایم ، اے عربی ، پھر ڈاکٹوریٹ حاصل کی ـــــ ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کی قلمی کتابوں کے فہرست ساز مقرر ہوئے ۔ پھر ریسرچ سکالر فارسی ، پھر یونیورسٹی لائبریری کے ملازم ـــــ ۱۹۳۸ع میں شاداں بلگرامی صاحب کی جگہ اورینٹل کالج میں منشی فاضل کے استاد ۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ع میں پروفیسر شیرانی کی جگہ اورینٹل کالج میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے اور اپنی لامثال محنت کی بدولت ، ترقی کرتے کرتے پروفیسر اردو اور پرنسپل اورینٹل کالج مقرر ہوئے ـــــ تقریباً گیارہ برس تک اس عہدے پر فائز رہ کر یکم مارچ ۱۹۶۵ع کو کالج سے اچانک طویل رخصت لیکر گھر جا بیٹھے اور کسی کو معلوم بھی نہ ہوسکا کہ جس کالج سے سید صاحب کو اتنی محبت تھی اسے انھوں نے اس طرح آناً فاناً کیوں چھوڑ دیا ـــــ طلبا نے ان کی غیر حاضری اور اپنی محرومی کو بے حد محسوس کیا ۔ قوم کو بھی اس معاملے میں قدرے حیرت مگر زیادہ تر دکھ ہوا اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ماجرا پیش

آیا ، ظاہر ہے کہ اس کے اسباب ضرور ہوں گے مگر یہ مجلس ان جزئیات کی متحمل نہیں ہوسکتی ۔ ان واقعات کی تفصیل سید صاحب اپنی کتاب برسبیل حکایت میں خود لکھ رہے ہیں ۔

سید صاحب نے کئی ہزار صفحے لکھے ہیں ان کی تحریریں اردو فارسی ، عربی اور انگریزی چاروں زبانوں میں موجود ہیں اگرچہ انگریزی کا ذکر کرتے ہوئے ایک خطبے میں فرمایا '' یہاں تو اورینٹل کالج کا طالب علم بھی اپنے نیم انگریزی دان پرنسپل کے نام اپنی عرضی بھی انگریزی ہی میں لکھتا ہے حالانکہ زبان کے لحاظ سے اس عرضی کی حیثیت فقط واجبی ہی ہوتی ہے اور انشا کا کوئی قابل فخر نمونہ اس کو نہیں سمجھا جا سکتا '' یہ بالکل درست ہے مگر اپنے متعلق انہوں نے انکسار سے کام لیتے ہوئے نیم انگریزی دان پرنسپل کا لفظ استعمال کیا حالانکہ انگریزی میں ان کی کتاب ، مقالات موجود ہیں اور سالہاسال وہ عربی ، فارسی ، اردو کا ادب انگریزی زبان میں پڑھاتے رہے۔ ان کے انکسار کے پیش نظر ان کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے کسی برعکس صورت کو ہی تصور میں لانا پڑے گا، مگر ان کا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ صرف استاد ہیں ۔ باقی کسی چیز میں انہیں دعویٰ نہیں ۔ پھر بھی عام رائے کے مطابق وہ ایک بلند پایہ محقق ، نقاد اور مصنف ہیں ۔ تعلیم ، ادب ، تاریخ ، فلسفہ ، اسلامی تہذیب اور ادب ان کے وہ خاص موضوعات ہیں جن پر وہ اپنے خاص نقطہ نظر کے تحت لکھتے رہتے ہیں ، ان کا ہر مضمون غور و فکر اور طویل مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ اگرچہ سید صاحب ہمیشہ کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں '' کاش میں اپنی زندگی میں دس پندرہ سطریں ایسی لازوال لکھ جاؤں جو انسانی دکھ درد میں کسی مور ناتواں کے لیے سفینۂ برگ گل بن سکے ۔ میں اس قسم کی ایک سطر بھی ابھی تک نہیں لکھ سکا ۔ سقراط دانش کی ایک چمک کے لیے پہاڑیوں کے گرد دیوانہ وار گھومتا تھا میں سیاہی کے ایک قطرے کا آرزو مند ہوں جو تحریر میں ڈھل کر مرہم بن جائے ۔'' استاد محترم کے یہ الفاظ ہی ثابت کیے دیتے ہیں کہ وہ انکسار سے کام لے رہے ہیں اور ان کی یہ دو سطریں بذات خود دائمی اور لازوال حیثیت کی مالک ہیں مگر اس موضوع پر میں کچھ زیادہ اظہار خیال کی ہمت نہیں رکھتا ۔

سید صاحب کی وہ خدمات جو فراموش نہیں کی جاسکتیں مختصراً یہ ھیں

(۱) وہ پہلے اپنے عظیم استاد مولانا محمد شفیع کی رھنمائی میں پھر ان کی سبکدوشی کے بعد مستقلاً ۱۹۳۸ع سے ۱۹۶۵ع تک علوم مشرق کے تحفظ کے لیے سر بکف رھے - اس کام میں ان کے خاص دوست آقا بیدار بخت خاں ان کے شریک اور رفیق رھے - انھوں نے نہ صرف علوم مشرقی کا تحفظ کیا بلکہ ان مضامین کو پروقار بنانے کے لیے ھمہ تن مصروف رھے - ان کی یہ کوششیں رنگ لے آئی ھیں اور آج کوئی اپنے آپ کو ان علوم کا فارغ التحصیل کہتے ھوئے شرم نہیں محسوس کرتا -

(۲) انھوں نے اورینٹل کالج لاھور کو نہ صرف ترقی دی بلکہ اسے اس وقت بچایا جب مختلف رائے والے اصحاب غالب تھے اور کالج کو ختم کر دینا چاھتے تھے - اس جہاد میں سید صاحب کو شاید شدید خطرات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے علوم مشرق کی اس قدیم یادگار کے لیے اپنے مستقبل تک کو خطرے میں ڈال کر اور بالآخر خدا کے فضل و کرم سے کالج کو بچا کر اسے ایک عظیم مثالی درسگاہ بنا دیا - جو لوگ کسی ادارے کے بچانے اور بنانے کی صعوبتوں کا تجربہ رکھتے ھیں وھی بتاسکیں گے کہ اس راستے میں کن کن تکالیف اور آزمائشوں سے دو چار ھونا پڑتا ھے -

۳ - سید صاحب نے قومی زبان اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے ۱۹۴۸ع میں اپنی مہم کا آغاز کیا - اس کے بعد جس مستقل مزاجی سے وہ اس کے ھر محاذ پر صف آرا ھوئے وہ سب صاحبوں کے علم میں ھے ، بہت سے حضرات آج اندازہ نہ کر سکیں گے کہ ۱۹۵۰ع کے بعد اردو زبان پر کیا وقت آیا - یہ وہ زمانہ تھا کہ لیاقت علی خان شہید کے انتقال کے بعد اردو سے بے وفائی اور اس کی تضحیک ایک عام سی بات ھو گئی تھی —— ایسے میں پنجاب سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی آواز اٹھی ، یہ آواز گو نرم تھی مگر اس کے پیچھے ایک عزم تھا - اس مرد مومن نے اس عزم آھنی کی مدد سے مخالفت کے سب قلعے توڑ ڈالے - آھستہ آھستہ اور لوگ بھی اس میں شامل ھوتے گئے اور آواز ایک تحریک بن گئی - اب انشا اللہ وہ وقت قریب ھے کہ اردو کو سرکار دربار میں اس کا اصل مقام مل جائے گا اور قوم سے یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں کہ استاد محترم نے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے کتنی

سرگرمی اور انتھک لگن سے کام کیا - انھوں نے اپنے حسن تدبر سے پہلے تو عملی طور پر یہ ثابت کر دکھایا کہ اردو میں تمام علوم کی تدریس کی صلاحیت موجود ھے صرف عمل کی ضرورت ھے - یہ استاد محترم کا عزم و استقلال ھی تھا کہ بڑے بڑے انگریزی کے بت بھی اردو کا کلمہ پڑھنے لگے - اگرچہ اردو اب بھی قوم کے مدبران سے انصاف کے لیے پکار رھی ھے کہ طالب علم کو تو اردو میں امتحان دینے کی اجازت دے دی گئی لیکن استاد اب بھی کسی غیر کی زبان سے بولتا ھے اور کیفیت وھی ھوتی ھے جو ایک دانش مند انگریز نے بیان کی تھی :

This method of teaching renders the master half dumb and the pupil half deaf.

طالب علم کو کسی رھنمائی کے بغیر ایک ایسی آزمائش میں ڈال دینا جو پوری قوم کے کرنے کے قابل ھے ، عجیب ھے لیکن میں طالب علموں کے اس قافلے کے حضور اپنا سر عقیدت سے جھکا دیکھتا ھوں جو کالجوں میں انگریزی میں پڑھتا ھے لیکن اس عظیم قافلہ سالار کی قیادت میں اردو کو ذریعۂ امتحان کے طور پر قبول کرتے ھوئے قوم کی تاریخ میں ایک سنہرا باب لکھ رھا ھے - مجھے یہ دیکھ کر خوشی ھو رھی ھے کہ استاد محترم جس اردو کے آونٹ کی نکیل سنبھالے ھوئے تھے اس نے اب انگریزی کے خیمےمیں سر ڈال دیا ھے - اور بہت جلد خیمہ اپنے لیے خالی کرا لے گا -

(۴) سید صاحب نے تقسیم ملک کے بعد پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے تحفظ اور تنظیم کے لیے جس بے غرضی اور محنت سے کام کیا اس کا ریکارڈ یونیورسٹی میں ھو یا نہ ھو سید صاحب کے سب شناسا اس سے باخبر ھیں - یہ یقین سے کہا جا سکتا ھے کہ اگر اس افراتفری کے زمانے میں سید صاحب اس لائبریری کو محفوظ نہ کرتے تو آج لائبریری کی یہ صورت نہ ھوتی -

(۵) سید صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت لگن ھے - اسی کے تحت انھوں نے یونیورسٹی کے کئی شعبوں کی مفت خدمت کی - انھوں نے درجن سے زیادہ کانفرنسیں کیں - انھوں نے کئی اداروں کی بنا رکھی - انھوں نے اردو انسائیکلوپیڈیا اسلام کی ابتدائی تنظیم کی ، انھوں نے اردو اکیڈمی کی بنیاد رکھی - اردو کالج کھولا - اردو

تدریس کانفرنس کا آغاز کیا ۔ اردو میں اصطلاحات کی پہلی ڈکشنری مرتب کرا کر ملک کے سامنے پیش کی اور اب وہ اردو میں سائنس کے کئی سائیکلوپیڈیا لکھوا رہے ہیں ۔

۶ : استاد محترم نے ملک میں لبرل تعلیم کے لیے جو کوششیں کیں ان کے لیے پوری قوم ان کی ممنون احسان ہے ۔ انھوں نے اوریئنٹل کالج میں کبھی یہ کہہ کر کسی مستحق اور شائق طالب علم پر دروازے بند نہیں کیے کہ میں جگہ کی کمی کی وجہ سے تمھیں داخلہ نہیں دے سکتا ۔ انھوں نے کھلے آسمان کے تلے درس و تدریس کے ذریعے تشنگان علم کو سیراب کرنے کو ترجیح دی ۔ اور ارزاں تعلیم کے لیے ہمیشہ آواز بلند کی ۔ فلسفۂ تعلیم پر جتنا کچھ استاد محترم نے لکھا شاید ہی اس دور میں کسی نے لکھا ہو ۔ وہ تعلیم کو محض ذریعۂ معاش بنانے کے حق میں نہیں ۔ لیکن ابھی یہ میدان استاد محترم کی مزید توجہ کا مستحق ہے ۔ ابھی ملک میں دو مختلف طرح کے سکول موجود ہیں ۔ جن سے دو مختلف قومیں پیدا ہو رہی ہیں ۔ ابھی قومی تعلیم اپنے نصب العین کی حتمی تعیین نہیں کر پائی ۔

۷ : سید صاحب محترم نے تعلیم کو عام کرنے کے لیے جو جدوجہد کی اس کی ایک مثال میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی کہ کوئی پرائیویٹ امتحان والا طالب علم اگر کبھی سید صاحب کے پاس فارموں پر دستخط کرانے آیا تو تمام مصروفیات ترک کر کے استاد محترم نے پہلے اسے فارغ کیا ۔ اور بعض اوقات ایک ایک دن میں آٹھ آٹھ سو فارموں پر دستخط فرمائے میں سید صاحب کی اس لگن کو اس وقت تک نہ سمجھ سکا تھا ، جب تک میں نے ان کے یہ الفاظ نہ پڑھے تھے :

” میں ایف اے کا امتحان دے رہا تھا کہ لاہور کے بڑے کالجوں کے پرنسپلوں میں سے کوئی شخص پرائیویٹ طلبا کے فارموں پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا ۔ مجھ سے کسی نے کہا لالہ رگھبیر دیال پرنسپل سناتن دھرم کالج سے ملو ۔ میں گیا اپنی باری پر بلایا گیا ۔ کرسی پر سے ایک شخص اٹھا ۔ دو دست بستہ نمستے کہا ، بٹھایا ، فارم لیا دستخط کیے اور کہا کاکا جی ! جب بھی کوئی کام ہو بے تکلف آ جایا کرو ۔ پھر بڑے انکسار سے دوبارہ نمستے کہا اور رخصت کیا ۔ میں جو کہ پندرہ روز سے بڑے بڑے پرنسپلوں کے دفتروں کے سامنے دھکے

کھاتا رہا تھا - حیرت زدہ ہوا اور سوچنے لگا ، لگن اور گداز ہو تو منصب اور انکسار کا اجتماع ممکن ہے - میں نے سید صاحب کی ذات میں اسی منصب اور انکسار کا اجتماع پایا -

یہ سب وہ کام ہیں جن سے ان کی ذات کو کچھ فائدہ نہیں ہوا - وہ درویشانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اسی میں خوش ہیں——جب اس عالم درویشی میں بھی لوگ انہیں تکلیف پہنچاتے ہیں تو ان کے شاگرد سخت مضطرب ہو جاتے ہیں مگر وہ اس اذیت کو بھی لگن کے پردے میں چھپا کر اپنے معمول کے کاموں میں یوں منہمک رہتے ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں - لیکن یہ استاد محترم کا ضبط نفس اور ریاضت ہے کہ وہ ہر اذیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں - اپنے ذوق ، مسلک اور مشرب کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں -

”یہ سوال مجھ پر زیادتی ہے اور اس سے اس لڑائی کا راز آشکار ہو جائے گا جو مسلسل بیس برس سے میرے اور میرے نفس کے درمیان جاری ہے - میں ایک غم پسند آدمی ہوں اس کے زیر اثر میں نے اپنا ایک فلسفہ مرتب کیا تھا جسے کبھی کبھی میں میر تقی میر کے تتبع میں فلسفۂ درد مندی کہہ لیا کرتا ہوں مگر میرا فلسفہ بار بار بکھرتا رہتا ہے - اور میں اسے پھر جمع کر لیا کرتا ہوں دردمندی کے اس تصور میں ضمیر داری ، ہمدردی قربانی ، در گزر ، محبت عام اور ذوق بے خودی سبھی چیزیں شامل ہیں مگر کس کی محبت اور کیسی ضمیر داری ، من کی دنیا بڑی آزمائش میں مبتلا رہتی ہے - اور دل کے اندر تنہائی محسوس کرتا ہوں - میرا سب سے بڑا غمگسار شعر ہے - میرا گنگنانا ہر جاگتے لمحے تک پھیلا ہوا ہے - اس کے بعد سب سے بڑا ندیم آسمانی دوست ہے جس کی ہم کلامی یعنی دعا سے بڑی تسکین ملتی ہے مگر اب ایسے لمحے بھی آتے رہتے ہیں جب یہ دونوں رفیق میرا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور میں ایلی ایلی لما سبقتنی کہتا ہوا بھٹکتا پھرتا ہوں -“

بہر صورت لگن ان کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے لیے تقلید کے قابل ہے - اور ہم لوگ جو ان کے شاگرد ہیں ان کے لیے تو استاد معظم ایک مثال ، ایک نمونہ ہیں -

صدر محترم میں سمجھتا ہوں کہ میری یہ گزارشات اس عظیم استاد کی شخصیت کے کسی ایک پہلو پر بھی روشنی نہیں ڈال سکیں لیکن شاید میں اس تقریب کے متعلق ضرور کچھ عرض کر سکا ہوں۔

ایک اچھے استاد کی ذات میں ایسی تجلیات ضرور ہوتی ہیں جن کے انعکاس سے وہ اپنے معاشرہ کو پوری طرح منور کر سکتا ہے۔ ایسی ہستیوں کے پرتو سے ظلمتیں نور میں اور کدورتیں محبتوں میں بدل سکتی ہیں۔

یہ امر اپنی جگہ اہم ہے کہ استاد بہر حال استاد ہے، زندگی میں 'قدر علم بمال' کا مقولہ درست تو ہے مگر استادوں کو بے قدری کے باوجود تعلیم کو امتحان گاہ ایمان بھی بنانا ہے—اور یہ وہ امتحان گاہ ہے جس میں پھول کبھی کبھی مگر کانٹے اکثر نصیب ہوتے ہیں۔ لہذا خاکساری اور سرفرازی کے اس دہرے تجربے کے لیے ہر مدرس کو تیار رہنا ہو گا—اسی تجربے میں سعادت ہے۔ اگرچہ بعض اوقات یہی سعادت شہادت بھی بن جاتی ہے۔

(ڈاکٹر) سید عبداللہ

جمیل ملک

ڈاکٹر سید عبداللہ

(شخصیت و انتقاد)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت میں ماضی اور حال کی زندہ اور صحت مند روایات یکجا ہوگئی ہیں اور ادب کی دنیائے نقد و نظر میں ایسی شخصیات خال خال ہی نظر آئیں گی جنھوں نے ماضی سے اپنا رشتہ اس طرح استوار کیا ہو کہ وہ حال کی آئینہ دار بن گئی ہوں اور حال کے تقاضوں سے اس طرح عہدہ برآ ہوئی ہوں کہ خود کلاسیکیت کا ایک حصہ بن کر آنے والوں کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت اختیار کر گئی ہوں ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی جودت نظر ، جذبۂ دل اور بلندیٔ فکر پچھلے چالیس سال سے ایک ایسی ہی شخصیت کا جلوہ بن گئی ہے ۔ یہ شخصیت جس طرح سب کے سامنے جلوہ گر ہے اس طرح سب کی نظروں سے مستور بھی ہے ۔ حجاب و جلوہ ، قرب و دوری اور غائب و حاضر کے تضادات میں توازن و ہم آہنگی کی تلاش کا سہرا عام طور پر تخلیقی فنکاروں ہی کے سر پر باندھا جاتا ہے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ سید عبداللہ کے ہاں تحقیق و تنقید ، جذبہ و فکر اور ماضی و حال کے ڈانڈے اس طرح ملتے چلے گئے ہیں کہ ہوتے ہوتے سیدعبداللہ کا سرمایۂ فکر و نظر بجائے خود ایک مکتبۂ فکر و فن کا درجہ حاصل کر گیا ہے ۔

سید عبداللہ نے جن کلاسیکی اقدار و روایات سے اپنا رشتہ قائم کیا ہے وہ عربی و فارسی ادبیات اور مسلم ثقافت کے بیش بہا خزائن سے لے کر ہندوستان میں محمد بن قاسم کے ورود ، آزادی کی تحریکات ، قیام پاکستان اور حالیہ پاک بھارت جنگ تک پھیلی ہوئی ہیں ۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو سید عبداللہ کے فکر و نظر کا کینوس بے حد وسیع نظر

آتا ہے ۔ ہر چند سید عبداللہ کی ادبی شخصیت کے خد و خال تعین کرتے ہوئے عرب و عجم کے ثقافتی میلانات اور برصغیر پاک و ہند کے سیاسی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن چونکہ سید عبداللہ نے علم و ادب اور نقد و نظر ھی کو اپنے جذبہ و فکر کی جولانگاہ بنایا ہے اس لیے سیاسی محرکات کی تفصیلات سے قطع نظر کرکے بھی سید عبداللہ کی شخصیت کا محاکمہ کیا جاسکتا ہے ۔

ایک محقق کی حیثیت سے سید عبداللہ ایک طرف ادبیات عرب و عجم کے بحر ذخار کی تہہ تک غوطہ زنی کرکے تحقیق و تجسس کے صدف ریزے چن لاتا ہے تو وہ دوسری طرف البیرونی اور خان آرزو کی معیت میں لغت نگاری اور ہندوستانی لسانیات کی گتھیاں سلجھاتا ہوا بھی نظر آتا ہے ۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ولی کا حسن نظر ، میر کا سوز دل اور غالب کا حاسۂ انتقاد تینوں سید عبداللہ کی نمو پذیر طبیعت پر اپنے اپنے انمٹ نقوش چھوڑگئے ورنہ عین ممکن تھا کہ یہ محقق پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی فہرست ہائے کتب کے طول و عرض ھی میں گم ہو کر رہ جاتا ۔

ہو سکتا ہے ولی ، میر اور غالب کا نام سن کر آپ چونک اٹھیں کہ ''ایک محقق اور شاعری ! یہ کیا بات ہوئی!!'' مگر بات بالکل سیدھی اور صاف ہے اور وہ یہ کہ جہاں تحقیق اپنا کام کرچکتی ہے وھیں سے تنقید کا آغاز ہو جاتا ہے اور جب نقاد تخلیقی فنکاروں کے جذبۂ تخلیق کا ہم راز بن کر شاعروں اور ادیبوں کے دل کی دھڑکنوں کا ہمنوا ہو کر اپنے حاسۂ انتقاد کی پرورش کرتا ہے تو تنقید بھی تخلیق کا درجہ حاصل کر لیتی ہے ۔ سید عبداللہ کے ساتھ یہی خوشگوار حادثہ گزرا ۔ اس کے شوق تحقیق و تجسس نے اسے تنقید و تخلیق کے اعلیٰ تر منصب سے ہمکنار کر دیا ۔

سید عبداللہ نے محقق کی دقت نظری سے ناقد کی ژرف نگاھی اور فنکار کی دروں بینی تک یہ تمام مراحل کیوں کر طے کیے یہ امر بذات خود ایک طویل مقالے کی صورت میں تحقیق و تنقید کا متقاضی ہے ۔ تاہم یہاں مختصراً ان راستوں کے پیچ و خم کی نشاندھی کرنا مقصود ہے جن سے گزر کر سید عبداللہ نے نہ صرف اپنی سمت کا تعین ھی کیا ہے ، بلکہ راہ و منزل کے درمیانی فاصلے بھی کم کر دیے ھیں ۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ سید عبداللہ نے تحقیق کی عرق ریزی ھی

سے تنقید کا چراغ جلایا ہے ۔ اس سارے عمل میں ولی ، میر اور غالب کی تثلیث نے سید عبداللہ کی تحریروں میں جذبے کی آگ روشن کی ہے ۔ سرسید احمد خاں سے اقبال تک کا فکری سرمایہ اس کے شعور کو صیقل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا ہے اور میر امن سے مولوی عبدالحق تک کی لسانی تحریکوں نے اسے ایک طرف منفرد اسلوب نگارش عطا کیا ہے تو دوسری طرف اسے قومی زبان کی ترویج و ترقی کے قافلہ سالاروں میں بھی شامل کر دیا ہے ۔

سید عبداللہ کی شخصیت کا کمال یہ ہے کہ اس نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں مسلم تہذیب و ثقافت کے ورثے کی چھان پھٹک کی ہے بلکہ اس روایت کا رشتہ انیسویں صدی کی علمی و ادبی تحریکات سے جوڑ کر انھیں بیسویں صدی کے سائنٹفک شعور سے بھی منسلک کردیا ہے ۔ لطف یہ کہ اس سارے سفر میں اس نے کسی نہ کسی صورت میں جذبے ، فکر اور عمل کی تثلیث سے اپنا ناطہ برابر استوار رکھا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ غلوئے تخیل ، فکری پھیلاؤ اور مسلسل کاوش کے باوجود اس کی شخصیت سرسید احمد خاں کی طرح قوی ہیکل ، اقبال کی طرح ارضی و لاہوتی اور مولوی عبدالحق کی طرح فنافی الاردو ہو کر نہیں رہ جاتی ۔ وہ فکری طور پر سرسید احمد خاں اور اقبال کے قبیلے ہی کا ایک فرد ہے اور مولوی عبدالحق کے بعد تحریک اردو کو زندہ ، بامقصد اور بامراد بنانے میں بھی وہ پیش پیش رہا ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کا ذوق جمال ولی کی سراپا نگاری اور طرز ادا پر بھی مرمٹا ہے ۔ اسے میر کی دردمندی اور تہہ داری سے بھی عشق ہے اور وہ غالب کی پہلو داری اور ہزار شیوہ طبیعت کا بھی گرویدہ ہے ۔ وہ نشاۃ ثانیہ کے پیش رووں کے ساتھ قدم ملا کر چلتا ہے تو انھیں کے ساتھ اپنا سفر ختم نہیں کر دیتا بلکہ علی برادران ، اقبال اور قائداعظم کے کارواں کا ایک صاحب نظر مسافر بن کر قیام پاکستان کی منزل پر آکر دم لیتا ہے اور یہاں سے پھر از سر نو اپنے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے مگر اس ادا کے ساتھ کہ اس کے دماغ میں دو سو سال کی تحریک آزادی کا سمندر بھی ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور اس کے دل میں میر امن ، آزاد ، نذیر احمد ، حالی ، شبلی اور عبدالحق کے رواں دواں ، سادہ و پرکار ، رنگین و دلاویز ، پر شور و

دلنواز ، پر خطر و بے تکلف اسالیب بھی اپنا جادو جگا رہے ہیں جو مسلسل اس کی فکر کو جذبے میں ڈھال رہے ہیں اور اس کے علم کو فن کا قالب عطا کر رہے ہیں ۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سید عبداللہ کی تعمیر میں 'خرابی' کی کوئی نہ کوئی صورت ہمیشہ موجود رہی ہے ۔ اگرچہ ذہنی طور پر اس کے ہاں شروع ہی سے اخذ و اکتساب کا عمل جاری و ساری رہا ہے اور وہ تاریخ و ثقافت اور تحریکات و شخصیات سے استفادہ کرکے ہمہ وقت اپنے تابناک شعور کی لو بڑھاتا رہا ہے ۔ لیکن اس کی داخلی زندگی کا آشوب ہمیشہ اس کے " کاشانۂ دل " کو کسی " صورت خرابی " سے دو چار کرکے اسے کشاں کشاں مجلس میر میں بھی لے جاتا رہا ہے جہاں اشکوں کے ساغر ہیں ، رندان با صفا ہیں اور پیہم سرشاری کا عالم ہے ۔ اگر سید عبداللہ کے ہاں اس عالم دیگر کے نقوش نہ ملتے تو وہ نرا محقق ہو کر ہی رہ جاتا ۔ اس کی تنقید میں ' خبریت ' تو ہوتی مگر نظریت کی چنگاریاں کہاں سے آتیں ! یہی تو وہ مقام ہے جہاں اس کی خارجی تنقید اپنی ذات میں ڈوب کر تلاش و جستجو کے نئے اور خوب تر مراحل طے کرتی ہے ۔ تحقیق کے خشک تصورات کو دروں بینی کا جوہر عطا کرکے اسے انوکھے رموز و علائم سے آشنا کرتی ہے ۔ تنقید کے خارجی انداز اور تحقیق کی داخلی سطح کی باہمی آویزش سے اس کے نقد و نظر میں فکر کی جولانی اور جذبے کی گرمی دونوں اس طرح مربوط ہو جاتے ہیں کہ اس آمیزے کو بلاشبہ فن یا تحقیق کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے ، جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے ۔ سید عبداللہ کی شخصیت میں فکر و جذبہ ، قرب و دوری اور حجاب و جلوہ کے تضادات اس طرح جمع ہوگئے ہیں کہ ایک تخلیقی فنکار کی طرح ان تضادات میں ہم آہنگی ، کثرت میں وحدت اور ہرجائیت میں یکتایت پیدا کرنے کی کوشش ہی کو سید عبداللہ کا کارنامۂ خاص ٹھہرایا جاسکتا ہے ۔

اردو شاعری میں تو تضادات میں تصادم و تعمیر کی کئی مثالیں نظر آجاتی ہیں لیکن اردو نقد و نظر میں اتنے وسیع کینوس کے ساتھ جذبہ و فکر علم و عمل ، اور نظم و نثر کے فاصلوں کو کم کرنے کی مثالیں شاید زیادہ نہ مل سکیں گی ۔ اس نقطۂ نظر سے ماضی میں سید عبداللہ

کا موازنہ شبلی نعمانی سے کیا جا سکتا ہے کہ دونوں ہی میں جذبہ و فکر کی اکائی نظر آتی ہے ۔ فرق یہ ہے کہ شبلی کے ہاں تنقیدی تجربوں کی بنیادیں جذبہ و تخیل پر استوار کی گئی ہیں اور سید عبداللہ نے اس جذبہ و تخیل کے ایوان پر عہد حاضر کی فکری تحریکوں اور نظریوں کے نقش و نگار بھی مرتسم کر دیے ہیں ۔ زمانہ اور حالات کی پیدا کردہ اس ناگزیر دوری کے باوجود شبلی نعمانی اور سید عبداللہ کے جذبہ و تخیل اور فکر و فلسفہ کی اساس اور نہاد ایک ہی معلوم ہوتی ہے ۔ شبلی کا دماغ خدا پرست تھا مگر دل کو بت پرستی سے نسبت خاص تھی ۔ اردو ادب میں اس روایت کی جادوگری کا آغاز ولی اور میر کی بت پرستی سے ہوا ۔ شبلی نے جذبہ و خیال کو ہم آہنگ کر کے اس روایت میں خدا پرستی کا جادو جگایا اور سید عبداللہ تک پہنچتے پہنچتے یہ روایت ایک طرف 'خرابۂ دل' اور دوسری طرف 'ذوق تعمیر' کی علامت بن گئی ۔ فرق یہ رہ گیا کہ میر نے تو اپنی بے دماغی اور بدماغی کے ہاتھوں مجبور ہو کر قشقہ کھینچ لیا اور دیر میں بیٹھ گیا مگر شبلی اور سید عبداللہ اپنی جنوں نوازی کے باوجود میر کی طرح 'ترک اسلام' کا اعلان نہ کر سکے ۔ آخر ایسا کیوں ہوا ؟ کیا یہ بات تو نہیں کہ سرسید احمد خاں سے اپنے تمام تر اختلافات اور اسلامی نظریات سے سچی اور گہری لگن کے باوجود شبلی ، سرسید احمد خاں کی قوی ہیکل شخصیت کے مقابل محض اس لیے نہ جم سکا کہ وہ داخلی طور پر دل کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا ؟ اور اس کا سبب کیا ہے کہ سید عبداللہ کی شخصیت روحانی طور پر تو میر اور شبلی ہی سے وابستہ ہے مگر ذہنی طور پر اس کی شخصیت کی کڑیاں سرسید احمدخاں کی روایت سے بھی جا ملتی ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ سید عبداللہ کے ہاں شروع ہی سے اس تضاد میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کار فرما نظر آتی ہے ۔ لیکن ابھی تک اس کی شخصیت ان دونوں دھاروں کے نقطہ اتصال کو دریافت کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی ۔ جس روز سید عبداللہ نے یہ اہم ترین مہم سر کرلی اس کا تشخص و کردار ایک عہد آفریں کارنامے کا آئینہ دار بن کر ابھر آئے گا ۔ میں اس نقطے پر اس لیے بھی زور دے رہا ہوں کہ سید عبداللہ کے خمیر میں اس

عظیم کام سے عہدہ برآ ہونے کی تمام صلاحیتیں رچ بس چکی ہیں اور عمر کی اس منزل میں ، جب انسان بقائے دوام کے افق کو چھولینے کی آخری بھرپور کوشش کرتا ہے ۔ سید عبداللہ کا فرض منصبی یہی رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے نقد و نظر کا تمام سرمایہ سمیٹ کر ، اس کا رخ ایسے نتائج کی طرف متعین کر دے جن پر گامزن ہو کر راہ و منزل کے مابین فاصلۂ یک گام بھی طے ہو جائے ۔

دراصل یہ مسئلہ سید عبداللہ کی شخصیت اور اس کی بقائے دوام ہی کا نہیں بلکہ اسی مسئلے سے ایک خطۂ ارض کی تہذیب و ثقافت اور اس کا مستقبل بھی وابستہ ہے ۔ تاریخی شواہد صاف چغلی کھا رہے ہیں کہ شبلی نے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور شاہ اسماعیل شہید کے خون سے جو چراغ جلایا تھا وہ سرسید احمد خاں کی ''پرخلوص ڈپلومیسی'' کے باوجود سفید فام حکمرانوں کی ''نفاق پیدا کرو اور حکومت کرو'' کی تیز و تند آندھیوں کے مقابل نہ جل سکا ۔ یہاں تک کہ آخر آخر سرسید احمد خاں کے دل سے بھی انگریزوں کی 'اسلام دوستی' کا یقین اٹھ گیا تھا ۔ ایک طرف شاہ اسماعیل شہید اور شبلی کی مجتہدانہ نظر دوسری طرف سرسید احمد خاں اور اس کے رفقا کا صلح جویانہ رویہ ـــ! آخر مسلمانوں کے طرز عمل اور انداز فکر میں ابتدا ہی سے یہ دو عملی کیوں کار فرما رہی ؟ اور کیا قیام پاکستان کے بعد آج بھی امن و جنگ کا یہ تضاد ، جہاد اور ڈپلومیسی کی یہ دو عملی اسی طرح قائم نہیں ؟ کیا حالیہ پاک بھارت جنگ اور اعلان تاشقند کے ساتھ ساتھ ملکی و قومی سالمیت ، حق خود ارادیت اور کنفیڈریشن کی باتیں اس دو عملی کا زندہ ثبوت فراہم نہیں کرتیں ؟ کیا ان تضادات سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں نہیں ہو جاتی کہ آج اس ذہنی اور جذباتی تفاوت کو پاٹنے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے ، جس کا باقاعدہ آغاز شبلی کی گرمجوشی اور سرسید احمد کی ڈپلومیسی سے ہوا تھا ؟ اس لیے بھی کہ اس وقت ہمارا ملک ، سامراجیت ، اسلامیت اور اشتراکیت کے تہراہے پہ کھڑا ہے ۔ ہمارے سینوں میں قرآن بستا ہے ۔ دماغوں میں عقلت و سرمایہ کی آویزش جاری ہے اور نظریں مغرب کی مادہ پرستی اور نقالی سے خیرہ ہیں ۔ ہماری منزل کون سی ہے ؟ پاکستانیت ـــ! مگر پاکستانیت کیا ہے ؟ یہی وہ عقیدہ ہے جو اپنی کشود کے لیے

کسی جاذب شخصیت کے ناخن تدبیر کا منتظر ہے ۔ سید عبداللہ کی تحریروں پر اول تا آخر مسلم تہذیب و ثقافت، زبان و ادب ، فکر و نظر اور علم و عمل کی چھاپ گہری ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس عقدۂ مشکل کی کشود کے لیے بار بار نظریں سید عبداللہ ہی کی ہفت رنگ اور متنوع شخصیت کی طرف اٹھتی ہیں ۔ ممکن ہے یہ بے اختیارانہ کیفیت اس لیے بھی مجسم تقاضا اور سراپا اظہار بن کر ابھر آئی ہو کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سید عبداللہ کی شخصیت ہمارے لیے تجدید عزم کی زندہ علامت بن گئی ہے ۔

میرے نزدیک پاکستانیت ، اسلامیت کا مقامی نقش ہے ۔ عملی لحاظ سے پاکستانیت کا مطب ہو گا پاکستان سے محبت اس بنا پر کہ یہ وہ خطہ ہے جو ہمیں ایک مخصوص دین ، ایک مخصوص طرز زندگی اور مخصوص تاریخی احوال کی بنا پر حاصل ہوا ۔ ہم اس میں نہ صرف ان کوائف سے خود متکیف ہوں گے بلکہ اس کی اقدار کو ایک تہذیبی اور روحانی تجربے کے طور پر آگے بھی پھیلائیں گے ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

ملک غلام ربانی -
معتمد عمومی - انجمن اساتذہ ہزارہ

یوم تجدید عزم اور ڈاکٹر سید عبداللہ

حکایت از قد آں یار دلنواز کنیم
بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

صدر محترم و گرامی القدر حضرات ! یوم تجدید عزم کے سلسلے میں آپ ابھی ابھی ارباب علم و فضل کے بلندپایہ اور پر مغز مقالات سن چکے ہیں - اب میں جو کچھ عرض کرنے لگا ہوں یہ مقالہ نہیں ہے ، کیوں کہ مقالے میں جو محققانہ اور عالمانہ رنگ ، پرشکوہ الفاظ ، جامعیت ، آفاقیت اور دوسری چیزیں پائی جاتی ہیں ، میری باتوں کو ان سے دور کا تعلق بھی نہیں - ''مریز و کجدار'' کی نمائش سے ہٹ کر چند سیدھی اور سادی سی باتیں ہیں :

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

عزیزان گرامی ! آج مخدومی استاد الاساتذہ جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی ساٹھویں سالگرہ ہے - سید صاحب کے مخلص احباب اور ارادتمندوں نے اردو زبان کے اس عظیم محقق ، اعلیٰ پایہ کے نقاد اور بے مثل استاد کی یہ سالگرہ منانے کے لیے کئی تجویزیں پیش کی تھیں - ایک تجویز یہ تھی کہ سید عبداللہ کالج کے نام سے ایک اردو کالج بنایا جائے - ایک دوسری تجویز تھی کہ سالگرہ کے موقعہ پر ان کی خدمت میں ساٹھ ہزار روپے کی تھیلی پیش کی جائے ، جو وہ اردو کی ترویج اور ترقی کے لیے خرچ کر سکیں - ایک اور تجویز تھی کہ آدم جی پرائز کی طرح سید صاحب کے نام سے ہر سال اچھے ادب پر انعام دیا جائے - بعض عقیدتمندوں نے اپنی تجویز میں کہا تھا کہ سالگرہ

کے موقعہ پر لاہور اور بیرون لاہور تقریبیں منعقد کر کے سید صاحب کو ان کی علمی اور ادبی خدمت پر خراج تحسین پیش کیا جائے۔ یہ تو ان تجاویز سے ''مشتے از نمونہ خروارے'' ہیں ۔ اس طرح کی متعدد تجویزیں تھیں ۔ لیکن جب سید صاحب کے علم میں یہ سب کچھ لایا گیا تو انھوں نے احباب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ ان تمام باتوں کو غیر ضروری سمجھتے ہیں :

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر بادہ و جام سے گزر

ایک طرف سے انکار دوسری طرف سے پیہم اصرار ۔ آخر سید صاحب جیسے لوگ جن کے متعلق بلبل شیراز فرماتے ہیں :

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمناں ہم نکردند تنگ

جو دشمنوں کو آزردہ کرنے کے روادار نہیں ہوتے ، دوستوں کو کب کبیدہ خاطر ہونے دیتے ہیں ۔ یہاں دوست اور دشمن کی نسبت سے سید صاحب کی سیرت کا ایک اور پہلو سامنے آ گیا جس کے متعلق ان کے شاگرد رشید ممتاز منگلوری صاحب اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں : ''سید صاحب کے احباب کو ان کے حد سے بڑھے ہوئے عفو در گذر کی روش سے ہمیشہ اختلاف رہا کہ وہ سانپوں کو دودھ پلا پلا کر پالتے ہوتے رہتے ہیں ۔ اور ایسے سانپ پھر انھیں اور ان کے احباب کو ڈسنے کے لیے دوڑتے ہیں ۔ تو سید صاحب اپنے ارادتمندوں کو ان پر پتھر اٹھانے اور ان کا سر کچلنے سے بھی روکتے ہیں ۔ اور کہہ دیتے ہیں :

زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

میں کہتا ہوں کہ اگر سید صاحب بدی کا بدلہ بدی سے دیں تو پھر ان میں اور ایک عام آدمی میں کیا فرق رہ جاتا ہے ۔ عوام کے لیے جہاں بہتر راستہ ''کلوخ انداز را پاداش سنگ است'' کا ہے ۔ وہاں خواص کی راہ عفو در گذر ہی کی ہے ۔ سید صاحب کی عظمت اس میں

ہے کہ ان سے دوست و دشمن یکساں مستفیض ہوں ۔ جس طرح خدا کی رحمت اور نعمتیں نیک و بد ہر دو کے لیے عام ہیں ۔ اسی طرح اس کے خاص لوگ بھی اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگوں سے شفقت کا برتاؤ کرتے ہیں ۔ تخلقو با اخلاق اللہ کی یہی تفسیر ہے ۔ آمدم بر سر مطلب کہ سید صاحب نے احباب کی خوشنودی کے لیے تقریب کی تجویز منظور کرلی ۔ لیکن اس میں وہ کتر بیونت کی کہ صورت ہی بدل کر رہ گئی ۔ انہوں نے ممتاز منگلوری کو لکھا :

''اگر آپ کو تقریب پر اصرار ہے تو میں آپ کے سامنے ایک متبادل تجویز رکھتا ہوں ۔ آپ اس پر غور کر لیجیے ۔ اور دوسرے احباب سے بھی مشورہ کر لیجیے ۔ تجویز یہ ہے کہ ۵ اپریل کو یوم تجدید عزم کی صورت دے دیجیے ۔ یہ تجدید عزم میرے لیے دعوت عمل ہوگی ۔''

ذرا ان الفاظ پر غور فرمائیے ۔ ''میرے لیے دعوت عمل ہوگی!'' یہ نہیں ارشاد فرمایا کہ آپ کے لیے دعوت عمل ہوگی ۔ یہ چند الفاظ کا ایک مختصر سا جملہ ان کی عظمت کا آئینہ دار ہے ، جہاں سید صاحب کو ہم ان کے اصلی روپ میں دیکھ سکتے ہیں ۔ ملاحظہ تو فرمائیے کہ سید صاحب کی بیش بہا علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے مداح اور عقیدتمند ان کی سالگرہ کی تقریب منانا چاہتے ہیں ، تو وہ انکار کر دیتے ہیں ۔ لیکن جب رد و کد کے بعد قبول فرماتے ہیں تو تقریب کا نام بدل کر وہ اپنے احباب کی توجہ اپنے مقصد اور منزل کی طرف پھیر دیتے ہیں ۔ یوم تجدید عزم کے نام سے ہم نہ صرف اس تڑپ اور لگن کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو سید صاحب کو اپنے مقصد سے ہے بلکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پارہ ہائے دل کی قاشوں کو کس طرح اپنے احباب کے دل میں رکھتے ہیں تاکہ ان میں بھی مقصد کے لیے وہی تڑپ اور لگن پیدا ہو سکے ۔ تھوڑی دیر کے لیے اس عزم کے لفظ کو اپنے اذہان میں رہنے دیجیے ۔ سر دست آئیے اس پر غور کریں کہ سید صاحب کے مقصد کے حصول میں کتنی دیر ہے ؟ اور اردو زبان کو کب اپنا مقام حاصل ہوگا !

آپ جانتے ہیں کہ آج سے برسوں پہلے برصغیر ہند کی مسلمان نامی قوم نے ایک عزم کیا تھا کہ وہ اپنی بقا کے لیے اس برصغیر میں اپنے

لیے علیحدہ وطن بنائیں گے - برادران وطن جنھیں اکثریت ، دولت ، طاقت اور تمام مادی وسائل حاصل تھے ، ان کے اس عزم پر نہ صرف ہنسے تھے بلکہ اسے مجذوب کی بڑ قرار دیا تھا - انگریز جو اس ملک کا حکمران تھا ، اس نے اسے قطعی نا ممکن قرار دیا تھا - پھر کیا ہوا؟ مخالفت کی تند و تیز ہوائیں چلنے لگیں - رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے کیے گئے - قہر و غضب کی بجلیاں چمکنے لگیں - مخاصمت اور غصے کے طوفان امڈ پڑے ، لیکن ایک چیز بھی تو ان کا راستہ نہ روک سکی - اور صرف عزم صمیم کے بل بوتے پر انھوں نے نا ممکن کو ممکن کر دکھایا - پاکستان کیا ہے ؟ اسی عزم عالی شان کی مقدس یادگار ہے - بلکہ تاریخ انسانی اور خصوصاً تاریخ عالم اسلامی اس پر گواہ ہے کہ گاہے ماہے ایک صاحب عزم انسان نے تاریخ کے رخ کو موڑ کر رکھ دیا - آپ میں سے کون ہے جو امام احمد بن حنبل کی جلیل القدر اور عظیم المرتبت شخصیت سے نا واقف ہے ! کیا اس صاحب عزم مستحکم نے یکہ و تنہا ''قرآن مخلوق ہے'' کے فتنے کا ہمیشہ کے لیے سدباب نہ کر دیا تھا ! جب کہ مقابلے میں المامون اور معتصم جیسے صاحب جبروت اور طاقتور عباسی حکمران تھے - لیکن طمع و خوف جو ہمیشہ سے انسانی خرابیوں کا سرچشمہ ہیں ، کوئی چیز بھی ان کو اپنے موقف سے نہ ہٹا سکی - ذرا سوچیے تو سہی ، ایک قوم سخت نامساعد حالات میں پاکستان بنا کر تاریخ انسانی کا ایک عظیم کارنامہ سر انجام دیتی ہے - اس حصول کے وقت اس کا نعرہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں اگر کوئی قومی زبان ہوگی تو صرف اردو ہوگی - پھر کیا بات ہے کہ انیس سال گزرنے کے بعد بھی اردو زبان کی قسمت میں امروز نہیں ، بلکہ وہ بدستور فردا کی منتظر ہے - بے شک آپ اس کی مختلف تعبیریں اور تاویلیں کر لیں - مگر خامی وہی ہے جو سید صاحب کی نگاہ نے دیکھی ہے ، یعنی عزم کا فقدان - اگر اردو کو بھی مولوی عبدالحق مرحوم کے بعد سید صاحب اور ان کے چند رفقائے کار کی طرح خاصی تعداد میں صاحبان عزم و ہمت ملے ہوتے تو اردو کب کی قومی زبان بن چکی ہوتی ، کیوں کہ یہ حصول پاکستان سے مشکل کام نہیں ، جسے ہم نے عزم و ہمت سے حاصل کیا تھا - بے شک اردو زبان سے محبت کا دعویٰ رکھنے والوں کی کمی نہیں - وہ اردو زبان کے حق میں

صدائیں بھی بلند کرتے ھیں مگر ان کی نواؤں میں ان کے جگر کا لہو شامل نہیں ھوتا - اردو کا گن گاتے ھیں تو کیا ھوا روٹی تو انگریزی کی کھاتے ھیں - اردو زبان کے اونچے درجے کے انشا پردازوں، مصنفوں، محققوں اور نقادوں کی بھی ایک بڑی تعداد ھے - وہ اردو کے حق میں لکھتے بھی ھیں - مگر ان نقوش میں ان کے خون جگر کی آمیزش نہیں ھوتی :

نقش ھیں سب نا تمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ھے سودائے خام خون جگر کے بغیر

جب تک اردو کو قومی اور دفتری زبان اور ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے ھم میں خلوص نہیں ھے، عزم نہیں ھے، عمل نہیں ھے، تو ھماری صدائیں بے ھنگم شور وغوغا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں - ھماری یہ ھنگامہ آرائیاں اور محفل سازیاں بے معنی ھیں - ھماری یہ تقریریں اور مقالات بے اثر - اس ضمن میں ایک بات یاد آگئی جس کا عرض کرنا یقیناً بے محل نہ ھوگا - گذشتہ برس کی بات ھے کہ ایک جلسے میں ایک شعلہ نوا مقرر ''اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے'' کے حق میں زمین و آسماں کے قلابے ملا رھے تھے - تقریر بڑی ھی جامع اور مدلل تھی - الفاظ شستہ اور جچے تلے تھے - وہ ان سکولوں کو ھدف سخن بنا رھے تھے جن میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ھے - لیکن حسن بیان، طرز ادا، تقریر کی لطافت، نفاست اور ان کی مرنجاں مرنج شخصیت کوئی چیز بھی مجھے متأثر نہیں کر رھی تھی - کیونکہ میں جانتا تھا کہ جناب بیرسٹر جو انگریزی کی روٹی کھاتے ھیں، ان کے در فرزندان ارجمند سی - ایس - پی بننے کے لیے برن ھال میں زیر تعلیم ھیں - ان ھی بے ضمیریوں کا تجزیہ سید صاحب نے ان الفاظ میں کیا ھے :

''انگریزی کی اس بالا دستی کو قائم رکھنے کے لیے اھل تدبیر بہت کچھ کر رھے ھیں - ایک بڑی تدبیر یہ ھے کہ یورپین طرز کے سکولوں کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنایا جائے تا کہ لوگ اولاد کے مستقبل کو خطرے میں دیکھ کر لالچ میں آ جائیں اور امیر لوگوں کے مدرسوں میں، جو پبلک سکولوں کے نام سے روز بروز

بڑھ رہے ہیں، اپنے بچوں کو بھیج کر انگریزی ذریعۂ تعلیم خود بخود اختیار کرتے جائیں اور ذہناً انگریزی زدہ ہو کر آگے چل کر انگریزی کے محافظ اور پاسبان بن جائیں۔
یہ تدبیر واقعی کارگر ہے۔ اولاد کی محبت واقعی بڑی سخت چیز ہے۔ بڑے بڑے شیر دل یہاں پہنچ کر جی چھوڑ دیتے ہیں۔ واقعی مسئلہ اولاد کے مستقبل کا ہے اور نازک ہے۔ مگر اہل تدبیر کی ایک اور چال اس سے بھی گہری ہے اور وہ یہ ہے کہ گھروں کے قلعے مسخر کر لو۔ یعنی عورتوں کو زیادہ سے زیادہ انگریزی زدہ اور مغرب زدہ بنا لو۔ بس اس کے بعد پاکستان کے بڑے بڑے بہادروں اور شیر دلوں کی مردانگی خود بخود دم دبا کر بھاگ جائے گی اور میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کے دین اور ان کی تہذیب کے اس مضبوط قلعے پر زور کا حملہ ہو بھی چکا ہے اور شاید ہم آپ بے خبر ہوں گے مگر یہ واقعہ ہے کہ اس قلعے میں ہزار جگہ سے شگاف پڑ چکے ہیں چنانچہ اب ہماری تعلیم یافتہ عورتیں مغربی تہذیب اور انگریزی زبان کی سب سے بڑی داعی اور نقیب ہیں، اور زمانہ چونکہ ڈر اور خوف کا ہے اس لیے ہم میں سے کوئی بھی ایسا جگر دار نہیں جو اس داخلی حملے کی تاب لا سکے:

اکبر دبے نہیں کسی سلطان کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے"

وائے بر حال ع

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

تو حضرات ہم میں سے اکثریت کا یہی حال ہے کہ ہمارے دعووں میں اخلاص نہیں۔ عزم راسخ نہیں جو حصول مقصد کے لیے ضروری ہوتا ہے اور اردو زبان کو قومی زبان بنانے کے لیے جو سید صاحب ہم سے چاہتے ہیں۔ اب تو مقصد کے حصول میں وہ رکاوٹیں نہیں رہیں۔ یہ ایک تو سید صاحب اور ان کے رفقائے کار کی کوششوں کا نتیجہ ہے، دوسرے انقلابی حکومت خود اردو کی ترقی و ترویج میں معاون ہے، اور وہ صدق دل سے چاہتی ہے کہ اردو زبان کے راستے کی تمام

مشکلات جلد حل ہو جائیں تاکہ وہ قومی زبان بن سکے ۔ بلکہ حکومت کے ذمے جو فرض عائد ہوتا تھا ۔ وہ اس نے پورا کر دیا ۔ ایسی کمیٹیاں قائم کر دیں جن کا کام اردو زبان کو ہر ممکن ترقی دینا ہے ۔ اب اردو زبان سے محبت رکھنے والوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اردو کی کھیتی کو سینچ کر قابل کاشت بنائیں :

موسم اچھا ، پانی وافر ، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دھقان

اردو کے لیے ہم نے جو کچھ کرنا ہے وہ سید صاحب کے الفاظ میں یہ ہے :

''اس وقت اردو کے سلسلے میں اہم سوال یہ نہیں کہ اس کو ملک میں رائج کس طرح کیا جائے—رائج تو وہ زبان کی جاتی ہے جو پہلے سے موجود نہ ہو ۔ اردو تو یہاں کی زبان ہے اور ملک میں رچی بسی ہوئی ہے ۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس عوامی جمہوری قومی زبان کو اس کا وہ حق کس طرح دلایا جائے جو انگریزی نے چھین رکھا ہے ۔ اور جب میں یہ کہہ رہا ہوں تو مجھے بعض لوگوں کا یہ مغالطہ یاد آ رہا ہے کہ ہم لوگ انگریزی کا مقاطعہ کرنا چاہتے ہیں ۔ میں ہر خاص و عام کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ سراسر بہتان ہے ۔ ہمارا موقف فقط یہ ہے کہ قومی معاملات میں ، سرکار دربار میں اور تعلیم اور تربیت میں انگریزی کی بالادستی کو ختم کیا جائے ۔ اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہم انگریزی پڑھنے پڑھانے کے مخالف ہیں ۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ انگریزی ہمارے لیے جہاں جہاں مفید اور ضروری ہے اسے باقی رکھا جائے مگر سرکاری زبان کی حیثیت سے اس کی بالادستی ہمیں ایک دن کے لیے بھی گوارا نہیں ہو سکتی ۔''

اسی ضمن میں پھر فرمایا :

''حکومت سے مطالبہ کرنے سے پہلے ، ہمیں یہ ضرور ثابت کرنا ہوگا کہ اردو کے بارے میں ہم جو کچھ کہتے ہیں ۔ دل سے کہتے ہیں ۔ اگر ہم سچ مچ یہ سب کچھ دل سے کہہ رہے ہیں تو یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اردو کی جمہوری حیثیت کا اعتراف نجی

دائرے میں اپنے طرز عمل سے کیا جائے—، نجی دائرے میں آپ کی کارکردگی سے حکومت ضرور متاثر ہوگی—حکومت ہماری ہے اور ہم حکومت کے ہیں ۔ کسی ملکی حکومت کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ جمہور کے اعتقادات سے متاثر نہ ہو ۔"

سید صاحب نے منزل کی نشاندہی کر دی ہے ، تو پھر دیر کیا ہے ۔ آئیے آج یوم تجدید عزم کے دن اس عزم کی تجدید کریں کہ ہم اردو زبان کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے اس امام عشق و جنوں یعنی سید عبداللہ صاحب کے نہ صرف نقش قدم پر چلیں گے ۔ بلکہ شانہ بشانہ ان کے ساتھ آگے بڑھیں گے ۔ اور یہی ان کی علمی و ادبی کاوشوں کا صحیح اعتراف ہے ۔

میں آخر میں مجلس ارادت مندان سید کے معتمد جناب ممتاز منگلوری کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ سید صاحب قبلہ کی خدمات جلیلہ کے اعتراف کے لیے جو پروگرام بھی مرتب کریں گے ، ہمیں اپنا موید پائیں گے ۔

---

۵ اپریل ۱۹۶۶ء کو ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی ساٹھویں سالگرہ کے سلسلے میں ایبٹ آباد کی انجمنوں نے بھی یوم تجدید عزم منایا ۔ یہ مقالہ ایبٹ آباد کی اسی تقریب میں پڑھا گیا ۔

نعیم صدیقی

سید عبداللہ اور اسلامی ادب

مقالہ برائے '' یوم تجدید عزم ''

آج کے '' یوم عزم نو '' کو ڈاکٹر سید عبداللہ کے پیکر عزم سے جو مناسبت ہے ، اس کے پیش نظر میں نے یہ عزم استوار کیا کہ اپنا مقالہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بہ طور تحفۂ سالگرہ پیش کروں ۔

میں خلوص دل کے ساتھ اپنا یہ اعتراف اس شائستہ مجلس کے روبرو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے ملی کہکشان رجال کے گنے چنے درخشاں ستاروں میں سے ایک ہیں ۔ کتنے ہی ستارے ڈوبے ، کتنے ہی ستارے ٹوٹے ، اور کتنے ہی ستارے بجھ بجھا گئے ، اب جو باقی ہیں بہت تھوڑے ہیں اور ان تھوڑوں میں سے ایک ڈاکٹر صاحب ہیں ۔

میں کہ قصیدہ خوانی کے ہنر میں سخت کوتاہ رہا ہوں ، آسانی سے کسی شخص کو بڑا آدمی تسلیم نہیں کر سکتا ، چاہے اس کے گرد شہرت کا کتنا ہی بڑا ہالہ کیوں نہ ہو ۔ اس معاشرے کی تمثیل گاہ میں بڑے مغالطہ انگیز بہروپ رائج ہیں :

پستیاں ہیں بلند بام بہت\
دیکھے ہیں پردہ ہائے نام بہت

مجھے ہمیشہ جھونپڑوں سے لے کر محلوں تک ، اور مدرسوں سے لے کر کھیتوں تک ایسے انسانوں کی تلاش رہی ہے جو زندگی سے ایک مقدس فریضے کی طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں اور اپنے جادہ ہائے تگ و تاز کو کسی محبوب مشن کے فانوس سے روشن کرتے ہیں ۔ رہے وہ لوگ جو محض اپنے جسم کے قلی ہوتے ہیں اور خواہشوں کے انبار کندھوں پر

لادے روپے اور شہرت کی تلاش میں قاش فروش دل صد پارہ بنے دربدر مارے مارے پھرتے ھیں - میں نے ھمیشہ انھیں کیڑوں مکوڑوں کی مانند محسوس کیا ھے جن کی ذرا جسامت بڑی واقع ھوتی ھے، خصوصاً معلمی کی مسند پر جب کبھی کسی بندہٗ مفاد کو بیٹھے دیکھا ھے——واضح رھے کہ ادب بھی معلمی کا ایک شعبہ ھے——تو دل بےاختیار پکار اٹھا کہ ع

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

کیا یہ سچ نہیں کہ آج جب کہ بے لوث خدمت کے بازار سرد پڑ چکے ھیں - ھمارے روبرو مفاد کی ایک منڈی چاروں طرف پھیلی ھوئی ھے جہاں خوشامد اور خیانت کے سکوں سے بڑی سے بڑی عظمتیں خریدی جا سکتی ھیں ، فضیلت کی اعلیٰ سے اعلیٰ عبا کسی پیکر جہل کے قامت پر راست آ سکتی ھے اور جاہ و جلال کی اونچی سے اونچی مسند پستیٔ کردار کے حوالے ھو سکتی ھے - اور ایسا ایسا خود فروش یہاں پڑا ھے کہ چھوٹی سی نوکری ، ذرا سی ترقی ، معمولی سے کاروبار کے لیے ایمان اصول ، ضمیر اور خود داری کا خزانہٗ عامرہ لٹا دینے کے لیے بخوشی تیار ھے ، اور پھر سمجھے گا کہ سودا بڑا سستا ھوا - ڈاکٹر صاحب نے اس منڈی میں اپنا سودا کرنے سے اجتناب کر کے درویشانہ شخصیت کو انمول بنا دیا ھے - وہ بساط زر و جاہ پر اپنی خوشی سے کھیل ھار گئے مگر دوسری طرف رزم گاہ خودی میں بازی مار لے گئے - ڈاکٹر صاحب ان رجال عظیم میں سے ھیں جنھوں نے دین و سیاست سے لے کر ادب و تعلیم تک سارا کھیل خلوص اور شرافت سے کھیلا - وہ نصف صدی سے تاریخ کے ساتھ ساتھ بڑے نشیب و فراز سے گزرتے ھوئے چلے آ رھے ھیں اور ان کے بے شمار نقوش قدم تاریخ کے عنوان بن گئے ھیں - زمانے نے ان کے سامنے جدت کے ھزار شعبدے دکھائے مگر سید صاحب ان مغتنم روزگار بزرگوں میں سے ھیں جنھوں نے اپنے عقیدوں ، اپنی قدروں اور اپنی روایات کو سینے سے لگائے رکھا - - - - - - - - - - - اور اپنی خودی کے چمنستانوں کی آبیاری جگر لخت لخت کے اس مسلسل رستے لہو سے کی جو ھر صاحب دل کی پلکوں سے تارے بن بن کر ٹپکتا ھے - جی ھاں سید صاحب نے اپنے ملی سرمایہٗ تہذیب کو یوں سینت

سینت کے رکھا کہ :

دابے رہے پروں سے نشیمن کو رات بھر
کیا کیا چلی ہیں تند ہوائیں تمام رات

اور اس صاحب دل نے خودی کے نشیمن ہی کا بچاؤ نہیں کیا بلکہ آندھیوں میں اپنی محبوب قدروں کے دیے جلائے رکھنے کے لیے بھی بڑی تگ و تاز کی ہے :

ہوا ہے گو تندو تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو بخشے ہیں حق نے انداز خسروانہ

چراغ بھی جلائے اور جدھر رخ کیا نئے عزائم کے پھول بھی کھلائے :

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل ، اور گل سے گلستاں بنتا گیا

علم کے چراغ جلانے اور ادب کے پھول کھلانے کا کام اُس معاشرے میں جہاں خوف نے اپنی منحوس پرچھائیاں پھیلا رکھی ہوں ، جہاں سازشوں کی بیلیں چاروں طرف محیط ہو رہی ہوں ، جہاں اعلیٰ سے اعلیٰ ادارات فتنوں کی جولانگاہ بن گئے ہوں اور جہاں ہر فرد دوسرے کے لیے کینہ و حسد کے دشنہ ہائے پنہاں آستین میں لیے پھرتا ہو ، سوائے ارباب عزیمت کے اور کسی کے بس کا روگ نہیں - وہ ارباب عزیمت جو اپنے مشن کو اپنی دنیا بنا لیتے ہیں اور گرد و پیش کی ساری پرہنگامہ دنیاؤں کو شان تغافل و بے نیازی کے سمندر میں ڈبو کر خود اس کے درمیان ایک جزیرہ بن جاتے ہیں جس کے آستانۂ ساحل پر بڑی سے بڑی موج حوادث سجدہ گزار کر ادب سے ہٹ جاتی ہے - ڈاکٹر صاحب وہ جزیرۂ عزم ہیں جس پر ایک جہان شوق تعمیر ہو چکا ہے - جو قوم کے لیے غلام محمد بیراج اور منگلا ڈیم سے ہزار گنا زیادہ قیمتی ہے — اور ہمارا یہ مہندس کہن سال اور معمار جواں ہمت آج بھی وقت کے لمحات کی اینٹیں چننے میں اتنا مصروف

ہے کہ اس کے پاس رائج الوقت مشغلوں کے لیے فراغت ناپید ہے :

بخویش محو چناں گشتہ‌ام کو جلوۂ دوست
جہاں گرفت و مرا فرصت تماشا نیست

ڈاکٹر صاحب کو خدا طول حیات دے مگر اُن کا عرض حیات اور عمیق حیات کتنے بھی طول حیات کے مقابلے میں زیادہ ہی رہے گا ۔ تاہم ان کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر ان کے شاگردان رشید نے یوم عزم منانے کا فیصلہ کیا تو ممتاز منگلوری صاحب اور میرزا ادیب نے مجھے بھی اس تقریب میں اپنا ناچیز حصہ ادا کرنے کی دعوت دی اور مجھ میں ڈاکٹر صاحب کے شاگردوں کے ذہن رسا نے یہ احساس دلا کے تحریک پیدا کر دی کہ انھوں نے مجھے ٹھیک سمجھا ۔ ہر چند کہ میں نے اورینٹل کالج میں کبھی داخلہ نہیں لیا مگر ایک ایسا طالب علم ضرور ہوں جس نے ڈاکٹر سید عبداللہ سے غائبانہ استفادہ کیا ہے ظاہر ہے کہ اس موقع پر میرے لیے ایک اشارہ کافی تھا :

یک بانگ ذوق گرمئی مارا کفایت است
حاجت بہ تازیانہ نہ دارد ادیب ما

ساقی کی اک نگاہ کی شہ پا کے پی جانے والوں کی کیا پوچھتے ہو ۔ بلبل کو گلشن تک لے جانے کے لیے نہ کسی قاصد کی ضرورت ہے ، نہ ہاتھ پکڑ کے لے جانے والے کسی رہبر کی حاجت ، بلکہ ع

من بلبلم کہ نکہت گل رہبر من است

مگر اب تک حیرت میں ہوں کہ مجھ ایسے گم‌نام اور محفل گریز آدمی کی طرف ممتاز منگلوری اور میرزا ادیب کی توجہ کیسے گئی :

بلا مقام مرا پیش ازیں نمی دانست
غم تو کرد دریں شہر روشناس مرا

اور پھر یہ عجیب توارد ہوا کہ ایک گرامی نامہ ڈاکٹر صاحب کا بھی آ پہنچا ۔ یک نشد دو شد ۔ مگر اُستاد شاگرد دونوں کو شاید شروع میں پتہ نہ تھا کہ دونوں نے الگ الگ ناوک مجھ ایک ہی صید نحیف پر پھینکے ہیں ۔ شاگرد نے چاہا کہ اُن کے اُستاد کو موضوع فکر بناؤں ، اور اُستاد نے لکھا کہ خبردار جو میرے تذکرے

کا ایک جملہ بھی کوئی لکھے ، بس اسلامی ادب پر مقالہ لکھو ۔ اسلامی ادب پر تو خیر مقالے لکھے ھی جائیں گے ، خود آپ پر کیوں نہ کچھ کہا یا لکھا جائے :

کہتے ہو خیر چاہو تو کہنا نہ اب حسیں
مجھ کو یہ دو جواب کہ تم کیوں حسیں ہوئے

صاحب ! آپ نے زندگی میں ایسے کام کیوں کیے تھے کہ جس کی وجہ سے آپ موضوع سخن بن گئے ۔ اب چپ بیٹھے سنیے ۔ ھاں تو میں نے جب سید عبداللہ پر کاوش شروع کی تو ان کا دامن تھامے اسلامی ادب سامنے آ کھڑا ھوا ۔ اور اسلامی ادب پر دماغ کو مرتکز کیا تو انکشاف ھوا کہ اس پردہ زنگاری کے پیچھے بھی ڈاکٹر سید عبداللہ موجود ھیں ۔ آخر دونوں باھم پیوستہ موضوعات کو لے لیا ۔ امید ہے کہ استاد شاگرد دونوں کی بات رہ جائے گی ۔

آپ نے تو مجھ سے زیادہ اس زندہ مینار عظمت کو دیکھا ھو گا بلکہ اس کے نزدیک اس کے سائے میں بیٹھ کر اور اس متحرک مینار کے ساتھ چل کر لطف قرب اٹھایا ھوگا میرا دیکھنا تو کچھ ایسا ھی تھا کہ :

میں تو جھک کے دور ھی دور سے
تجھے دیکھتا ھوں غرور سے

میں سید صاحب کو دور ھی دور سے کئی برس سے دیکھ رھا ھوں ۔ میں نے انھیں طلبہ کے ساغر ھائے تشنگی میں مئے علم انڈیلتے دیکھا ، علمی و ادبی اداروں کی رھنمائی کرتے دیکھا ، مدعو مہمانوں سے لیکچر دلواتے دیکھا ۔ انعامات تقسیم کرتے اور چار ھزار طلبہ کو امدادی مواد بہم پہنچاتے دیکھا ، عربی ، فارسی اور دوسری مشرقی زبانوں کی وکالت کرتے دیکھا ، ادب کے چمن سنوارتے دیکھا ، فن سیرت و سوانح کے سنگ میل نصب کرتے دیکھا ، اردو کو تدریسی اور دفتری زبان منوانے کے لیے میں نے اس پیکر تصویر کو کاغذی پیرھن میں مال روڈ پر مارچ کرتے اور صحیح معنوں میں اردو کا فریادی بنتے دیکھا ، غریب مدرسین کی کم تنخواھوں کا رونا روتے دیکھا — اور بالآخر وہ دن بھی آیا کہ میں نے انھیں کاغذ کے چند پرزوں کی شکل میں اپنے ریزہ ھائے قلب و

جگر سمیٹ سمٹ کر چپکے سے اپنے محبوب دارالتعلیم سے سدھارتے دیکھا ، اور تلخ احساسات کے سمندر جذب کر جانے والے اس پیکر سکوت کے ساز جراحت ھائے پنہاں کو سیارہ کے لیے انٹرویو لینے والے ایک دوست کے ناخن کاویدگی پسند نے چھیڑ کر یہ نوائے سوختہ در گلو بھی سنوا دی کہ

''میں نے جس ذہنی اور روحانی تکلیف سے اپنے کالج کو چھوڑا : اس کا اندازہ بےدردوں کے شہر کے باسی نہیں لگا سکتے - اور اب ان بےدردوں سے مجھے کلام کی ضرورت بھی نہیں''

اس فقرے کو پڑھتے ھی یہ شعر ذہن میں گونج گیا کہ :

لائے بجا جو خدمت گلزار بس میں تھی
مثل نسیم جھاڑ کے داماں گزر گئے

اور فانی کے ساز کا یہ نغمہ بھی تازہ ہو گیا کہ :

دیکھا نہ آنکھ اٹھا کے کبھی اهل درد نے
دنیا گزر گئی غم دنیا لیے ھوئے

فیض نے لاھور کو روشنیوں کا شہر کہا تھا اور بجا ھی کہا تھا مگر یہاں کی روشنیاں جو اندھیروں کی تخت گاہ کے لیے شہر پناہ بنی ہوئی ھیں ، اور جن سے مہر و ماہ نے بھی شکست کھا کر باجگزاری قبول کر لی ھے انھیں سید صاحب ھی کی نظر بھانپ سکی - انھوں نے لاھور کو بے دردوں کا شہر کہہ کر محض خوبصورت بات ھی نہیں ایک ایسی سچی بات کہی ھے کہ تمام روشنیاں پانی پانی ھو گئی ھوں گی ، اور جیتے جاگتے اندھیرے منہ لٹکائے سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے ھمدردی کر رھے ھوں گے - لیکن یہ شاھانہ جلال رکھنے والے اندھیرے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے ھوں گے ، ایک فاش گو مرد درویش کو کریں بھی کیا :

تاج و علم ھی پاس ھے اپنے نہ ملک و مال
ھم سے خلاف ھو کے کرے گا زمانہ کیا

محترم اهل مجلس ! بقول ڈاکٹر صاحب طول کلام عاشقانہ عادت ھے اور مجھے ڈر ھے کہ جناب کلیم کی یہ عادت مجھے مدعا سے دور نہ لے جائے -

یوم عزم نو کے لیے ڈاکٹر صاحب کے شاگردان رشید کا ارشاد تھا کہ موصوف کی شخصیت پر کچھ لکھوں ، مگر بعد میں ڈاکٹر صاحب کی خواہش یہ معلوم ہوئی کہ وہ اسلامی ادب پر میرا کچھ لکھنا پسند کریں گے - میں نے ان دونوں تقاضوں کو ایک ہی عنوان کے تحت جمع کر دیا ع

ملا دیے ہیں نوا میں دل و جگر میں نے

یعنی میں نے موضوع تجویز کیا " ڈاکٹر سید عبداللہ اور اسلامی ادب -" اسلامی ادب کی کہانی یوں ہے کہ ۱۹۴۵ء کا دور تھا جب اول اول منصورانہ طرز کی موج لذت جنوں میرے اندر اٹھی اور میں نے وقت کے دھارے کے خلاف کچھ جنبشیں کیں - یہ جنبشیں "ذہنی زلزلے" بن گئیں اور ان ذہنی زلزلوں کو جلو میں لیے اسلامی ادب کا نظریہ کچھ ویسے ہی انداز سے نمودار ہوا جیسے وہ کوئی نعرۂ اناالحق ہو - اس زمانے میں ترقی پسندی کا چرچا کچھ نقارخانے کے زور شور سے ہو رہا تھا - میری طوطیانہ آواز محسوس نہ ہو سکی - تقسیم برصغیر کے بعد جب اس نقارخانے کی لے کچھ دھیمی پڑی اور اکا دکا تیز سماعت اصحاب نے اسے سن لیا اور یہ گمان کیا کہ کسی نئی دوکان کا سائن بورڈ لگ رہا ہے ، تو انھوں نے پہلے تو اس کے توڑ کے لیے بے اعتنائی ہی کو کافی سمجھا ، پھر بغیر سمجھے بوجھے اسے طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا گیا ، پھر مجھے بالکل درکنار رکھ کر کچھ اصحاب نے بالا ہی بالا ایسی بحثیں اٹھائیں کہ اسلامی ادب کا نظریہ ایک چیستان سی بن گیا - آخری کارروائی یہ کی گئی کہ اسلامی ادب کے نظریئے سمیت میرے پورے ادبی وجود کو چپکے سے صلیب تغافل پر لٹکا دیا گیا - میرے مقالات گم ، شاعری گم ، افسانے گم ، تصانیف گم ، تنقیدی تحریریں گم ، رسائل اور ان کے خاص نمبر گم —جی ہاں ، میرا چوتھائی صدی پر پھیلا ہوا پورا ادبی وجود مقبول عام ادبی جرائد سے گم ، ادبی محفلوں ، ادبی تذکروں سے گم ، انتخابی مجموعوں سے گم ، تنقیدی بحثوں سے گم ، اور حالیہ چند استثنائی دنوں کو چھوڑ کر ریڈیو سے گم !! :

هم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

آپ کے اس یوم عزم نو کی قسم ! اس سلوک کا مجھ پر کوئی حوصلہ شکن اثر اس لیے نہیں ہوا کہ یہاں یہ سلوک مجھی سے نہیں ہوا ۔ یاروں نے تو خدا ہی کے وجود کو غائب کر دیا ہے ، خود اسلام ہی کو دنیائے ادب سے ملک بدر کر ڈالا ۔ تو نعیم صدیقی کیا چیز ہے کہ اسے نگاہوں سے گم کر دینا مشکل ہو ۔

مگر جن قوانین و نوامیس پر خدا نے یہ دنیا بنائی آن پر مجھے پورا پورا بھروسہ تھا اور ہے کہ جس کام کے لیے میں نے صدہا راتوں کی نیندیں حرام کی ہیں ، جس کے لیے میں نے اپنے ذوق تفریح کا خون کیا ہے ، جس کے لیے میں نے باھمہ رھنے کا لطف بے پایاں گنوایا ہے ، جس کے لیے میں نے مفاد کی بے شمار راہیں خود اپنے لیے مسدود کی ہیں اور جس کے لیے میں نے صحت کی قربانی دی ہے وہ ضائع نہیں جا سکتا ۔ میں اپنے اونچے برج گمنامی میں بیٹھا تشہیر باھمی کے مصنوعی ڈرامے دیکھتا رہا ہوں کہ میرے کام میں اگر زندگی کا کارآمد جوہر موجود ہے تو میں اسے ہوا کے جھونکوں میں اڑا کر اور بیابانوں میں بکھیر کر بھی مطمئن ہوں کہ یہ ایک تخم نمو طلب کی طرح جہاں پہنچے گا ، زمین میں جڑیں اتار کر فضا میں شاخیں پھیلا لے گا ۔ اس تخم نمو طلب پر اگر کوئی سل آ لدے گی تو اس کی کونپلیں اس کے نیچے ہی نیچے رینگتی ہوئی بالآخر کھلی فضا میں سر ابھار لیں گی ، اور ایک دن آن پر قبولیت عام کے کھلے ہوئے گلہائے حسن و جمال نگاہوں سے اپنا خراج خود وصول کر لیں گے ۔ بہ حیثیت خادم حق میرا ایمان یہ ہے کہ :

حسن و صداقت و ہنر جاتے نہیں رائگاں

یوں در حقیقت اسلامی ادب کوئی نیا شگوفہ نہ تھا ۔ دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں قرآن کے الہامی ادب کے زیر اثر حسان بن ثابت اور کعب بن زہیر جیسے شعراء اور حضرت علی اور حضرت عمر جیسے خطیبوں سے اس کا سلسلہ چلا اور پھر عرب کے بعد عجم اور عجم کے بعد سر زمین ہند میں نشو و نما پاتا رہا ۔ آج جو اردو ادب کا ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہے اس میں بعض دوسرے عناصر کے ساتھ آمیز ہو کر اسلامی تہذیب و ثقافت کی قدریں رچی بسی ہیں ۔ خصوصاً دور جدید میں اصغر گونڈوی ، اکبر ، محمد علی جوہر ، حالی ،

ظفر علی خاں اور اقبال نے نظم میں اور شبلی ، مولوی نذیر احمد ، راشدالخیری ، مولانا آزاد اور دوسرے اصحاب نے نثر میں اسلامی ادب کی راهوں کو اور زیادہ اجاگر کر دیا ۔ آج ان راهوں پر نئے لکھنے والوں کے قافلے رواں دواں هیں ۔ یعنی هم اسلامی ادب کے وسیع سرمایۂ ماضی کو زاد راہ بنا کر زمانۂ حال کے نئے تقاضوں کے مطابق ذرا آگے کا کام کرنے چلے تھے یہ کوئی خارج از آهنگ نئی بات نہ تھی ۔

لم اکن اول من سن الهوی
فدع اللوم فذا داء قدیم

کہنے والا کہتا ہے کہ میں وہ پہلا گنہ گار نہیں هوں جس نے محبت کی ریت کا آغاز کیا ہے پس آج اگر اس پر زجر و توبیخ کی جا رهی ہے تو اس کی پروا نہ کرو کہ یہ بڑی پرانی بیماری ہے ۔ محبت بھی همیشہ کی جاتی رهی ہے اور اس پر ملامت کا سلسلہ بھی همیشہ جاری رها ہے ۔

معافی چاهتا هوں کہ ڈاکٹر صاحب کا ذکر چھیڑتے چھیڑتے میں خود بیچ میں آ حائل هوا ۔

بہتر کہ از حکایت ما در کشی نفس
دل خوں شود زغصۂ کار مہیب ما

کہنا یہ تھا کہ آج اقبال کی بنائی هوئی فضا میں اسلامی ادب کی تحریک اتنا گہرا اور وسیع کام کر چکی ہے کہ بہت سے اهل قلم جنهوں نے کبھی سوچا بھی نہ هوگا کہ ان کا کوئی علاقہ اسلام پسند مدرسۂ ادب سے کبھی هو سکتا ہے آج انهی تک کے قلم ، تعمیر پسند اسلامی ا ب کی نئی دنیائیں تعمیر کرنے میں مصروف هیں ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ هی کی مثال کو لیجیے ، انهوں نے اپنی ساری عمر اسلام پسندانہ ذهن سے سوچا اور لکھا ، مگر انهیں کبھی گمان بھی نہ گزرا هوگا کہ ان سے وهی گناہ مقدس سرزد هو رها ہے جسے هم چند سر پھرے سرمایۂ افتخار بنائے هوئے تھے ۔ بلکہ سچ پوچھیے تو هم دور هی دور سے دیکھ کر یہی محسوس کرتے تھے کہ آنجناب همارے ادبی گناہ مقدس کے امام هیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ هم عرصۂ کار زار میں هیں ، اور وہ مدرسہ کی چار دیواری میں ۔ اسی لیے همارے

ھاں نور کے ساتھ حرارت کا عنصر زیادہ ہے اور ڈاکٹر صاحب کی حرارت سے نور کا عنصر بڑھا ہوا ہے :

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ‌ھا رسوا شدیم

ھاں تو ، ہمارے ادبی گناہ کو ہمارے سیاسی گناہ نے دو آتشہ کیے رکھا - اور سیاست ہمارے ھاں گالی ہی نہیں ، ایک ایسی چھوت کی بیماری بنا دی گئی ہے کہ معاشرے کے اشراف ہمارے سائے سے بھاگتے ھیں ، اور ہم بھی دوسروں کے قریب جاتے ہوئے اس ڈر سے ڈرتے ھیں کہ کہیں بیچارے ڈر نہ جائیں - یعنی دوسروں پر رحم آتا ہے کہ کہیں سیاست کے ہول سے کسی کا ھارٹ نہ فیل ہو جائے - اسی لیے ہم اپنی نماز فن میں سید صاحب کو باقاعدہ عملاً امام نہ بنا سکے ، بلکہ امام غائب کی سی عقیدت سے کام چلایا - بہرحال ایک تو اسلامی ادب ، تس پر تحریک احیائے اسلام ، یعنی کریلا بھی اور نیم چڑھا بھی - بڑے بڑے تلخی پسندوں کا زہرہ آب ہوتا رہا -

آئیے ، اب ڈاکٹر صاحب کے اندر چھپے ہوئے اسلامی ادیب کو برآمد کریں - بقول خویش وہ ''اردو والا'' اور ''بدنام حد تک اردو والا'' ادب والا بھی ہے بلکہ نیک نامی کی حد تک اسلامی ادب والا بھی - ہم جب ان کی غم پسند شخصیت کے اندر اتر کر تخلیق کے چشمۂ حیواں کو تلاش کرتے ھیں تو ھمیں ان کے اندر محبت کا لازوال سوتا پھوٹتا ملتا ہے - ان کی یہ محبت ہمدردیٔ انسانیت کے روپ میں جلوہ گر ہونا چاہتی ہے - وہ شکاری ، فاختہ اور چیونٹی کی کہانی کو بار بار دھرا کر اس تمنا کا اظہار کرتے ھیں کہ کاش کہ وہ کسی مور ناتواں کے لیے سفینۂ برگ گل فراہم کر کے دے سکیں - اور دوسروں کو بھی اسی بات کی نصیحت کرتے ھیں - ڈاکٹر صاحب حساس ھیں ، غم پسند ھیں ، محبت کیش ھیں ، محبت کو ہر دکھ کا علاج سمجھتے ھیں - ہمدردیٔ انسانیت سے سرشار ھیں اور دوسروں کی فلاح چاہتے ھیں عجوبہ ہوگا ، اگر ایسا آدمی شاعر یا ادیب نہ ہو ، اور مزید عجوبہ ہوگا اگر وہ اسلام سے متعلق ہونے کے باوجود اپنے ادب کو اسلامی ادب بننے سے بچا سکے

جبکہ اسلامی ادب بہترین انسانی ادب بھی ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب ماحول کی کشمکش سے بھی دو چار ہیں ۔ اس میں انھیں مزاحمتیں مشکلیں بھی پیش آتی ہیں جنھیں وہ ''خود کلامی'' سے حل کرتے ہیں ۔ اور ان کا ایک سہارا بلکہ زندگی کا سب سے بڑا رفیق شعر ہے ، وہ شعر گنگنا کر اسے اپنے کاروان عزائم کے لیے حدی بنا لیتے ہیں ۔ اور جب سارے سہارے جواب دے جاتے ہیں تو دعا ان کے لیے سب سے بڑا آسمانی ندیم ثابت ہوتی ہے ۔ شعر اور دعا کا اجتماع یعنی تفریح اور فرض کی ترکیب ، یا دل اور دماغ کا رابطہ ۔

آئیے ذرا ان کے سر چشمۂ غم کی بھی ٹوہ لگائیں ۔ فرماتے ہیں ، چھٹی جماعت میں والدہ کا انتقال ہوگیا ـــ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طبیعت زندگی بھر محبت کی پیاسی رہی اور اندر کا زخم کبھی نہ بھر سکا ۔ سید صاحب کے اس زخم کا مجھ سے زیادہ لذت آشنا کون ہوگا ۔ جسے وہی حادثہ چوتھی جماعت میں پیش آگیا تھا ۔ اس شرکت زخم کا انکشاف شاید ہمارے رشتے کو اور گہرا کر دے ۔ شرکت یہی ایک نہیں ، مجھے آن سے کئی مشابہتیں ہیں ، جن کا انکشاف فی‌الحال مناسب نہیں ۔ فرق ایک ہے ، اور بہت بڑا فرق ۔ وہ ہے ان کی بزرگی اور میری خوردی کا !

اب ذرا آگے بڑھیے اور ان کی تمنائے ادب آفرینی کو دیکھیے ۔ سید صاحب کے یہ چند الفاظ تو شاید ہمارے گنتی کے سدا بہار ادب پاروں میں سے ایک کی تشکیل کرتے ہیں ۔ سنیے :ـــ

> ''کاش میں اپنی زندگی میں دس پندرہ سطریں ایسی لازوال
> لکھ جاؤں جو انسانی دکھ درد میں کسی مور ناتواں کے لیے
> سفینۂ برگ گل بن سکیں ۔ میں سیاہی کے ایک قطرے کا
> آرزو مند ہوں جو تحریر میں ڈھل کر مرہم بن جائے ۔''

میں کہتا ہوں کہ اگر سید صاحب ساری عمر میں گنتی کے یہی الفاظ لکھ سکے ہوتے تو یہ حرم ادب کے سبعہ معلقہ میں شامل ہوتے ۔ ان الفاظ کی جگہ کوئی شخص لعل و جواہر سمیٹ کے ہمارے سامنے لا سکتا ہے مگر وہ جذبۂ عظیم ، وہ احساس عمیق اور وہ تمنائے جلیل کہاں سے لائے گا جو سید صاحب کے اس زخم پنہاں کی آغوش کے پروردہ ہیں جو انھیں چھٹی جماعت میں لگا تھا ؟ اور کوئی بتائے کہ

کیوں یہ اسلامی ادب پارہ نہیں ہے ؟

دنیا کا ہر بڑا صاحب فن اور ہر اونچا ادیب یہی بنیادی تمنا رکھتا ہے کہ کاش کہ وہ اپنی روح کے حسن کا ایک بار پورا پورا انعکاس کر سکے - اس تحریک سے وہ کوئی چیز بناتا ہے ، مگر اسے ناتمام محسوس کرتا ہے ، پھر بناتا ہے ، پھر مطمئن نہیں ہوتا - ابھی وہ بات نہیں بنی ، ابھی نہیں بنی کا یہی سلسلہ ساری عمر جاری رہتا ہے ، یہاں تک کہ فن پاروں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں - آرزوئے نا تمام ہی ادب کی جان ہے - ویسی ہی ایک حسرت درماندہ جسے شاعر نے یوں محسوس کیا کہ :

نہ پوچھ حسرت درماندہ کی پشیمانی
ثواب مل نہ سکا اور گناہ کر نہ سکے

ڈاکٹر صاحب کی تمنائے اظہار کھو کھلی تمنا نہیں ہے بلکہ اُن کے ذہن میں ایک بہتر دنیا یا بہتر معاشرے کا خاکہ اور ایک ''انسان مطلوب'' کا ہیولیٰ موجود ہے - ان کی ادبی غایت محض اپنے ذاتی احساسات کی عکاسی نہیں ہے ، کوئی سرمایۂ روماں وہ دنیا کو نہیں دینا چاہتے ، ذہنی تفریح کے کھلونوں کا کوئی کارخانہ اُن کے وطن میں نہیں ہے ، وہ شعور و لا شعور کی رسہ کشی سے دو چار نہیں ہیں ، وہ ایسی تعمیری و اصلاحی تبدیلیوں کا پیغام اپنے سینے میں رکھتے ہیں جو معاشرے کو فلاح کی طرف لے جا سکیں - وہ ایسی ''با سلیقہ زندگی'' کی طرف بلاتے ہیں جہاں زندگی ''آرٹ کی لطافت کی سطح پر'' آجائے ، وہ حسن و جمال سے آراستہ ہو ''کلچر میں پیارے پن کا انداز'' پیدا ہو ، ''داخلی طہارت'' اور ''نظر کی شرافت'' کے ساتھ ایسی ''ضمیر داری'' کار فرما ہو جو دریائے حسن کی ایک موج بے تاب بن جائے ، لوگ ضمیر کے حسن کی ضرورت کو سمجھنے لگیں - ڈاکٹر صاحب اپنے جہان آرزو میں ''سکون و وقار کی کمی'' ''خفیف الحر کتی'' اور ''شہری بے ادبیاں'' ہرگز نہیں دیکھنا چاہتے - ان کی نگاہ میں ''اخلاق کھردرا پن'' غرض براری ، ملمع سازی ، کج روی ، اکڑ اور تناؤ انسانیت کے وہ روگ ہیں جن سے وہ اپنے انسان مطلوب کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں - وہ اپنے جہان آرزو کو پاکستانی قومیت کے ایک

ایسے مکمل احساس کے زیر سایہ پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں جس کا ایک اصول اگر ''اس خطے کی محبت'' ہو تو دوسرا اصول ''اُن عقاید و روایات کی محبت'' ہو جن کے لیے پاکستان قائم ہوا ہے - وہ ایسا کلچر چاہتے ہیں جس کے تین عناصر میں سے بنیادی اور اولیں عنصر وہ ''ذوق روایات ہوں جو دینی عقاید کے زیر اثر ہیں'' دوسرے ملکی اور مقامی زندگی کے وہ عنصر جو اول الذکر سے مطابقت رکھتے ہیں - اور تیسرے مغربی تمدن سے اخذ کردہ وہ اچھے اجزا جو پہلے دونوں عناصر کے مطابق اور ہمارے اخلاق اور ذوق مزاج سے ہم آہنگ ہوں - وہ فطرت کے دستور ارتقا کے تحت تبدیلی کا راستہ کھلا رکھنا چاہتے ہیں مگر تبدیلی کو لازماً تدریجی ہونا چاہیے - ''تحفظ ما سبق'' کا داعیہ اس میں موجود رہے اور قوم کی ''اخلاق زندگی کا تسلسل'' برقرار رہے وہ ایک ہمہ گیر اور ہم آہنگ قومی تہذیب کے داعی ہیں -

پھر وہ ایسا انسان چاہتے ہیں جو جذبوں کو عقل کا رفیق بنا دے ، جو ایسی محبت سے سرشار ہو جو زیست کو بھر پور بنا کر دشواریوں میں آسانی کا رنگ بھر سکتی ہے اور وہ خدا آشنا انسان چاہتے ، کیونکہ ''جب انسان نپٹ مایوس ہو کر سوئی کے ناکے سے گزرنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو ایسے میں خدا کی ہستی کا احساس بڑا ہی مشکل کشا ثابت ہوتا ہے - جو لوگ اس کو نہیں مانتے ، گویا وہ خود کو نہیں مانتے -'' وہی بات ہے :

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

وہ اپنے انسان مطلوب کی تعریف یہ بھی کرتے ہیں کہ وہ اچھا پاکستانی ہو ، اچھا انسان ہو ، اچھا مسلمان ہو -

تقریباً ڈاکٹر صاحب ہی کے الفاظ و اصطلاحات میں میں نے اُن کے عالم افکار اور جہان آرزو کی جھلک آپ کے سامنے رکھ دی ہے - مجھے بتائیے کہ کیا زندگی کا یہ خاکہ اور انسان کا یہ ہیولیٰ پورے کا پورا اسلامی نہیں ہے اور اس سرمایۂ افکار و آرزو سے اپنے دل کو مالا مال کیے ہوئے جو شخص ادب طرازی کرے گا - وہ سوائے اسلامی ادب کے اور کیا نقوش خیال بنائے گا ؟

اور اگر ڈاکٹر صاحب کی ادبی شخصیت کی تصویر کھینچنے میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو ایک اقتباس سن لیجیے :

''پاکستان کی آبرو کا تقاضا یہ ہے کہ آپ قومی تہذیب کے اس رنگ کو ابھارنے کی کوشش کریں جس پر ملک کی ساکھ قائم ہے - یہی وہ تہذیب ہے جس کا بڑا وصف وہ جذبۂ مہر و محبت تھا جس پر میں خطبے کے آغاز میں زور دے چکا ہوں - یا کردار کی وہ ہمواری' جو زندگی کے رنج اور خوشی دونوں میں شرافتوں سے ہٹنے نہیں دیتی—یا وہ حیاداری جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''الحیاء خیر کلہ'' کہہ کراس کو تمام آداب کی جان قرار دیا تھا - زندگی کے اس دکھ ساگر میں جہاں انسانی آرزوؤں کی کشتی تیرتی کم اور ڈوبتی زیادہ ہے ، ہزاروں دکھی بستے ہیں - اس میں گاہے ایک میٹھا بول اور ایک مشفقانہ مسکراہٹ وہ کام کر سکتی ہے جو کسی پرانی کہانی میں ایک چھوٹے سے پتے نے ایک ڈوبتے ہوئے مور ناتواں سے کہا تھا - جس دن آپ یہ میٹھا بول بولنے پر یا اس مشفقانہ مسکراہٹ پر قادر ہو جائیں گے اس دن مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ اس ملک کی تہذیب اب خارجی آلائشوں سے داخلی طہارتوں کی طرف بڑھ رہی ہے -''

ابوبکر شبلی کے حوالے سے ایک مختصر فقرہ اور :

''انسانی دکھ پر جو اس دنیا میں ہر طرف بکھرا ہوا ہے ، کبھی کبھی نظر ڈال کر اس سے ہمدردی کرنے والا آدمی اس کھڑکی کے قریب پہنچ جاتا ہے جہاں خدا کی ذات بہ نفس نفیس جلوہ گر ہے - ''

کہیے اس طرز فکر کے ساتھ سوائے ایسے ادب کے اور کیا تخلیق کیا جا سکتا ہے کہ جسے اسلام کی بارگاہ میں سند قبولیت حاصل ہو ؟

سید صاحب بعض مشکلات کی وجہ سے کچھ عرصہ تک اسلامی ادب کی اصطلاح سے بہت گھبراتے رہے ہیں ، اس لیے انھوں نے اپنے لیے ایک مخصوص اصطلاح ''عظیم تر ادب'' کی وضع کی ہے - مگر اس اصطلاح کے پردے میں بات وہ وہی کہتے ہیں جو دوسرے بے شمار لوگ اسلامی ادب کے عنوان سے کہتے ہیں - کہیں وہ کہتے ہیں پاکستانی ادب کے

لیے ملک کے تہذیبی مزاج کا احترام ضروری ہے ، کہیں وہ انسانی جد و جہد میں خدا کی شرکت محسوس کراتے ہیں ، کہیں بتاتے ہیں کہ جب ہمارا تصور بلند ہو کر خدا کی ارفعیت کی نشاندھی کرتا ہے تو مسلمانی تہذیب اسی میں فرحت محسوس کرتی ہے کہیں وہ صراحت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی تفریحات اور طرح کی ہوتی ہیں اور دلچسپ یہ کہ اپنا سارا مصنوعی ذہنی اتقاء توڑ کر ایک جگہ ”بین الاقوامی اسلامی ادیبوں“ کا تذکرہ بھی فرما جاتے ہیں - بہر حال یہ جو کچھ سید صاحب نے نکات بیان کیے ہیں ، ان پر اسلامی ادب کے تمام علمبرداروں کی مجموعی تحریریں بھی کوئی ٹھوس اضافہ نہیں کر سکتیں -

ڈاکٹر صاحب کا ذہن ”اسلامی ادب“ کے سلسلے میں دو ایک باتوں میں الجھا ہے - ایک تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ادب اور خیال کسی خارجی مقصد کے دباؤ سے نہیں ، بلکہ اندر کی تحریک یعنی ایک بے نام عبودیت کے جذبے سے ، بے نام گداز سے ، بے نام خودی سے ابھرتے ہیں - دوسرا یہ کہ ادب کو اگر مذہبی رنگ دیا جائے اور اس میں مذہبی تقسیم پیدا ہو جائے تو یہ ادب اور مذہب دونوں کے لیے مضر ہے ، خصوصاً مذہب کو سخت نقصان پہنچے گا - میرا اندازہ تو یہ ہے کہ سید صاحب ان الجھنوں سے آگے نکل آئے ہوں گے ، تاہم دوسروں کی رعایت سے میں اس اشکال کو رفع کر دینا چاہتا ہوں -

پہلی اصولی بات یہ ہے کہ اسلامی ندب سے ہماری مراد مذہبی ادب نہیں - وہ ایسا انسانی ادب ہے جس کی کاوشوں اور نگارشوں میں اسلام کا تہذیبی شعور حل شدہ ہو - اسلام کا یہ تہذیبی شعور جہاں بعض مسلمانوں میں ناپید یا دھندلا ہو سکتا ہے ، وہاں بارہا جزوی طور پر یہ غیر مسلموں میں کار فرما پایا گیا ہے - ادب محدود معنوں میں مذہب کا ترجمان نہیں ہوتا ، وسیع معنوں میں ایک فلسفۂ حیات ، ایک امتیاز خیر و شر، ایک تفریق حق و باطل ، ایک نظام اقدار، ایک سلسلہ روایات اور ایک تہذیبی تحریک کا ترجمان ہوتا ہے - بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ مظاہرہ ہوتا ہے ادیب کے ذوق انتخاب کا کہ وہ کیسے موضوعات ، مقاصد ، کرداروں اور تجربوں کو پسند یا ناپسند کرتا ہے -

دوسری اصولی بات یہ ہے کہ جو مقصد خارج میں پایا جائے اسے ادب میں کبھی دخیل نہیں ہونا چاہیے ، لیکن اگر مقصد فکر و شعور

میں حل ہو گیا ہو ، دل و دماغ میں رچ بس گیا ہو ، وہ ایک معشوق ہزار شیوہ بن کر نگاہوں میں سما گیا ہو ، وہ روح کی لاھوتی فضاؤں میں جذبہ و احساس کے ساتھ گندھ کر اسی بےنام عبودیت ، بے نام گداز اور بے نام خودی کے مرتبہ کو پہنچ کر اندرونی تحریک بن گیا ہو جس کے داعی ڈاکٹر صاحب ھیں تو پھر کیا وجہ ھے کہ وہ ادب میں جلوہ گر نہ ہو اور ہونا چاھے تو اسے روکا جائے - جن حضرات نے تحریک اسلامی کے اعلی اخلاق نصب العین کو لمبے ریاض کے ذریعے اپنے جذبہ و احساس کی یافتوں میں پوری طرح ضم نہ کر لیا ہو ان سے کون کہتا ھے کہ وہ اسلامی ادب کی تخلیق فرمایا کریں - یہاں تو مطلوب ھے ''آتشے در خون دل حل کردۂ ـ''

یہ تو ایک نقطہ نظر کا معاملہ ھے جسے پریم چند نے اپنے ایک مختصر خاکے میں ایک لڑکی کو کھلے پارک میں بینچ پر سوتے ہوئے دکھایا جس کے پاس سے مختلف گزرنے والے اپنی اپنی ذھنی ساخت کے مطابق رائے کا اظہار کرتے ہوئے نکل جاتے ھیں - کوئی جنسی نقطۂ نگاہ سے تلذذ حاصل کرتا ھے ، کوئی اسے آوارگی کا طعنہ دے کر نفرت سے دیکھتا ھے ، کوئی اس کی علالت کا امکان ذھن میں لا کر ھمدردی کا اظہار کرتا ھے ٹھیک اسی طرح زندگی اور سماج اور مختلف کرداروں اور واقعات و حوادث کو جس سے مختلف لوگ مختلف نقطہ ھائے نظر کے ساتھ دوچار ہوتے ھیں ، ان کا رد عمل مختلف ہوتا ھے اور ان کا ادبی اظہار بھی جدا جدا ہوتا ھے ع - عبارا تنا شتّی و حسنك و احد'' میں پوچھتا ہوں کہ میں جو خدا اور آخرت کو مانتا ہوں ، میں جو اسلام کی اخلاق اقدار پر ایمان رکھتا ہوں ، میں جو اپنا الگ فلسفہ تاریخ ذھن میں بسائے ہوئے ہوں ، میں جو خوب و ناخوب کی تفریق کا مختلف پیمانہ رکھتا ہوں ، کیوں نہ میرا اظہار ایک مخصوص رنگ اختیار کرے - بس یہیں سے آپ اسلامی ادب کا تصور اخذ کر سکتے ھیں -

اور سنیے ! ابھی کل کی بات ھے ، ڈاکٹر صاحب اقبال کا ''ذکر جمیل'' کرتے کرتے اسلامی ادب کے کوئے ملامت میں پھر جا نکلے - ایک صاحب ھیں ممتاز لیاقت انھوں نے عین موقع پر پکڑا اور ڈاکٹر صاحب کے حرف ذوق و شوق کو جامۂ طباعت پہنا کر ھمیشہ کے لیے

محفوظ کر دیا - فرماتے ھیں :-

''اقبال کا یہ پیغام اپنے اندر ھزار بصیرتیں رکھتا ھے کہ زندگی کا سب سے بڑا آئین قرآن اور اس کے دیے ھوئے وہ عقیدے ھیں جو عالمگیر اخوت کے ضامن اور اعلیٰ مراتب حیات کے کفیل ھیں - پاکستان ان عقیدوں کا سب سے بڑا مرکز ھے - یہ زمین کا وہ قطعہ ھے جس کی اساس عقیدوں پر رکھی گئی ھے -''

اگر اقبال کی شاعری قرآن کے عقیدوں کی آئینہ دار ھو سکتی ھے اور پاکستان کا قیام ان عقیدوں کے سب سے بڑے مرکز کے طور پر ھو سکتا ھے تو آخر اسی پاکستان کے ادیب کی تخلیقات کیوں ان عقیدوں کی ترجمان نہیں ھو سکتیں ، اور اگر ھو سکتی ھیں تو انھیں اسلامی ادب کیوں نہ کہلانا چاھیے- ڈاکٹر صاحب پیغام اور عقیدوں سے آگے بڑھ کر مقصد اور نصب‌العین کی ادبی اھمیت بھی بیان فرماتے چلے گئے ھیں کہ —

''وہ فلسفے ھمیشہ زندہ رھتے ھیں جو نصب‌العینی ھوتے ھیں ، یعنی جن میں انسانیت کی بعید ترین منزلوں کے لیے امید اور شوق موجود ھوتا ھے - اقبال اجتماعی جذبات کے شاعر تھے (اجتماعی جذبات میں افراد کے جذبے بھی شامل ھوتے ھیں) اقبال کے اجتماعی جذبوں نے جو فلسفیانہ شکل اختیار کی ھے ، ان کی نوعیت نصب‌العینی ھے -''

تو آخر اقبال کے بعد کے لوگوں کا فلسفہ یا ادب کیوں نصب‌العینی نہیں ھو سکتا ؟ اور ایسا ادب کیوں اجتماعی جذبات کا آئینہ دار نہیں ھو سکتا ـــــ اور ھو سکتا ھے تو پھر اسلامی ادب کے تصور میں کوئی گرہ کہاں رہ گئی -

غلط فہمی نہ ھو ، میں ڈاکٹر صاحب کے خلاف مقدمہ نہیں لڑ رھا ، خود آن کے سامنے انھی کو بے نقاب کر رھا ھوں ، مگر محض آن کی خاطر نہیں ، آن کا مطالعہ کرنے والوں کی خاطر !

یوم عزم نو کے داعیان و حاضرین کرام! اپنے دور آغاز میں میں خود بھی چند روز آوارہ گرد رہ چکا ھوں - مگر میں نے جلد ھی ادب آوارہ کی بے مائیگی کا احساس کر لیا:

کل میں نے عین بزم میں پینے سے توبہ کی
اور یہ بھی میں ھی تھا کہ پھسل کر سنبھل گیا

ہاں تو اسلامی ادب کا ظہور نو نتیجہ ہے اُس خلاء اور تضاد کا جو تمام کے تمام مروجہ نظریہ ہائے ادب میں تھا - کوئی نظریۂ ادب ایسا نہ تھا جو اُس ملی خودی کا ترجمان ہو جس سے میں اور آپ سب بہرہ مند ہیں - ہمارے انا کے ظہور کا کوئی راستہ نہ تھا - ہمارا مقصد زندگی بے حس و حرکت پڑا تھا - ہم دوسروں کے صورت گر بنے پھرتے تھے اور اپنی زندگی کے مطالعہ کے لیے دوسروں سے زاویہ ہائے نگاہ مستعار لے لے کے کام چلا رہے تھے - میرے نزدیک وہ کشمکش جو انسان کی اپنی خودی اور خارجی دنیاؤں کے درمیان واقع ہوتی ہے ، سچے اور عظیم ادب کی واحد محرک ہوتی ہے - لیکن یہاں ہم نے اپنی لااله خواں خودی کو دوسروں کے قدموں میں ڈال رکھا تھا اور اپنی کشمکش کو مدتوں سے ختم کر کے نئے نئے نظریوں کے ہتھیار لے کر ہرائی لڑائی لڑتے رہے ہیں - ہمیں متفرق قسم کے مستعار نظریوں نے مغرب کی مادیت کے سامنے بےبس کر کے ڈال دیا تھا ، حالانکہ ہمیں جو سب سے بڑا معرکہ لڑنا تھا وہ اسی مادیت کے خلاف تھا - اسلامی ادب نے اسی ذہنی غلامی اور ذہنی شکست کا طلسم توڑ کر اپنی خودی کی لڑائی کا آغاز کرایا ہے - آج ہم اس قابل ہیں کہ اپنے تہذیبی شعور کے مضبوط موقف سے روحانی اور اخلاق قدروں کے ہتھیار اٹھا کر اس معرکے کو فکری اوز ادبی میدانوں میں سر کریں جسے لڑنے کے لیے اس کرۂ ارضی پر ہمارے علاوہ کوئی عنصر باقی نہیں ہے ، تمام کی تمام دنیا شکست کھا چکی ہے -

ظرف ایں ھنگامہ پیدا کن ، خرابات است ایں
گرد ہر ویرانہ صد منصور و دار افتادہ است

اے ادب گران پاکستان! آپ جس تجربے سے گزر رہے ہیں وہ کچھ ویسا ہے جیسا جرمنی کے ادیب فرانسز کافکا نے جو ۳۲ سال قبل فوت ہوا ، اپنے ایک مختصر ترین خاکے کے کردار میں دکھایا ہے - اُس نے حکم دیا کہ اصطبل سے میرا گھوڑا لایا جائے - غلام سمجھنے سے قاصر رہا - چنانچہ وہ خود ہی اصطبل میں جا پہنچا ، گھوڑے پر زین کسی اور سوار ہو گیا - صدر دروازے پر ملازم نے پوچھا : آقا کہاں جا رہے ہو؟ ”مجھے معلوم نہیں“ اُس نے جواب دیا ”بس یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں—یہاں سے!—اسکے سوا میں کچھ نہیں جانتا یہ وہ واحد راستہ ہے جسے عبور کر کے میں اپنے مقصد تک رسائی حاصل کر سکتا

ہوں''۔ لفظ مقصد کو سن کر خادم نے پھر پوچھا ''تو گویا آپ کو اپنے مقصد کا علم ہے'' ''ہاں'' مالک نے جواب دیا ''ابھی تو بتایا ہے کہ بس یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں ، یہی میرا مقصد ہے۔''

کچھ ایسی ہی کیفیت ہمارے ہاں کے ادب کی ہے ۔ محض ایک اضطراب اور ہیجان ہے اور کسی طرف نکل جانے کا جنون۔نکل جانے کے بعد کہاں جا پہنچیں گے ، کچھ معلوم نہیں ۔ ادیبوں کے گروہ کافی ہاؤسوں میں وجودیت اور انفرادیت ، عینیت اور معروضیت ، روایت اور بغاوت کے نظریات سے پنگ پانگ کھیل رہے ہیں ۔ انہیں غبارہ فروشان فرنگ سے نت نئے رنگین غبارے مل جاتے ہیں جن سے دل بہلاتے ہیں ۔ ایک پھٹ جاتا ہے ، دوسرا لے آتے ہیں ۔ بس تھوڑی سی خرابی ہوئی ہے کہ غباروں سے کھیلتے کھیلتے اپنا وجود کھو گیا ہے ۔ اقبال والی بات کہ :

ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

مغرب کے ادیبوں کو داد دینی چاہیے کہ وہ جس طوفان بے ساحل میں غوطے لگا رہے ہیں ، اس میں وہ سہارا لینے کے لیے نظریوں کے نئے نئے تنکے خود ہی ایجاد کرتے رہتے ہیں ۔ ایک تنکا جواب دے جاتا ہے تو دوسرا پیدا کر لیتے ہیں ۔ مگر ہماری مصیبت یہ ہے کہ تھوڑا بہت طوفان بھی وہاں سے لاتے ہیں اور پھر کبھی ساحل ہی ساحل پر اور کبھی پایاب پانیوں میں غوطے کھانے کی نقل اتارتے ہیں اور پھر سہارا لینے کے لیے تنکے بھی وہیں سے چراتے ہیں ۔ بھائی طوفان نہیں ایجاد کر سکتے تو کوئی تنکا تو خود ایجاد کیا ہوتا ؟ کوئی ایک ازم آپ بھی تو گھڑتے ، اور کوئی ازم ممکن نہ تھا تو ''لایعنی ازم'' مہیا کر کے ادب میں یہ نئی راہ کھولتے کہ آج ادب کا مطلوب وہ ہے جس سے آدمی کے پلے کچھ نہ پڑے ۔ ہم مغرب سے نظریاتی اور ادبی ایڈ لیتے ہی رہے ، کبھی کوئی چیز دینے کا تجربہ بھی تو کرلنا چاہیے تھا — کوئی معنئی تازہ ؟ کوئی فکر شگرف ؟ کوئی حرف نودمیدہ کوئی خیال حسن آفرین ، کوئی جذبہ تسکین بخش ؟

دوستو ! کتنا اندھیرا ہے ، کتنا طوفان ہے ، کتنی پریشانی ہے — کوئی کام کی بات کہو ، کسی پارۂ کلام سے روشنی دو ، کسی مسکن نظریے کا بادبان کھول دو ؟ — آخر تم سب کے سب کدھر

جا رہے ہو ؟ کیوں فی کل واد یہیموں کے طلسم میں گرفتار ہو ؟ یہ یقولون مالا یفعلون کی مصیبت کب تک ؟ یہ افلاس تخیل اور قحط ایجاد کیوں ؟ خیابان ادب میں بید مجنوں کی کاشت کب تک ، کہ نہ پھول کھلتے ہیں ، نہ پھل پکتا ہے - ایسے بانجھ فنون سے اور اپھل نظریات سے کیا بنے گا !

میں اپنے ادیب کو دیکھتا ہوں کہ اس کے سر پر ایک ٹوکرا لدا ہے ، کندھوں پر کچھ گٹھڑ ہیں ، ہاتھوں میں توبڑے لٹک رہے ہیں ، جیبوں میں دفتر بھرے ہیں ، پاؤں سے زنجیریں لپٹی ہوئی ہیں ، ـــــ یہ سب کیا ہیں ؟ پرانے نظریات ، بیگانہ تصورات ، اجنبی موضوعات ، غیر ساز گار اسالیب ، جو جہاں سے ملا ، اٹھا کے لاد لیا ، ـــــ اور وہ ہانپ ہانپ کے ایک ایک قدم آٹھاتا ہے ، پسینہ بہہ رہا ہے ، پاؤں لہو لہان ہیں ، لباس تار تار ہو چکا ہے ، روح پس گئی ہے ، حسین تخیلات مرجھا گئے ہیں - ملی خودی اور اپنا تہذیبی شعور اس پر رحم کھا کر کہتے ہیں کہ بھائی ! یہ تم نے قلیوں کا پیشہ کب سے اختیار کر لیا ؟ کیا مصیبتیں تم نے لاد لی ہیں ، تمھارے پاس تو صرف اپنا ایک ساز فن ہونا چاہیے تھا ـــ اور وہی گم ہے -

ہائے یہ غلامی ، فکری اور ادبی غلامی ! ـــــ اور اس غلامی کے تقدس کا احساس ! اور پھر اس پر ایسا فخر و ناز کہ جو کوئی اس سے بغاوت کر رہا ہو وہ سخت حقیر اور نالائق محسوس ہوتا ہے ع

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

دوستو ! مغرب کا ادیب جس لاینحل ذہنی بحران سے دو چار ہے ، اس میں وہ مجبور ہے کہ طرفہ قسم کے نظریے گھڑے اور ان کا سہارا لے - یہ تمام کے تمام نظریات تجزیہ کرنے پر فراریت پسندی کے کرشمے دکھائی دیں گے - یہ ساری کوششیں حقیقت سے بھاگ کر بلوں میں گھسنے کی مانند ہیں - ایک بل ناکارہ ہو جاتا ہے اور حقیقت وہاں بھی جا پہنچتی ہے تو بھاگتا ہوا خرگوش کسی دوسری جھاڑی یا بل کی پناہ لیتا ہے اور مہلت پالے تو نیا بل کھود لیتا ہے ، مگر شکاری کتے سونگھتے سونگھتے وہاں بھی جا پہنچتے ہیں :

جہاں سے بھاگ کے لی تھی لحد میں ہم نے پناہ
مگر یہاں بھی ہمارے گناہ آ پہنچے

میں پوچھتا ہوں کہ آج اگر ڈاکٹر سید عبداللہ کے اس یوم عزم نو پر آپ ایسا کریں کہ سارے کے سارے نظریات مستعار کو دریائے راوی میں ڈبو دیں تو کیا آپ کا سرچشمۂ تخلیق بند ہو جائے گا ؟ آپ کی شاعری کا ساز اپنی شکست کی آواز بن جائے گا ؟ آپ کے افسانوں کی الف لیلہ کی ملکہ شہزاد وفات پا جائے گی ؟ آپ کے فن تنقیہ کا صراف سل پتھر ہو جائے گا ؟ آپ خود لاشے ہیں ؟ اگر ایسے کسی حادثے کا اندیشہ نہیں ہے اور آپ کی فنی و تخلیقی ہستی نظریات مستعار کے سہارے نہیں کھڑی ہے تو پھر سچ مچ مئے خودی سے ایک جام بھریے اور ایک بار ان ٹوکروں اور گٹھڑوں اور توبڑوں کے دفتر بے معنی کو اس میں ڈبو دیجیے ، اور پھر دیکھیے کہ کیا ہوتا ہے ۔ آپ کی خود شعوری کی خوابیدہ پری جاگ اٹھے گی اور دیووں کی قید سے رہا ہو کر آپ سے آ ملے گی ۔

حریف کاوش مژگان خوں ریزش نۂ ناصح
بدست آور رگ جانے و نشتررا تماشا کن

آپ اگر مغربی نظریات کے سلاسل و اغلال آتار پھینکیں گے تو زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا ناں کہ وہاں کے لوگ آپ کو نالائق کہیں گے ، کہنے دیجیے ، اور آپ بھی جرات کر کے زبان تنقید کھولیے اور آن کو بتائیے کہ ہم سے بڑے نالائق اور جاہل اور احمق آپ ہیں جنھوں نے اپنے اوپر غرور دانش کا نشہ طاری کر رکھا ہے ۔ اس سے اگر ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو وہ ڈرنے کی چیز نہیں ، بلکہ یہی تو وہ مطلب کی چیز ہے جو ہماری ادبی زندگی اور فکری ارتقا کے لیے ضروری ہے ۔ ٹکراؤ اور تصادم ہی اعلی' فکر اور بڑے ادب کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں ۔ ٹکراؤ جتنے بڑے دائرے میں ، جتنے بڑے پیمانے کا ہوگا آتنے ہی عظیم نظریات و نگارشات کی تخلیق ہوگی ۔ فن ہمیشہ کشمکش سے پیدا ہوتا ہے ، جیسے موتی طوفانوں کے درمیان یا جیسے چقماق کو لوہے سے ٹکرایئے تو چنگاریاں ٹوٹتی ہیں ۔ دنیا بھر کا جاندار اور اثر انگیز ادب اس لامتناہی تصادم کی پیداوار ہے جو انسان اور اس کے ماحول کے درمیان واقع ہوتا ہے یا فرد کے ذہن اور سماج کی معیشت کے درمیان ! یا ایک ملت کے تہذیبی تصور اور دوسری نظریاتی تحریکوں کے درمیان ۔ تاریخ کے کسی چیلنج سے بھاگ کر یا اس کے سامنے سرجھکا کر آپ کوئی بڑا تخلیقی کارنامہ انجام نہیں دے سکتے ۔ مصیبت یہ ہوئی کہ ہم اس چیلنج کے سامنے کھڑے ہونے کی جسارت

نہ کر سکے جو مادہ پرست تہذیب لائی تھی ، ہم نے اس کے آگے خم کھا جانے اور فرار کر لینے ہی کو ترقی پسندی سمجھا اور رجعت کے طعنوں کے ڈر سے پاکستانی آئیڈیالوجی کی چٹان پر کھڑے ہو کر موجوں سے لڑنے پر تیار نہ ہوئے ۔ فی الحقیقت ادیب کی ذہنی زندگی ایک جہاد آرا سپاہی کی سی زندگی ہے جو نت نئی ستیزہ گاہوں کی طرف اقدام کرتا ہے اور ایک ایک کانٹا اس کے آبلوں سے خون کا خراج لیتا ہے اور ایک ایک جھاڑی اس کے دامن سے دھجیوں کا محصول لیتی ہے ۔ معرکہ ہائے خیرو شر میں اسے جو زخم آتے ہیں وہی اس کے فن پاروں کے عنوان بنتے ہیں ۔ اس کا رستا ہوا خون ہی اس کے لیے سرمایہ فکر ہوتا ہے ۔ پس آج مادیت کا جو بھاری چیلنج سامنے ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایسے جہاد کیش ادیب کی ضرورت ہے جو زور دار ملی انا سے آراستہ ہو ۔ اڑتے ہوئے سوکھے پتوں کی طرح بکھرے ہوئے ذہنوں اور انتشار زدہ نظریات کے ساتھ اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا ۔ ہم اس دور کے طوفان مہیب کا مقابلہ منفیانہ اور مقلدانہ ذہن سے نہیں بلکہ مثبت جارحانہ انداز ہی سے کر سکتے ہیں ۔

اب آئیے ذرا مغربی انسان اور مغربی ادیب کی اس قابل رحم مصیبت کا اندازہ کریں جس کا شکار ہو کر وہ اس قابل ہرگز نہیں رہا ہے کہ ہم اس سے مرعوب ہو کر ، احساس کہتری سے بھرے ہوئے مؤدبانہ انداز سے اس کی تقلید کریں اور جہاں وہ سر پھوڑ رہا ہو وہیں ہم بھی ضرور اپنا سر پھوڑیں ۔

مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب نے جو خوفناک عالمگیر بحران پیدا کر دیا ہے ، اس کا مطالعہ میں نے ایک طالب علم کی سی محنت سے کیا ہے اور میں اس کے متعلق کہنے کی بہت سی باتیں چوٹی کے مفکرین کے حوالوں کے ساتھ ذہن میں رکھتا ہوں ، مگر میں یہاں خود ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ہی کو مغرب اور آپ کے درمیان واسطہ تعارف بناتا ہوں ۔ موصوف مغربی ادب کے مطالعہ کا تاثر یوں بتاتے ہیں کہ :

"مغربی ادب سے دل کی کلی نہیں کھلتی ۔ ۔ ۔ کیونکہ اپنا تو سراغ ہی ہاتھ نہیں آتا ۔"

کتنی بڑی بات ایک فقرے میں کر دی ہے ۔ ادب اور فن تو ہیں ہی اپنی تلاش اور اپنی تعمیر پر مشتمل — ان کی تو غائت ہی اپنا

اثبات اور اپنے وجود کو منوانے کے لیے سرگرمی جہاد ہے۔

ایک جملہ اور :

''سرسری نظر سے مغربی دنیا واقعی جنت معلوم ہوتی ہے۔اور کسی حد تک ہے بھی—مگر کسے معلوم کہ ان ہنسنے والوں کے پیچھے پیچھے مغرب میں ایک قطار ضمیردار مفکروں کی بھی ہے جو مغرب کے روحانی افلاس اور بے قید حیوانیت پر زار و قطار رو رہی ہے۔''

چند لفظوں میں حقیقت کا یہ ایک مکمل جائزہ ہے۔ ضمیر دار مفکرین بھی صرف رو ہی سکتے ہیں، کیونکہ دھارے کا رخ پلٹنا کسی کے بس میں نہیں رہا۔ موجودہ تمدن ایک خوفناک جبریت بن گیا ہے۔ مذہبی اصطلاح میں میں اسے خدا کا عذاب کہوں گا۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

اپنے ہی ہاتھوں مادیت کا طوفاں اٹھانے والا انسان اب خود اسی میں خس وخاشاک کی طرح موجوں کا کھلونا بنا ہوا ہے۔ اس نے جو عروج خرد حاصل کیا تھا وہ ایک دورۂ جنوں میں بدل گیا ہے۔ سرمائے اور مشین کے جن دیووں کو مسخر کیا گیا تھا انہی نے آدمی کی گردن دبوچ لی ہے۔ توسیع پسند ریاست اس کے سینے پر کابوس بن کر سوار ہے، اور کلیت پسند ریاستیں تو روح بد کی طرح فرد فرد میں حلول کیے ہوئے ہیں۔ انسان معیار زندگی کی دوڑ اور دولت کمانے کی مسابقت میں پاگلوں کی طرح بھاگ رہا ہے اور اس تگ و تاز میں روحانی اقدار اور اخلاق روایات کو سمجھ بوجھ کر پھینک چکا ہے۔ دولت اور جنس اور اقتدار کی ہوس کے سوا اس کا اور کچھ بھی سرمایہ حیات نہیں ہے۔ وہ ہجوم اور اجتماعیت کے درمیان خوفناک تباہی سے دو چار ہے، اور اسے محبت و ہمدردی کے دو بول تک کہیں سے نہیں ملتے کیونکہ مذہب اور خاندان کے وہ گلستان اجڑ چکے جو ایسے گلاب و یاسمن اگایا کرتے تھے۔ مادیت کے پیش کردہ مختلف نظام آزمائے جا چکے اور اب کوئی نیا نقشہ یا نظریہ باقی نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی جنگوں کے تسلسل کے ساتھ دو عالمی لڑائیاں بھگتنے کے بعد تیسری قیامت خیز جنگ کا دیو جوہری ہتھیاروں سے لدا پھندا بڑھتا چلا آ رہا

ہے ۔ اب کوئی راہ نجات نہیں ۔ غم غلط کرنے کے لیے لوگ شراب اور نغمہ اور رقص اور عریانی اور قماربازی اور رنگا رنگ سامانوں میں خوشی کی تلاش کرتے ہیں مگر وہ نہیں ملتی کیونکہ خوشی تو ایک روحانی و اخلاقی تجربہ ہے ۔ مادی خوشی تو وہ سراب ہے جس کے پیچھے لپکنے سے صرف تشنگی اور بھڑکتی ہے ۔ اندریں حالات ایک قنوطیت بیکراں چاروں طرف محیط ہے ۔فرسٹریشن اور فرسٹریشن اور فرسٹریشن ۔

اس قنوطیت بیکراں کا مارا ہوا انسان مجبور ہے کہ ادب میں فراریت کی راہیں نکالے اور اپنے ذوق فرار کو نت نئے نظریات کے خوبصورت جامے پہنائے ۔ ایک ہم تھے جو مادیت کی پیدا کردہ عالمگیر قنوطیت کے خلاف اپنا اسلامی نظریہ حیات لے کے کھڑے ہو سکتے تھے اور دوسروں کے لیے روشنی کا مینار بن سکتے تھے ، مگر دو سو سال کی غلامی نے ایسا خوگر تقلید بنایا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے طلسم ہیچ مقداری کا شکار ہو چکے ہیں اور ایک ازلی احساس کمتری ہمارا گلا گھونٹتا ہے کہ اس سے کوئی حرف تازہ صادر نہ ہونے پائے ۔ چنانچہ ہم نے بھی فراریت ہی کو لازمۂ ترقی پسندی اور شرط جدت مان لیا ۔

یہ فراریت کا رہزن کبھی بہ شکل تشکیک و لاادریت آتا ہے کہ جو کچھ تجربات ہمیں ہو رہے ہیں ، ان کی حقیقت جاننا ہی ممکن نہیں ، کبھی یہ احساس جبریت کی صورت اختیار کرتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے غیر اختیاری ہے اور اس میں ارادی تصرف کرنا ممکن نہیں بس زندگی صرف سہنے کی چیز ہے ۔ کبھی یہ ماورائیت کا روپ دھارتا ہے کہ اہل فن کو ارضی واقعیت سے بلند تر ہو کر تصوراتی فضاؤں میں اڑنا چاہیے ۔ کبھی یہ نشاط پسندی اور رندیت اور جنس پرستی کا لباس پہن لیتا ہے ۔ کبھی یہ اذیت پسندی کا افسوں پھونکتا ہے ، کبھی یہ قنوطیت کو اصل الاصول بنا لیتا ہے ۔ کبھی یہ ایک ایسی اندھی رجائیت کا نشہ پلاتا ہے جس کی بنیاد روش حقائق کے بجائے بے معنی خوش فہمیوں پر ہوتی ہے ۔ کبھی یہ لاشعور کو بنیاد مان کر اشاریت اور ابہام پسندی یا دوسرے لفظوں میں بے ربطیٔ افکار کے انداز سکھاتا ہے تاکہ سرے سے کوئی واضح نتیجۂ فکر وجود ہی میں نہ آئے یعنی باتیں بہت ہوں اور کوئی بات نہ بنے ۔ کبھی یہ جامد روایت پسندی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور کبھی یہ

بے معنی انقلاب پسندی یا بغاوت پسندی کا وعظ کہتا ہے جس کا کوئی تعمیری نتیجہ نکلنا سرے سے ممکن نہیں ہوتا ۔ اور آج کل اس نے اپنے چہرے پر ''وجودیت'' کی مرعوب کن اور فیشن ایبل نقاب اوڑھ رکھی ہے ، یعنی انسان کا آخری نصب العین زندہ رہنا ہے کسی نہ کسی طرح زندہ رہنا ہے ، اور اس لیے وہ زندہ رہنے کے لیے خیر و شر کے سارے امتیازات سے بالاتر ہو کر جو کچھ انتظامی حرکات کرتا ہے وہی جان تہذیب ہیں اور انہی کو روح ادب ہونا چاہیے ۔ گویا وجودیت کے علمبردار ساری تاریخ کو جینے کی ہوس کے گرد مرتب کرتے ہیں ۔ اسی کے ساتھ ایک تازہ تازہ فیشن ایبل بہروپ فراریت نے انفرادیت اور اظہاریت کا بھرا ہے ۔ یعنی ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ قوم اور سماج اور انسانیت کے رکن کی حیثیت سے نہیں ، بلکہ محض ایک فرد ہوتے ہوئے جو کچھ محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے اور جو جو کچھ رد عمل اس میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں ، چاہے وہ آپس میں بالکل متصادم ہوں ، آن کا اسے اپنے پسندیدہ طرز و معیار کے مطابق اظہار کرتے رہنا چاہیے ۔ وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے متفرق ذاتی میلانات کے متضاد اظہار اچھے نتائج پیدا کرتے ہیں یا برے یا یہ کہ اس کے ارگرد کی دنیا جہنم میں جاتی ہے یا جنت تک پہنچتی ہے ۔

تازہ ترین نظریات میں سب سے خوبصورت اور جاذب نظر نظریہ انسان دوستی (Humanism) کا ہے یعنی ادب میں انسان کے ساتھ اظہار ہمدردی کا رنگ پیدا ہو ۔ یہ اس خلا کو بھرنے کی ایک جزوی کوشش ہے جو مذہب ، خاندان اور قومیت کے مختلف رشتوں کے ٹوٹ جانے سے پیدا ہو گیا ہے ۔ مگر یہ خوبصورت نظریہ بھی فراریت کی سخت مغالطہ آمیز شکل ہے ۔ اول تو اس السان دوستی کے رجحان کی بنیاد کسی ٹھوس اعتقاد یا تصور پر نہیں ہے ، دوسرے یہ کہ یہ مادیت کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کے سامنے شکست مان کر اور موجودہ تہذیبی قفس کو انسان کے لیے قضائے مبرم تسلیم کرکے اختیار کیا گیا ہے ۔ اس کی نوعیت ایسی ہے جیسے ایک ہی وسیع پنجرے کے اسیر ایک دوسرے سے ہمدردی کا خیالی اظہار کر لیا کریں اور دو چار آنسو بہا لیا کریں ، لیکن جہاں تک پنجرے کا تعلق ہے وہ ان کو جوں کا توں قبول ہے ۔ گویا یہ نظریۂ انسان دوستی مری

ہوئی انسانیت کی بھٹکتی ہوئی روح ہے جو ہمارے ذہنی خلاؤں میں چکر لگاتی ہے اور کبھی کبھی ٹٹیری کی طرح اس کی درد ناک چیخ سنائی دیتی ہے - آخر یہ ٹٹیری کی نئی چیخ درد زندگی کا مداوا کیا بنے گی - ان بے معنی نظریات نے ہمارا حال ویسا ہی بنا دیا ہے جس کو قرآن نے فی کل واد یہیمون کے الفاظ سے بیان کیا ہے - ہمارے سامنے فراریت کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے جس کے خوبصورت حلقے ان مختلف نظریات سے تشکیل پاتے ہیں جن کا میں نے سرسری ذکر کیا ہے -

آج ڈاکٹر سید عبد اللہ کی ساٹھویں سالگرہ پر یوم عزم مناتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ میں اور آپ اس پورے کے پورے جال کو توڑ ڈالیں اور ادب کی روح بنانے کے لیے اپنے اس نظریۂ حیات کے منت کش ہوں جس پر ہمارا وجود مبنی ہے اور جس کی عظیم عملی قوت ہی کا نہیں موثر فکری قوت کا شعور بھی ہمیں حالیہ دور جہاد نے دلایا ، یہ تمام کے تمام نظریات مستعار جواب دے گئے اور اسلامی نظریۂ حیات ہی ہمارا واحد سہارا رہ گیا - ہمیں قرآنی ادب کی ایک خوبصورت مثال کے بمصداق ان کشتی والوں کی طرح نہیں ہونا چاہیے جو طوفان میں خدا کو پکار کر نجات حاصل کرتے تھے اور جب کشتی ساحل سے لگ جاتی تھی تو تصور خدا کو سمندر میں چھوڑ کر پھر اپنے بتوں کو سینے سے لگا لیتے تھے - جو نظریات طوفان میں ساتھ چھوڑ گئے ہوں ، ان کو طوفان ہی میں غرق کر دینا چاہیے اور ساحل پر اسی نظریہ کو ساتھ لے کے قدم رکھنا چاہیے جس نے طوفان میں سنبھالا ہو - وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے ہی نعرۂ مستانہ کو اپنائیں -

بیان درد ناک و نعرۂ مستانہ خودرا
بہ آیات زبور و نغمہ داؤد نفروشم

ڈاکٹر سید عبداللہ کے سے عزم کے ساتھ ادب کے میدان کارزار میں ، خودی کی تیغ کو لاالہ کی سان پر رکھ کر مجاہدانہ شان سے اتریے— اور پھر اپنے ساز شمشیر سے وہ لہو ترنگ الاپیے جس کا راستہ اقبال نے دکھایا تھا - آج ہمارے ذہنی خلاء اور تضاد ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اسلامی نظریۂ ادب کو اپنائیں - اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے -

ڈاکٹر سید عبداللہ ہی کے استعمال کردہ ایک شعر پر میں اپنی طویل گفتگو کو ختم کرتا ہوں :

بت کدے آپ نے ڈھائے ، بہت اچھا لیکن
شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھیے بنیاد

اصل مقالہ ختم کر کے ایک ضروری انکشاف کرنا چاہتا ہوں ۔

ڈاکٹر صاحب کی ساٹھویں سالگرہ منانے اور اُن کے لیے طول عمر کی دعائیں کرنے والو! آپ سب لوگ مطمئن رہیں کہ موصوف کی ہستی موت کے دائرۂ نصرت سے خارج ہے ۔ فی الحقیقت وہ یہ مرحلے طے کر چکے ہیں جس کا اقرار انہوں نے اس شعر کے واسطے سے کبھی کیا تھا :

عاشق ہوئے اور مر مٹے ہم
اپنی تو یہ مختصر ہے روداد

"ادھر نکلے ، اُدھر ڈوبے" قسم کے لوگ کبھی مرا نہیں کرتے ۔ وہ ذرا سا مرتے بھی ہیں تو محض ذوق تجربہ اور لذت تحقیق کے تحت یہ دیکھنے کے لیے کہ لوگ کیسے مرا کرتے ہیں — بس ذرا وہ خاص ذائقہ چکھنے کے لیے ، یا منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ۔ موت جب سامنے آتی ہے تو یہ توانا روح کے مالک اُس سے ایسا معاملہ کرتے ہیں جیسے پرانے زمانے کے سخی بھکاریوں کو مونڈھے کی چادر یا کرتا اتار کے دے دیتے تھے ، اُسی طرح سلطنت زندگی کے منعم موت کی طرف بڑے فیاضانہ انداز سے اپنا جسم اٹھا کے پھینک دیتے ہیں کہ جا ری ، لے جا اسے ، تو کیا یاد کریگی ! ہم کسی کو خالی نہیں لوٹایا کرتے ۔

اس انکشاف کا دوسرا جز یہ ہے کہ جسم کی عمر کلاکوں اور کیلنڈروں کے پیمانے سے ناپی جاتی ہے اور اس پر بڑھاپا طاری ہوتا ہے ، مگر روح کی عمر کے لیے یہ پیمانہ ہائے امروز و فردا ہیں ، وہ سدا جوان رہتی ہے ، بلکہ اسکی جوانی کا آغاز ہی اس وقت ہوتا ہے جب جسم بوڑھا ہو چکتا ہے ۔ اسکی جوانی عزم و ہمت کے پیرائے میں ظاہر ہوتی ہے ۔ چنانچہ دنیا کے بے شمار اعاظم کے شاندار کارنامے جسمانی بڑھاپے میں سر انجام پائے یا کم از کم عروج کمال تک پہنچے ۔

پس میں سید صاحب کو روحانی شباب کا اصل دور کار شروع کرتے ہوئے مبارکباد کہتا ہوں ۔

راجہ رشید محمود

"راز معشوق نہ رسوا ہو جائے"

صدر محترم ! خواتین و حضرات ۔

ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے عظیم اُستاد کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے :

خیال قد بلند تو می کند دل من
تو دست کوتہ من بین و آستین دراز

طالب علم کے لیے یوں بھی اُستاد قابل احترام ہوتا ہے لیکن اُستاد گرامی منزلت سید صاحب تو صحیح اُستاد کا ایک مثالی نمونہ ہیں ۔ جو صرف ادبیات کا درس ھی نہیں دیتے ، بلکہ اپنی مسکراہٹ کے ذریعے انسانوں سے محبت ، زندگی سے نباہ اور مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی پیدا کرتے ہیں ۔

اُستاد محترم کے علمی ، تعلیمی ، تنقیدی اور تحقیقی کارناموں سے ملک کا ہر پڑھا لکھا آدمی واقف ہے ۔ قبلہ سید صاحب سرسید احمد خاں ، مولانا شبلی نعمانی اور علامہ اقبال رح کے بڑے مداح ہیں ۔ لیکن اُن کی طبیعت میں حالی کی طبیعت کی ملائمت اور ٹھنڈا پن ، غالب کی بذلہ سنجی اور میر کی دردمندی اور غم پسندی ہے ۔ آپ کو جن شخصیتوں سے عقیدت اور وابستگی ہے ، اُن کے متعلق بھی تنقید و تدریس میں اعتدال ، دقت نظر ، اصول پسندی اور اپنی طبیعت کی روائیتی نرمی اور دھیمے پن کے زیر اثر صحیح صحیح فیصلے صادر فرماتے ہیں ۔

سید صاحب کو دبستان دہلی کی خصوصیات وضعداری ، درد آشنائی ، انکسار ، دھیما پن ، لہجے کی مسکینی اور شرافت بہت پسند ہیں ۔ لیکن آپ دبستان لکھنؤ کی تضحیک نہیں کرتے ، بلکہ اُس وقت

کی معاشرت اور تہذیب کا ذکر کرکے ادباء اور شعراء کو مجبور ٹھہراتے ہیں ــــ آپ میر کے کلام کی ناقابل پیمائش حد تک غم کی گہرائی کے ساتھ ساتھ سودا کی آواز کی تنومندی، طبیعت کے جوش، تخیل کی فراوانی، لفظوں کے دبدبے اور تشبیہات و استعارات کے ٹھاٹھ کی بھی تعریف کرتے ہیں ــ آپ مصحفی کے فکر کی گہرائی اور جبلی شرافت کے قائل ہیں، تو انشا کی شاعرانہ شوخی، طراری اور بیباکی کو سوختنی نہیں قرار دیتے۔

استاد گرامی مرتبت نے تنقید و تحقیق میں جو کارنامے انجام دیے ہیں، ایک زمانہ ان کا بصدق دل معترف ہے۔ تنقید میں سیدھا سیدھا مدرسانہ لہجہ، خاص قسم کا شگفتہ اسلوب تحریر، رواں اور شستہ اردو میں عالمانہ، فلسفیانہ اور ادیبانہ باتیں، صحیح صحیح نتائج کی طرف رہنمائی اور بے تعصبی آپ کی خصوصیات ہیں۔ اور آپ کے تحقیقی شاہ پاروں کے متعلق تو اتنا ہی کہہ دینا، اس مختصر وقت میں، کافی ہوگا ــ کہ

چوں او تلاش معنی و مضمون نہ کردہ کس

اردو کے محسنین کی پہلی صف میں سید صاحب کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔ اردو کی برتری، تفوق اور حاکمیت کے لیے آپ نے ایوان اقتدار کی رفعتوں سے لیکر مال روڈ کی ہمواریوں تک جو مخلصانہ اور بے غرضانہ تگ و دو کی، اس سے اردو میں دلچسپی رکھنے والا ہر شخص، دوسرے الفاظ میں پاکستان کا بچہ بچہ نہ صرف واقف ہے، بلکہ آپ کا ممنون ہے۔

مغربی تہذیب سے متاثر ہوتے ہوئے اس معاشرے میں ہمیں بہت کم آدمی ایسے ملتے ہیں ــ اور بلا شبہ ایسے آدمی عظیم ہیں ــ جو مغربی علوم و افکار کے مطالعہ کی حوصلہ شکنی نہیں کرتے، لیکن فلسفۂ نفع پرستی، روایت شکنی، جسمانی لذات کی دلدادگی، روحانی لذتوں سے انکار اور یورپ کے مادر پدر آزادی کے تصور کے خلاف مصروف جہاد ہوں۔ اور سید صاحب ایسے لوگوں میں سرفہرست ہیں۔

آپ سائنس دان نہ ہونے کے باوجود سائنس کی ترویج و ترقی کے زبردست حامی ہیں۔ اس سلسلے میں آپ بہت سا کام کر چکے ہیں اور بہت سا کام آپ کی نگرانی میں مغربی پاکستان اردو اکیڈمی میں اس وقت

ہو رہا ہے ۔ لیکن آپ پوری دیانتداری سے تجربہ کارانہ ، مفکرانہ اور مدبرانہ رائے رکھتے ہیں کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم ہمارے ملک میں سائنس کے فروغ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ۔

قومی اور اجتماعی حیثیت سے ادیبوں کے اس گروہ کو ، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ادب میں اخلاق کی آمیزش سے عظمت فن ختم ہو جاتی ہے۔یا اس ادبی فرقے کو ، جو ''موہنجوداڑو کو اپنی قومیت کا کعبہ اور اپنے ایمان کا سومنات بنانا چاہتا ہے ۔'' یعنی ارضیت اور زمین پرستی کے داعی فرقے کو۔یا اس دبستان کو جو اسلام کو ایک ناقابل عمل نظریۂ حیات تصور کرتا ہے۔یا ان لوگوں کو ، جو عبادات کو محض ڈھونگ سمجھتے ہیں اور ان کی تضحیک کرتے ہیں۔یا اس طبقے کو جو مذہب میں روح کو ضروری ، مگر فارم کو غیر ضروری خیال کرتا ہے ، سید صاحب قطعاً ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں ۔

اگرچہ سید صاحب کی ''کلیسا میں یہ اذان'' بہت سے لوگوں کے لیے برہمی کا سبب بن جاتی ہے ۔ اور ان حضرات کا عتاب ، غصہ اور بغض مختلف اوقات میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے ۔ لیکن حق گوئی کو شعار بنانے والے جانتے ہیں کہ حق بات کہہ کر خراج تحسین و آفرین کی بجائے مصائب و آلام ، عتاب اور استبداد کی توقع زیادہ رکھنی چاہیے ۔

حق گوئی پہ تحسین کی امید نہ رکھیے
پتھر بھی برس پڑتے ہیں محفل کی طرف سے

آپ ہمارے موجودہ معاشرے میں غرض برآری ، ملمع سازی ، تناؤ، کج روی ، بد دیانتی اور بد اخلاق پر بہت کڑھتے ہیں ۔ اور اس انحطاط پذیر سوسائٹی میں انسانیت کی قدروں کو فروغ دے کر انسان کو اس کے اصلی اور عظیم مقام پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں ۔

جانے کب پائیں گی پھر سے قد و قامت اپنا
یہ بھٹکتی ہوئی پرچھائیاں انسانوں کی

سید صاحب قومی کردار کی تربیت پر بہت زور دیتے ہیں ۔ فرمایا کرتے ہیں ۔ ''قومیں جغرافیے سے نہیں ، عقاید سے بنا کرتی ہیں ۔'' آپ کے خیال کے مطابق پاکستانی قومیت کے دو ھی بڑے اصول ہیں ۔ ایک

تو مملکت خدا داد پاکستان سے محبت اور دوسرے ان عقائد و روایات سے محبت ، جن کے لیے پاکستان بنا تھا ۔

تعلیم کے مقاصد کے سلسلے میں بھی آپ تکمیل شخصیت ، نیکی ، عدل ، انسانیت ، علم کائنات ، شوق ایجاد ، دنیوی زیرکی ، خدا شناسی ، حصول رضائے الٰہی اور اپنی تہذیب سے محبت کے ساتھ ساتھ پاکستانی تعلیم کے تین بڑے نصب العین قرار دیتے ہیں—اچھا پاکستانی شہری بنانا ، اچھا انسان بنانا اور اچھا مسلمان بنانا ۔

استاد معظم ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے نزدیک کلچر داخلی طہارت ، ضمیر داری اور حسن اخلاق کی آئینہ داری کا نام ہے ۔ اور پاکستانی نیشنل کلچر ہمارے دینی عقائد و روایات ، ملکی اور مقامی ذوقی عناصر اور ان صحت مند مغربی عناصر سے ، جو ہمارے اخلاق اور اسلامی مزاج کے خلاف نہ ہوں ، مرکب ہے ۔ ارشاد فرماتے ہیں :

> ''کلچر صرف کوکا کولا پینے کا نام نہیں ۔ نہ صرف ظاہری خوش اخلاق اور سفید پوشی کا نام ہے ۔ اس میں اندر کی کشادگی ، باطن کی پاکیزگی اور من کی صفائی بھی شامل ہے ۔''

اس طرح بات تہذیب و ثقافت کی ہو یا ادب کی ، قصہ تعلیم کا ہو یا قومی کردار کا ، تذکرہ سائنس کا ہو یا فلسفے کا ، استاد گرامی نیکی ، خلوص ، سچائی ، شرافت—اور یوں خدا ، الہام اور اسلام پر ایمان کو اصل الاصول گردانتے ہیں ۔

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

آپ ضروریات زمانہ کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کی بجائے ، ضروریات کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے حق میں ہیں ۔

لیکن ایک بڑا طبقہ اس ''جرم'' میں کہ سید صاحب ہمیں اسلام دوستی یعنی ''رجعت پسندی'' کے چنگل میں گرفتار کرا دینا چاہتے ہیں ، آپ کا سخت مخالف ہے—تہذیب مغرب کے اثرات کے تحت عریانی ، بے حیائی اور تصنع کو زندگی کی بہترین اقدار قرار دینے والا گروہ یہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ انہیں پھر سے کوئی ''الحیاء خیر کلہ'' کا درس دینے لگے—یہ تو ہوا مغرب کے پرستاروں کا گروہ ۔ ایک سلسلہ ان لوگوں کا ہے جو سید صاحب کی باتوں کو خندۂ استہزا سے ٹال

دینا چاہتے ہیں کہ :

یہ اگلے وقتوں کی رسمی کہانیاں نہ کہو

لیکن استاد معظم کی عظمت یہ ہے کہ وہ مخالفتوں سے بے پروا ، تحسین سے بے نیاز ، اور اپنے خلاف اٹھتی ہوئی آوازوں کی طرف سے کان بند کیے ، اپنے نصب العین کی خاطر ، پوری لگن اور تندھی کے ساتھ رواں دواں ہیں :

نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

آپ نے اپنے تمام متاثرین اور شاگردوں کو نظریاتی اور عملی طور پر سبق دیا ہے کہ اپنے مقاصد کے ساتھ لگن اور دھیمے انداز میں لیکن مسلسل جد و جہد ہی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے ۔ اور راستے میں حائل ہونے والی الجھنوں ، اڑچنوں اور رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لانا ، ان پر توجہ ہی نہ دینا کامرانی سے ھمکنار کرتا ہے :

در بیاباں گر بہ شوق کعبہ خواہی ، زد قدم
سرزنش‌ها گر کند خار مغیلاں ، غم مخور

اور—

طواف کرتی ہے منزل اسی مسافر کا
جو راستے کے خم و پیچ سے نہ گھبرائے

یوں ایک طالب علم کے لیے تو ان کی زندگی خود ایک درس حیات ہے ۔ اعلیٰ اقدار کے لیے لگن اور جذبہ—اور تعمیری کام کرتے رہنے ، اور نیکی کیے جانے کے اوصاف ان کے شاگردوں کے دلوں پر بڑے گہرے نقوش چھوڑتے ہیں ۔

استاد گرامی قدر کی زندگی جس مسلسل جد و جہد کی داستان سے عبارت ہے ، وہ ہم شاگردوں کے لیے مشعل راہ ہے ۔ بڑے بڑے طوفان اٹھے ۔ مخالف ہوائیں چلیں ۔ لیکن استاد محترم اعلیٰ مقاصد کی جو شمع لے کر بڑھ رہے تھے ، آگے بڑھتے گئے ۔ اور یہ لگن اور ارفع مقاصد کی شمع دور دور تک تاریکیوں میں نور بکھیرتی چلی گئی اور نور بکھیرتی جا رہی ہے ۔ اب وہ طوفان کہاں ہیں؟ وہ آہنی عزائم سے اپنا سر ٹکرا

کر لوٹ جانے والے بگولے تو مٹ گئے ، لیکن یہ نحیف و نزار جسم آن ارفع مقاصد کی صداقت کے سہارے اپنے عزائم کے اعتبار سے آج بھی ایک غیر متزلزل قلعہ ھے اور اپنے شاگردوں کو پکار پکار کر درس دے رھا ھے کہ :

به خود خزیده و محکم چو کوهساران زی
چوخس مزی ، که صبا تند و شعله بیباک است

آستاد محترم نے جہاں علوم مشرق کا ایک معیار اور وقار قائم کیا ، وھاں طالب علموں سے آن کی شفقت نے تعلیم میں طالب علموں کے لیے دلچسپی بھی پیدا کی ۔ آستاد بزرگ نے اپنی مسکراھٹوں کے ذریعے شاگردوں کے دکھوں کا مداوا کیا اور شاگرد ھمیشہ آنھیں اپنا غم گسار، ھمدرد اور ایک ایسا راز دار پاتے تھے ، جو آن کی کمزوریوں سے پوری واقفیت کے باوجود آن سے محبت کرتا ھے ـ آستاد محترم سے ایک بار مل کر آن کی زبان سے دو میٹھے بول سنتے ھی طالب علم کا کھویا ھوا اعتماد لوٹ آتا تھا ۔

جلوهٔ کاروان ما نیست به نالهٔ جرس
عشق تو راه می برد ، شوق تو زاد می دهد

آستاد تعلیم کو دردِ سر تو تصور کرتے ھیں ، لیکن اسے دردِ جگر بنانے کے لیے اس میں جس ریاضت اور کاوش کی ضرورت ھوتی ھے ، وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ـ موجودہ دور میں آستاد گرامی کی ذات آستاد کے اس اعلیٰ منصب پر فائز دکھائی دیتی ھے ۔ جس نے تعلیم اور درس و تدریس کو دردِ جگر بنا کر، خونِ جگر دے کر ، تدریس کی نئی روائت قائم کی ۔ یہی وجہ تھی کہ علوم مشرق کے لیے ملک کی فضا ناساز گار ھونے کے باوجود سید صاحب کے تلامذہ کی تعداد آئے دن بڑھتی ھی چلی گئی ـ یہاں طفلِ گریز پا کو مقید کرنے کے لیے کسی مادی وسیلے کی ضرورت نہیں تھی ۔ آستاد کی عظمت ، تبحر علمی ، شفقت اور محبت ، اور درس کا زمزمۂ محبت ھی وہ زنجیریں تھیں جنھیں طالب علم خود اپنے گلے کا طوق بنا لیتا تھا اور اس پر فخر کرتا تھا :

درس ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعه به مکتب آورد طفلِ گریز پائے را

لیکن یہ زنجیریں ، جنھیں شاگرد خوشی سے پہنتے تھے ، اچانک ٹوٹ گئیں - کس قدر دکھ کا مقام ہے کہ جن بیڑیوں کو ، جن بندھنوں کو سینکڑوں شاگرد اپنی سعادت سمجھتے تھے ، وہ اچانک فروری ۱۹۶۵ء میں ٹوٹ گئیں — اورینٹل کالج کی قدیم عمارت کی ایک ایک اینٹ سے اداسی ٹپکتی تھی - برگد کا بوڑھا درخت اداس تھا - شاگرد رو رہے تھے لیکن استاد محترم اسی طرح پروقار ، اسی طرح ھنستے مسکراتے ہوئے ، شاگردوں کو چھوڑ گئے — وہ شاگرد ، جنھیں طویل سفر سے واپسی پر ، تھکاوٹ کے باوجود بھی گھر پہنچنے سے پہلے درس دینے میں سید صاحب راحت محسوس کرتے تھے - وہ شاگرد ، جن سے سید صاحب ایک لحظہ بھی جدا ہونا گوارا نہیں کرتے تھے - اور ھسپتال میں آپریشن ہونے کے بعد بھی ، گھر پہنچنے سے پہلے وہ کلاس کا رخ کرتے تھے ، آخر ان سب کو یک دم انھوں نے کیوں چھوڑنا گوارا کر لیا؟ — ہم سوچتے ہی رہ گئے کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ — استاد محترم کے قریبی حلقوں سے دریافت کیا ، انھوں نے خاموشی سادھ لی - خود استاد معظم سے بار بار استفسار کیا - مگر ان کی زبان سے بھی راز نہ کھلا - ان سے آج بھی ہم پوچھتے ہیں ، تو وہ یہ شعر پڑھ دیتے ہیں :

راز معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

خدا سمجھے اس معشوق سے ، جس نے ہزاروں طلبا کو ایک عظیم استاد کے فیض سے محروم کردیا - یقیناً یہ معشوق ستم پیشہ بھی ہوگا اور تغافل شعار بھی - جس نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ تعلیم کو تعلیم کے ایک بڑے محسن سے محروم کرنے میں یونیورسٹی ، ملک اور قوم کو کتنا نقصان پہنچا ہے :

آج بت بیٹھے ہیں تقدیر کے مالک بن کر
اب جو لکھا ہے مقدر میں مسلمانوں کے

ہم طالب علموں کے لیے اب تک یہ راز ہے کہ پاکستان میں اتنی بڑی ٹریجڈی کیوں ہوئی ؟ — قوم نے اتنی بڑی ٹریجڈی گوارا کیوں کر لی ؟ شاگردوں سے ان کا استاد کیوں جدا کر لیا گیا — استاد اعظم کو کیوں گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا گیا ہے ؟ — ان کے قلم اور

زبان کی خدمات سے اب بھی کیوں فائدہ نہیں اٹھایا جاتا ، جب کہ استاد محترم بدستور رواں دواں اور سرگرم عمل ہیں ۔ آخر تعلیم و تدریس کو ان سے محروم رکھنے کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے ، یہ سب وہ سوال ہیں ، جو ہر شاگرد اور پبلک کے اکثر حضرات کی زبان پر ہیں ، مگر ان سوالوں کا جواب کون دے گا ؟ — ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم اپنے یہ سوال کس کے سامنے رکھیں ؟ اپنی آواز کسے سنائیں ؟ — بہر حال ، جو کوئی بھی سن سکتا ہے ، ہم اپنی آواز اس تک پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں — قصور شاید شاگردوں کا ہے کہ انھوں نے استاد کی ضرورت سے زیادہ اطاعت کی اور خاموش ہو گئے ۔ ورنہ اس ٹریجڈی کے اسباب پر سے پردہ ہٹانا انہی کے فرائض میں شامل تھا ۔

گلگونۂ عارض ہے ، نہ ہے رنگ حنا تو
اے خوں شدہ دل! تو تو کسی کام نہ آیا

اور اب ایک طالب علم سب سے پہلے اقدام کرتے ہوئے اہل دل میں سے ہر اس آدمی تک اپنی آواز پہنچا کر اپنا فرض انجام دے رہا ہے جو قوت سماعت رکھتا ہو ، سننا چاہتا ہو اور سن سکتا ہو :

تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود می گویم
گوش نزدیک لبم آر ، کہ آوازے ہست

———

پروفیسر حکیم نیر واسطی صاحب نے قبلہ سید صاحب کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا ، تقریب کی صدارت جناب ملک خدا بخش صاحب وزیر تعلیمات و حکومت مغربی پاکستان نے کی جس میں یہ مقالہ پڑھا گیا ۔

محمد انوار الحسن
اسلامیہ کالج لائل پور

دوری منزل میں ہے

آج ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج کی ساٹھویں سالگرہ کے موقعے پر عقیدت مندوں اور شاگردوں کی طرف سے جو دن منایا جا رہا ہے وہ زندگی کے ایک خاص عزم اور ولولے سے سرشار ہونے کا پیغام دے رہا ہے۔

سید صاحب کے ارادت مند تحریری اور تقریری طور پر جو کچھ ہدیۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ پر بجا اور اپنے مقام پر زیبا اور درست ہے۔ ان کے گلے میں آج جو محبت کے ہار بنا کر ڈالے جا رہے ہیں وہ سید صاحب کی ہر دلعزیزی اور عظمت کے نشانات ہیں اور اس بات کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں تنہا نہیں بلکہ :

یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

یہ درست کہ سید صاحب ایک بہترین نثر نگار اور صاحب طرز ادیب ہیں۔ یہ بھی بجا کہ وہ باعث فخر استاد اور کامیاب دانشمند ہیں۔ یہ بھی صحیح کہ وہ ایک بہترین اور دیدہ ور مصنف اور مبصر ہیں۔ مجھے عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کی اس عقیدت اور ارادت سے نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ کوئی بحث ہے۔ مجھے تو اس رونق محفل اور ہنگامۂ احباب میں صرف ایک حقیقت کی تلاش ہے جس کے لیے میں اپنے قلم کو بیک جنبش دست پیش کرنے کے لیے بے قرار اور بے تاب ہوں۔ عقیدت و ارادت کی تہوں کو اگر ایک ایک کرکے دیکھا جائے تو میرے دل کے اندر بھی ایک گوشے میں سید صاحب کی عظمت کا چراغ جلتا ہوا دیکھا جائے گا اور ان کی شمع فروزاں نظر آئے گی۔

مجھے ان سے جو کچھ کہنا ہے وہ اور ہی ایک بات ہے اور مجھے جو ان سے توقع وابستہ ہونی چاہیے وہ ایک پر عظمت حقیقت کی طرف

نشان دہی کرتا ہے ۔

میرے نزدیک تو کتاب زندگی کے صرف تین ورق ، بلکہ صرف تین صفحے ہیں جن میں منزل مقصود جھلکتی اور چمکتی نظر آتی ہے اور اسی کی طرف میں سید صاحب کو رواں دواں دیکھنا چاہتا ہوں یعنی کتاب زندگی کے تیسرے ورق سے ان کا گہرا تعلق اور جد و جہد کے لیے اس کو ان کی منزل مقصود اور نقطہء خیال تصور کرتا ہوں ۔

ہاں تو کتاب زندگی کے ہمارے لیے تین ورق یہ ہیں :-

۱۔ تخلیق پاکستان ۔

۲۔ پاکستان میں اسلامی آئین کا نفاذ ۔

۳۔ خطہء خدا داد پاکستان میں اردو زبان کو دفتری زبان کا مقام ملنا اور انگریزی زبان نے اردو کی جو جگہ چھین لی تھی اس کا دوبارہ واپس قبضہ دلانا ہے ۔

جہاں تک تخلیق پاکستان کا تعلق ہے قدرت نے اس کے لیے قائداعظم کا انتخاب فرمایا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ، نہیں نہیں بلکہ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو دست قدرت نے اسے بنا ڈالا ۔ اب اس کی تعمیر کے لیے میدان وسیع ہے ۔ اور اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی تعمیر میں زندگی کھپا دیں اور دنیا میں اس کا وقار قائم کر دیں جیسا کہ الحمدللہ اب اس کے وقار میں چار چاند لگ رہے ہیں ۔

دوسرا ورق ہماری کتاب زندگی کا آئین قرآن ہے ۔ بلاشبہ تخلیق پاکستان کی غرض و غایت یہی ہے کہ مسلمانوں کے اس ملک میں اللہ کا قانون جاری ہو جس کے لیے یہ ملک مانگا گیا اور بنایا گیا ۔ اس ملک کی روح دراصل یہی آئین اسلام ہے جس کے بغیر پاکستان ایک ایسا جسد ہے جس میں روح نہیں ۔ ایک ایسی آنکھ ہے جس میں نور نہیں ۔ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے بجا طور پر فرمایا تھا کہ :-

> بننے والے ملک پاکستان میں ہر وقت ہمیں اختیار ہوگا کہ ہم اسلامی آئین کا نفاذ کرسکیں جس کا تصور متحدہ ہندوستان میں نا ممکن ہے ۔

اب اہل حل و عقد پاکستان پر یہ الزام ہوگیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ کریں ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ کے قانون کو جاری کرنے کا سہرا کس صدر مملکت کے حصے میں آتا ہے جس سے

وہ روز قیامت خدا کی بارگاہ میں سرخ رو ہو سکے ۔ بہر حال جہاں تک علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کا تعلق تھا وہ اپنا کام انجام دے کر دنیا سے رخصت ہوئے اب اسلامی قانون کا اجرا ہمارا کام ہے ۔

الغرض تخلیق پاکستان کا کام قائداعظم کے ہاتھوں اور اسلامی قانون کی تجویز شیخ الاسلام کے ہاتھوں وجود میں آئی ۔ اب ہمیں کتاب زندگی کے تیسرے ورق کو دیکھنا ہے اور وہ ہے :

اردو زبان کو دفتری زبان قرار دے کر اس پر عمل پیرا ہونا ۔

سید عبد اللہ صاحب کا فرض

کتاب زندگی کے اس ورق کو پلٹنے اور لکھ کر پر کرنے کا کام ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے سنبھالا ہے یا قدرت نے اس کام کے لیے انہیں منتخب کیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اسلامی قانون کے بغیر پاکستان ایک ایسی آنکھ ہے جس میں نور نہیں تو ٹھیک اسی طرح اردو زبان کے دفتری اور سرکاری زبان ہونے کے بغیر پاکستان ایک ایسی زبان ہوگی جس کو گونگی کہا جاسکتا ہے ۔

میرے نزدیک ہی نہیں بلکہ پاکستان کا ہر فرد یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اردو زبان تخلیق پاکستان کا جزء لاینفک ہے ۔ اس جز کے بغیر پاکستان کی تکمیل ناممکن ہے ۔

سرسید کے دور سے لے کر اب تک اردو کے لیے مسلمان رہبروں اور ادیبوں نے اس کو اس کا صحیح مقام دلانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے اور جہاں ہندوؤں سے الگ سلطنت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہم مسلمان ہیں تو دوسری طرف یہ اس لیے بھی شدید تھی کہ ہماری زبان اردو تھی جس کا تحفظ بھارت میں ممکن نہیں تھا ۔

ہندی کے سپوتوں کو متحدہ ہندوستان میں اردو ایک نظر نہ بھائی تھی اور اردو ہندی کی کشمکش نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ جہاں اپنے مذہب اور تہذیب کو فروغ دینے کے لیے ہمیں علیحدہ خطے کی ضرورت تھی وہاں اپنی اردو زبان کو ترقی دینے ، اس کی وحدت قائم کرنے کے لیے بھی ہمیں علیحدہ ملک کی ضرورت تھی ۔ چنانچہ پاکستان جہاں اسلام کے لیے قائم ہوا ہے وہاں زبان اردو کے لیے بھی

معرض وجود میں آیا ہے ۔

الغرض کتاب زندگی کو مکمل کرنے کے لیے میرا عقیدہ ہے کہ قدرت نے ڈاکٹر سید عبداللہ کو چن لیا ہے اور وہ اس مقصد کے حصول کے لیے سر بکف ہو کر میدان میں نکلے ہیں ۔ خدائے کریم ان کو اس مقصد میں کامیاب فرمائے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس راہ میں بہت سے کانٹے ہیں ۔ میرا پیغام ان کے لیے صرف یہ ہے ۔

رہ رو راہ محبت! تھک نہ جانا راہ میں
لذت صحرا نوردی دوریٔ منزل میں ہے

ڈاکٹر عبدالستار آغا
ڈبلیو پی - ای - ایس (۱)
پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

اسوۂ انسانی

انسانیت مغرب و مشرق کے لیے شمع کا ایک ھی شعلہ ھے - اس کی ضیاء خواہ انجیل کی مرھون ھو یا قرآن کی ، باری تعالیٰ کی دین ھے - اور جہاں بندہ بندگی میں اس کو بھول نہیں سکتا وھاں اپنے ھم جنس سے اسی کردار اور یقین کا خواھاں ھے -

عبداللہ نام کی خصوصیت ھادی برحق کی صورت میں ظاھر ھوئی اور محمد و احمد کے پیارے اور مبارک ناموں سے منور ھوئی - جس طرح دین ھدی عبداللہ مکی کی ذات سے وابستہ ھے اور سینکڑوں عبداللہ تاریخی ، سیاسی و ادبی لحاظ سے دنیا میں آئے - چمکے اور چمکا گئے - اسی طرح فی زماننا موجودہ علوم و ادب ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت کے احسان مند ھیں -

علوم عربیہ و فارسیہ کے لیے آنرز و ایم اے کی جماعتوں میں شرکت اور تاریخ اسلام پر لیکچر سننے کے لیے میں جب اوریئنٹل کالج کی عمارت میں پہنچا تو مجھے ایک پتلی دبلی ، طویل القامت ، سفید فام صورت اس فضا میں نظر آئی ، جس کی نگاھیں اکثر اور بشاشت فطری کمتر میری جاذب نظر رھتی تو مجھے احساس ھوتا کہ یہ قوس قزح آسمان علم و ادب کا کام دے گی -

میں اکثر اپنے زمرۂ احباب میں اس کا ذکر بھی کرتا چنانچہ ایک یوم (اور غالباً آپ سے متعلق جتنے یوم ھیں وہ اسی ''یوم تجدید عزم'' کی کڑیاں ھیں) برادر مرحوم کے ذریعے آپ کے محبانہ پتلے ، مگر گرم ھاتھوں سے مصافحہ کرنے اور لذیذ تعارفی کلموں سے عقیدتمندانہ منازل کے درجوں کا پہلا سنگ بنیاد تراشا گیا - جس کی زیبائش اس سی سالہ

دوستی پر مجھے فخر کراتی ہے گویا ع

بسے "گنج" بردم بریں سال سی

آج تیس برس قبل کا سی سالہ جوان رعنا ، رعنائی قدرت کے جن مناظر کی یاد تازہ کراتا ہے وہاں انسانیت کے آن اخلاق عالیہ کی مجسم تصویر کی یاد دل سے نہیں بھلاتا اور اس پیکر عظیم کی عزیمت قلبی اور عظمت ذہنی کی شعاع کا احساس بھی کراتا ہے ۔

کون جانتا تھا کہ فضائے پنجاب یونیورسٹی کا سید اگر علی گڑھ کا سید نہیں بن سکا تو نہ سہی ۔ ملا عبدالعلی بحرالعلوم تو ضرور بنا ۔ (اور اسی لیے میں نے تجویز کیا ہے کہ جہاں علی گڑھ کا سید ہر سال خزاں میں پیدا ہو کر سرسید بنتا ہے وہاں پنجاب کا ڈاکٹر سید ۔ بہار میں پیدا ہو کر "ابوالعلوم ڈاکٹر سید" کہلانے کا مستحق ہے) اور جسے اس میدان علم و ادب میں شہسواری انسانیت کی سب سے مشکل مگر کٹھن حدود پر حاوی ہو کر حاصل ہوئی ۔

سید کو اس زمانے میں مختلف پہلوؤں سے دیکھا ۔ دائیں بائیں بغل میں علم کے موتی اٹھائے ، ان علم کے موتیوں کو پرکھتے، ان کی روشنی سے آنکھوں کو منور کرتے ، دماغ کو تجسس و تحقیق میں مبتلا کرتے کوائف و نتائج کو قلم کی سیاہی سے کاغذ کی سپیدی کو چکا چوند کرتے ۔ اور شیوع رسائل سے افادۂ عام کراتے ۔

قہوہ خانوں میں صغیر و کبیر کی مجلسوں سے باریاب ہوتے اور باریاب کرتے اور دلچسپ مباحثوں ، تبصروں سے ایک حلقۂ ارباب ذوق و شوق باندھتے بندھاتے ۔

دولتکدہ پر جو کبھی بالا تھا اور کبھی زیرین استقبال احباب کی صورت "خدا کی قدرت ہے" متصور رہی اور زیارت اصحاب اور عیادت صحابہ کو پاسبان عقل سمجھا ۔

غرض گفتار و رفتار و کردار اپنی جگہ انسانیت کے ایسے جزویات سے سرشار تھے جن میں "اسوۂ حسنہ" کا عکس نظر آتا تھا اور یہی معیار زندگی کی اہم ترین بنیاد ہے ۔

اپنی تعلیم کی کڑیاں طے کرنے کے بعد جب میں یونیورسٹی ریسرچ سکالر کی حیثیت سے روزانہ یونیورسٹی لائبریری میں علم کی خاموش تصویروں سے ہم کلام ہوتا اور تحقیقی نظر سے مباحثہ کی رو میں بہہ جاتا

تو سید کو السنۂ شرقیہ کے سیکشن کے انچارج کی حیثیت سے فضیلت و شغف علمی، تمکنت و وقار اور آزاد رائے کے ساتھ درد مندی سے اتنا سرشار پاتا کہ کوئی دقیقہ اس کی حرکات و سکنات کا اس سے عاری نہ ہوتا۔

سید کرسی پر ایک افسر انچارج نہ تھا۔ بلکہ دل درد مند کی پکار تھا۔ نشست و برخاست حوارین کا جو سلسلہ قائم ہو رہا تھا اس میں سید تن تنہا، بے لاگ و بے لوث خدمت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہمہ تن درد تھا۔ وہ اس درد کو درد لا دوا نہ سمجھتا۔ بدی کو لا بدی خیال نہ کرتا اور درگذر کو درد مندی کا نچوڑ سمجھتا۔ بس اسی لیے محنت و مشقت کی گرانی سے نہ تڑپتا نہ گھبراتا۔ اس میں درد مندی کو یوں سموتا گویا نظام حیات کا جزو اعظم ہے۔ کتاب کو دیکھتا تو علمائے سلف کی یاد میں آہیں بھر کر درد مند ہوتا۔ ذخائر کتب کے افہام و تفہیم سے درد مندی کی لو پیدا کرتا اور زمرۂ زائرین کو درد مندی کی تلقین کرتا۔ گویا ثابت کرتا بقول ہادیؑ برحق کہ مومن کے ایک عضو کی تکلیف ساری قوم کی تکلیف ہے۔ اور جس ملک کی جنس انسانی سے یہ شعار و شعور جاتا رہا اُسے ننگ عبودیت کا سامنا کرنا پڑا۔

اس اثنا میں سید کا دل درد مند ہر قسم کی مدد سے خواہ وہ سیاسی ہو یا معاشرتی، ملی ہو یا ملکی، تعلیمی ہو یا تنظیمی کبھی نہ چوکتا اور سوزش تاباں سے نہ صرف گرماتا بلکہ خوابیدہ دلوں کو ع

دل بیدار فاروقی دل بیدار کراری

کہہ کر جگاتا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میری آزادانہ طبیعت نے مجھے بعض انقلابات زمانہ کا سامنا کرنے کے لیے مجبور کیا تو سید نے نہ صرف اپنے قلم و خیالات بلکہ اک طرز خاص سے مجھے مقابلہ کرنے کا احساس دلایا اور کہا ''درد محسوس کرنے سے کام کم بنتا ہے۔ درد اٹھانے سے مفاد عامہ ہوتا ہے اور اس کے لیے بڑی قربانی دینا پڑتی ہے۔'' لیکن ساتھ ہی جوہر شناسی سے کام لیا اور دیکھا کہ منزل کارواں طے ہوئی۔ گو اخبارات نے بھی اسلامی اور انسانی جذبے کو ابھارا اور دنیائے

صحیفہ نگاری درد مندی کا پورا پورا ثبوت دیتی رہی - سید اس تگ و دو میں پیش پیش تھا لیکن در پردہ -

میں نہیں کہہ سکتا سید کا یہ جذبہ کن حضرات پر اور کہاں کار فرما رہا - لیکن یہ تو ثابت ہوتا رہا کہ یہ وجود جس روح کا قفس ہے وہ کسی ہار جیت کی قائل نہیں - ایک اسلامی جوش جنوں کی مالک ہے اور گو ملت اسلامیہ کے وہی خواب دیکھ رہی جو جمال الدین افغانی ، سرسید احمد خاں ، شمس العلما شبلی نعمانی ، رحمت علی ، علامہ اقبال ، قائد اعظم محمد علی جناح کے لائحہ عمل کی آواز ہیں ، لیکن اس کا طریقۂ کار صلح و آشتی کا دعویدار ہے - نیکی سے جتنا والہانہ آنس ہے بدی سے آتنا ہی بعد ہے اور اس سے نباہ کا نرالا طریقہ واقعات سے درگذر کرنا - مشغلۂ استادی کو غم ربا اور مقدس فریضہ گرداننا - ابنائے دھر کی نا قدردانی سے آزردہ ضرور ہونا مگر مایوس نہ ہونا - فرائض کی بجا آوری لازماً یا ذاتی شوق کے زیر اثر کرنا - محبت کرنا ، خدمت کرنا ، اور مسکراتے رہنا - تجربوں کے ایسے اصول ہیں جو اسلامی روایات اور ملکی مباہات کو سر بلند کرتے ہیں -

اسلامی جذبے کی یہ صورت تھی کہ مسلمان سے مسلمان کو نقصان پہنچنا سخت ناگوار تھا - مجھے دوران ملازمت میں ایک ایسے صاحب سے واسطہ پڑا تو آپ بے حد رنجیدہ تھے اور خبث باطن کے اس طریق کو شیطنت سے تشبیہ دیتے رہے لیکن محبانہ رائے یہی تھی کہ باطل کو شکست ہوگی اور حق کو فتح - آپ اپنا کام کیے جائیں - کہتے ”ایسے افراد گو پرا جا لیتے ہیں لیکن دل موہ نہیں لیتے اور نہ ملت کو ان پر فخر ہوگا اور نہ نگاہ ایزدی ان کے طریق کار کو سراہے گی -“

جنگ عظیم اول سے جنگ عظیم ثانی تک کے انقلابات ، قیام پاکستان ، حکمرانان پاکستان اور جنگ و صلح پاک و ہند کے سیاسی رنگوں سے جہاں سید رنگین ہوتا رہا وہاں تغیرات و تصرفات علم و فن کے چرچوں سے ہم آہنگ رہا -

یہ ڈاکٹر سید ہی تھا جس نے چمن زار اورینٹل کالج کی ہنستی ہوئی چائے کی پیالیوں ، مسکراتی ہوئی پیسٹریوں اور متبسم موز و نارنگی کی سجاوٹ سے بعد و قرب کے ارباب علم و فن کو گلے لگوایا - مصافحہ کروایا اور ایسے دلربا قہقہوں سے گونجایا کہ گل و بلبل ملکۂ

ترنم کے نغموں سے رشک کرنے لگے - اور طوطیٔ چمن منقار زیر پر ہو کر رہ گیا -

سید مرقع انقلاب تھا - اُس کا قلم اس کے انقلابی خیالات کی ترجمانی کرنے سے قاصر تھا - لیکن اس کی زبان رنگ انقلاب میں ہمدوش ثریا تھی -

منگلور کے باغ و راغ ، سبزہ زار کوہ و دمن نے جس شانزدہ سالہ شاب کی پرورش کرکے عنفوان شباب میں لاہور پہنچایا وہ ایک بیش بہا عطیہ تھا قومی و وطنی معاشرت و سیاست ، علم و ادب و فن کے لیے اور یہ اصناف ثلاثہ منتظر تھے اس بات کے کہ :

علی قدر اھل العزم تأتی العزائم
و تأتی علی قدر الکرام المکارم

ملی و ملکی روح کی تجدید ، علمی ، تعلیمی و ادبی خدمات کی ہے اور یہ وہ خاموش دنیائے الفقر ہے جس کا اظہار رعب و داب کی چندھیا دینے والی روشنی سے نہیں ہوتا بلکہ درخت کے ایک ایک کرکے آہستہ گرنے والے پتوں کے ذخیرے سے ہوتا ہے - چنانچہ سید کی مثالی زندگی ہر پاکستانی کے لیے خواہ وہ عالم و ادیب و حکیم ہو ، ان فنون کے سننے سے تعلق رکھتا ہو یا ان میں حتی المقدور درسی ، تدریسی و قلمی حصہ لیتا ہو نہ صرف مشعل راہ ہے بلکہ دعوت عمل کے مصداق ہے -

معتمدین ممتاز منگلوری و میرزاادیب صاحبان کو یوم تقریب شصت سالہ کے سلسلے میں سید متنبہ کرتا ہے کہ ''میری حقیر خدمات کو نہ تو پروان چڑھایا جائے اور نہ ان پر اعزاز نچھاور کرائے جائیں'' بلکہ حب وطن ، ناموس وطن کا اتنا دلدادہ ہے کہ اس موقع پر بھی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے اپنے ''شریک کار'' اور ''رفیق طریق'' سے دعوت عمل بفحوائے حضور اکرم علیہ الصلواۃ و سلام اعمنوا سے ہی دولت حیاۃ مالا مال سمجھتا ہے -

پھر اگر ایک طرف 'یوم' کو ''ارادوں کی تجدید و توثیق کا وسیلہ بنا کر تکمیل نصب العین'' مدنظر ہے تو ''رفیقوں اور دوستوں کی امداد'' ''مل جل کر کام کرنے - ولولۂ تازہ پیدا کرنے اور بتوفیق ایزدی وہ سب کچھ کرنے کو جو ایسے مقصد کے لیے مطلوب ہے اشد

ضروری" گردانتا ہے ۔

دین اسلام ، ملل اسلام اور ملت پاکستان کے مسائل کو ہر شہری کا فرض سمجھ کر تعلیمی اور فکری جہان کے متعلق آدہ درجن مسئلوں کی فہرست پیش کرتا ہے ۔ اس میں اسلام کی روح و تجلیات ، پاکستان کا نظریۂ خصوصی ، انسانیت کے عقائد سے تخلیق ادب ، عربی ، فارسی ، اردو (یعنی عفا) بحیثیت مضامین اور ان کے اہل فن کے تحفظ کے ساتھ اردو کو قومی تعلیمی دفتری زبان کے اہم مطالبے کو ہی حضرات کرام سے روحانی رابطہ برقرار رکھنے کی توجیہ قرار دیتا ہے ۔

انتہائے تحریر میں میں بے باکانہ یہ کہوں گا کہ ۴۲ سالہ مجرب استاد جو جامعہ پنجاب سے ۴۰ برس وابستہ رہا ۔ اور یہ وہ عرصۂ حیات ہے جس وقت نبوت ملتی ہے گویا سید نبی العلم والفن ہے ۔ طلبا و طالبات کے لیے درد مندی ، خلوص و محبت کی بنا پر مطالعہ کی نہ صرف متاثر کرنے والی کتاب رہا بلکہ اپنی فراست ، لگن ، جذبے اور ان تھک محنت سے اس "ہمت و استقامت" کا مالک ہوا جو اوریئنٹل کالج کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ہزار باد مخالف کے جھونکوں سے بچا کر تحفظ روح ملی تک لے گیا اور قومی مفاد کی خاطر علوم السنۂ شرقیہ کی ترقی و ترویج کی وہ جنگ لڑی جو قومی نوعیت ، قومی تعلیم اور قومی زبان سے متعلق تھی ۔

اخبارات اور جرائد کے ذریعے اسلامی ثقافت اور قومی مسائل پر تبصرہ مفاد عامہ کے لیے رکھا تو میدان تحقیق و تنظیم میں محقق اعلیٰ اور ناظم فائق بنا ۔

آل پاکستان اوریئنٹل کانفرنس کی تشکیل کے سلسلے میں فلک حق رفتار کے ٹمٹماتے ہوئے ستارے جو ظاہراً شمولیت سے فیض یاب تھے باطناً استیصال ناکامی ، اور تمسخر سے تلذذ حاصل کرتے تھے ۔ سید کا جواں دل ، مضبوط ارادہ ہمیشہ یہ محسوس کرتا ۔ ہم نصب العین کے خدم ہیں ۔ عدم سے عدم تک ہمارا قدم قدم قدم چلے گا ۔ کہیں منزل راہ بنائے گا ، کہیں نشان راہ لگائے گا اور آنے والی نسلوں کے لیے عمود برقیہ کا کام دے گا ۔

اوریئنٹل کانفرنس کا سید پرنسپل سید نہ تھا ، گو پرنسپل کے کمرے میں بیٹھتا ، موٹر کاروں کے قافلہ میں ہوائی اڈہ پر استقبال و

الوادع میہانان گرامی قدر کے لیے جاتا - غرض اخوت انسانی کا ایسا مہتمم بالشان پہلو ہویدا تھا کہ انا بشر مثلکم کی صدائے باز گشت تھی -

آئے دن کانگرسوں ، کانفرسوں اور مجلسوں کے انعقاد کا بانی ہونے کے علاوہ سید تدبر سے مدبر بنتا اورگو اورینٹنل کالج اورشعبۂ علوم اسلامیات کو چلاتا - لا کالج کو دباتا اور ارباب بست و کشاد کے غصہ کو رام کرتا رہا - لیکن

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ناشکری ہوگی اگر اس ''اسوۂ انسانی'' میں بیگم سید صاحبہ کو فراموش کر دیا جائے - میں سمجھتا ہوں آپ نے عزیز و گرامی قدر ، شوہر نامدار کے ان کا رہائے زریں کے سرانجام دینے میں جو قربانیاں کی ہونگی ان کا صحیح حال کراماً کاتبین ہی جانتے ہونگے - لیکن اسرار و رموز خودی و بیخودی بتاتے ہیں کہ بیگم مذکور والشمس میں والقمر رہی - اور اسی لیے میں نے چند تجاویز میں موصوفہ کے نام پر ''بیگم ڈاکٹر سید خواتین کلب'' یا بیگم سید اردو کلب کے انعقاد اور اس میں قرآن و حدیث و فقہ اردو میں پڑھنے کے علاوہ دیگر اہم امور وطنی کے منانے کی رائے دی - خدا کرے

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد !

سید ذوالفقار حسین بخاری

سید المحترم

(نقوش و تاثرات)

استاذ مکرم ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی زندگی کے گوشے اتنے متنوع اور ان کے علمی ، ادبی ، تنقیدی اور تعلیمی کارناموں کے دائرے اتنے وسیع ھیں کہ ایک چھوٹے سے مضمون میں ان کی شخصیت کا تشخص کرنا اور مختلف‌النوع خدمات کا احاطہ کرنا بڑا دشوار ہے - اس لیے یہاں ان کے متعلق صرف انہی نقوش و تاثرات کا مجملاً تذکرہ کروں گا جو میرے دل و دماغ پر مرتسم ہوئے - نہیں نہیں بلکہ دیگر سینکڑوں حضرات پر بھی ان کے اثرات مرتب ہوئے -

سب سے اول تو سید صاحب ایک نقاد و محقق کی حیثیت سے ابھرتے ہوئے نظر آتے ھیں - ان کی ذات میں تنقید و تحقیق کا اس قدر حسین امتزاج ھوا ھے کہ ان کو محض ایک محقق یا صرف ایک نقاد کہنا بہت بڑی غلطی کے مترادف سمجھا جائے گا - جن حضرات نے انہیں محقق زیادہ اور نقاد کم یا اس کے برعکس نقاد زیادہ اور محقق کم تصور کیا ہے انہوں نے زیادہ بصیرت کا ثبوت نہیں دیا - یہیں سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے ھمارے ھاں اھل قلم حضرات بالعموم دو طبقوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ھیں - ایک وہ کہ جنھوں نے تحقیق کی طرف اتنی توجہ کی کہ تنقید کی حیثیت ثانوی ھو کر رہ گئی مثلاً حافظ محمود شیرانی مولانا نواب حبیب الرحمٰن شروانی ، پنڈت کیفی ، ڈاکٹر مولوی عبدالحق ڈاکٹر سید محی الدین زور ، سید مسعود حسن ادیب ، اور قاضی عبدالودود وغیرہ - دوسرے وہ حضرات ھیں جنھوں نے انتقادی نظریات و تجربات کی طرف اتنا انہماک دکھایا کہ تحقیق کا میدان قریباً خالی چھوڑ دیا مثلاً نیاز فتح پوری ، فراق گورکھپوری ، مجنوں گورکھپوری ، سید احتشام حسین سید وقار عظیم ، ڈاکٹر عبادت بریلوی ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، ڈاکٹر

وحید قریشی اور سید عابد علی عابد وغیرہ لیکن سید صاحب کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے اپنے آپ پر فقط ایک ہی لیبل چسپاں نہیں ہونے دیا وہ جتنے بڑے نقاد ہیں اتنے ہی بڑے محقق ہیں اسی لیے انھوں نے تحقیق و تنقید کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کی پرزور تردید کی ہے ۔ ان کا کہنا ہے :

''ہمارے یہاں تحقیق کے غلط معنی مشہور ہو گئے ہیں ۔ تحقیق کو سوانحی اور تاریخی واقعات کی چھان بین سے وابستہ کر دیا گیا ہے مگر یہ صحیح نہیں تحقیق سچائی کی ہر اس جستجو سے وابستہ ہو سکتی ہے جس کا طریق کار سائنسی ہو ۔ فلسفیانہ تحقیق ، استدلال کے ذریعے ہوتی ہے اور سائنسی تحقیق ، مواد کی تنقیح اور نتائج اور اثرات کی تجربی چھان بین سے—ادب پاروں کی تنقید میں ایسی تحقیق کا بہت بڑا حصہ شامل ہے خصوصاً تاریخی انداز کی تنقید اور سائنسی طرز تنقید میں کہ اس میں مصنف کی سوانح عمری سے لے کر سوسائٹی کے حالات تک ہر جگہ واقعہ کی تحقیق ضروری ہو جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ جذبے اور اظہار کے درمیانی واسطوں کی چھان بین میں بھی تحقیق ضروری ہے ۔ مگر میں کہتا ہوں آخر اس فرق کو ابھارنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ تنقید خود ایک طرح کی تحقیق ہے جس میں ذاتی تاثر کے ساتھ ساتھ مواد کو عقلی اور تجربی معیاروں کی روشنی میں بھی پرکھا جاتا ہے ۔ جو نقاد محض ذاتی تاثر کی رہنمائی میں چلتے ہیں وہ کسی دوسرے کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکتے بلکہ ایک لحاظ سے ادھورے نقاد ہیں“
(ہفت روزہ نصرت لاہور (ماہنامہ ایڈیشن) یکم جنوری ۱۹٦۱ء)

وہ تو اس بات کے قائل ہیں کہ :

''تنقید بھی ایک سائنس ہی ہے ۔ یہ بھی سائنس کی طرح ایک سچائی کی جوئندہ و یابندہ ہے اور یہ سچائی حسن کی تلاش اور اس کی نسبتوں اور مقداروں کی تعیین سے متعلق ہے اور اس کے بھی کچھ عقلی اصول ہیں . . . . . . تنقید میں تاثر کا فیصلہ اگرچہ بہت کچھ ہے مگر سب کچھ نہیں . . . . . . جوں ہی تنقید ایک سائنس کی حیثیت سے جلوہ گر ہو جاتی ہے، اس میں تحقیق و تجربے کے انداز خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ تنقید ادب میں

موضوعیت (Subjectivity) بڑی ضروری ہے مگر معروضیت (Objectivity) کے بغیر صحیح تنقید ادب ناممکن ہے اور اسی سے تنقید سائنس کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے" (مباحث ص ۳۶۹، ۳۷۰)

سید صاحب کے ہاں اگرچہ تحقیق و تنقید (جیسا کہ ابھی مذکور ہوا) ساتھ ساتھ چلتی ہے تاہم انھوں نے خالص تحقیقی مقالات بھی لکھے ہیں جن میں بعض ایسے ہیں کہ ان پر تفصیلاً سب سے پہلے ان ہی کے قلم نے پردہ کشائی کی ہے مثلاً "شعرائے اردو کے تذکرے" "شہر آشوب کی تاریخ" اور "تخلص کی رسم اور اس کی تاریخ" وغیرہ۔ خالص تنقیدی کتابیں اور مقالات تو وافر تعداد میں ہیں۔

سید صاحب کی تحقیق و تنقید کی بہار دیکھنی ہو تو ان کے مجموعہ ہائے مقالات "مباحث" کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔

ادب اردو کے ناقد کے لیے فارسی اور انگریزی سے بخوبی واقفیت ہونی چاہیے اور اگر وہ عربی سے بھی کماحقہ، واقف ہے تو سونے پر سہاگے کے مترادف ہے۔ سید صاحب کی تحقیق و تنقید میں جو گہرائی اور گیرائی نظر آ رہی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ان تینوں زبانوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔

اردو نقادوں میں سید صاحب کی اعتدال پسندی اور وضع داری مابہ‌الامتیاز ہے۔ ہمارے اکثر ناقدین راہ اعتدال سے دور جا پڑے ہیں چند ایک ایسے ہیں جو عام طور پر معتدل رہتے ہیں مثلاً آل احمد سرور مگر یہی سرور صاحب جب سر سید کے مقابلے میں اکبر الہ آبادی پر یا ابوالکلام آزاد کے اسٹائل یا نثر کے متعلق لکھتے ہیں تو ان کے ہاتھ سے اعتدال کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ یہ صرف سید صاحب ہی ہیں کہ وہ ایسے نازک و دقیق مرحلے پر بھی معتدل روش سے سرمو ہٹنے نہیں پاتے۔ انھوں نے اقبال و حافظ، اقبال و ابوالکلام اور سر سید و اکبر الہ‌آبادی وغیرہ کے درمیان جس طرح ثالثی کے فرائض سر انجام دیے ہیں اردو کا کوئی نقاد اس طرح کامیاب نہیں ہوسکا۔ اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ دو عام آدمیوں کے درمیان بھی ثالثی کے فرائض ادا کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ محولہ بالا عظیم شخصیات کے درمیان صلح صفائی کرانا۔ خود سید صاحب کو اس نازک مقام کا احساس ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"میں جانتا ہوں کہ صفائی کی یہ کوشش دل کی صفائی اور ہاتھ کی صفائی کے باوجود بعض اوقات ناگوار ہی ثابت ہوتی ہیں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ایسی صفائی سے بعض اوقات مصالحت کرنے والے کا اپنا ہی صفایا ہو جایا کرتا ہے۔" (چند نئے اور پرانے شاعر ص ۱۲۹)۔

اس کے باوصف وہ اس ثالثی کی وادیٔ پرخار میں اس شان سے اترے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے ہی دامن کو کانٹوں سے محفوظ رکھا بلکہ متعلقین کی عظمت کو بھی کسی نقصان سے دو چار نہیں ہونے دیا۔ یہ منزل وہی شخص سر کر سکتا ہے جس کی نیت خالص، مطالعہ نہایت وسیع، نظر بڑی گہری ہو، طرفین کے موقف اور ان کے فن کے صحیح ادراک اور ان سے ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی حیثیت کے علاوہ ان کی دینی اور ادبی حیثیت مسلمہ ہے۔ ان کے سیاسی نظریات سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہے مگر پاکستان کے نقادوں نے ان کی ادبی حیثیت کو بھی سیاست کے پلڑے میں تولنا شروع کر دیا ہے۔ پاکستان کے صف اول کے ناقدین میں سید صاحب کے سوا کسی اور نقاد کو ابوالکلام پر لکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ ابوالکلام کے علمی و ادبی مرتبے کے بڑے معترف ہیں۔ اس کا اظہار لیکچروں کے دوران، سیمناروں میں مباحثے کے وقت اور نجی صحبتوں میں بارہا کر چکے ہیں۔ انہی کی کوشش سے ابوالکلام کی "غبار خاطر" ابتدائی برسوں میں ایم۔ اے اردو کے نثر کے پرچے میں شامل رہی مگر بعد میں اسے نصاب سے خارج کر دیا گیا البتہ ان کی خواہش بدستور رہی کہ کسی طرح غبار خاطر دوبارہ نصاب میں شامل ہوجائے۔

سید صاحب کو میر تقی میر سے عشق کی حد تک تعلق ہے، میر پر ان کے بیسیوں مقالات اس پر شاہد عادل ہیں۔ وہ جب میر پر لیکچر دے رہے ہوتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ انہیں میر سے کتنا جذباتی لگاؤ ہے۔ ایک بار میر پر لیکچر دیتے وقت بڑے جذباتی مگر محبت آمیز لہجے میں فرمایا "دیکھو اگر کسی نے میر کے خلاف کچھ کہا تو میں اس کے خلاف لڑوں گا" یہ بھی میر کے ساتھ وابستگی کا ہی نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنی نگرانی میں میر کے چھ دیوانوں پر نئے انداز سے کام

کروایا ہے ۔ یعنی ایم ۔ اے اردو کی دو طالبات کے سپرد تین تین دیوان کر دیے گئے تاکہ وہ ان میں سے میر کی تصویر آفرینی (Imagery) کا جائزہ لیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ کٹھن راستہ سید صاحب کے بغیر کون طے کروا سکتا تھا ۔ اب اس عقیدت کو ایک طرف رکھیے اور دوسری طرف غالب کو دیکھیے ۔ یہ سید صاحب ہی ہیں کہ جنھوں نے میر سے اپنی تمام تر عقیدت کے باوجود غالب کو بحیثیت ایک شاعر اور فن کار کے میر سے بڑا تسلیم کیا ۔ حالانکہ میر کے ایک اور بڑے عقیدت کیش اثر لکھنوی اب بھی میر کو غالب پر ترجیح دے رہے ہیں ۔ وہ سید صاحب سے اس لیے ناراض ہیں کہ انھوں نے غالب کو میر پر کیوں فوقیت دی ہے ۔ ایک تنقید نگار کے لیے سب سے بڑی خوبی اس کے بے لاگ ہونے میں ہے ۔ غالب کے سلسلے میں جہاں ان کی اعتدال پسندی اور بے لاگ رائے کا ثبوت ملتا ہے وہاں ان کی انتقادی ژرف نگاہی اور حقیقت پژوہی کا بھی علم ہوتا ہے ۔ ہمارے ناقدین سرسید و شبلی اور شبلی و حالی کے مطالعے میں بھی تعصب کا شکار ہوئے ہیں (الہ ماشاء اللہ) سید صاحب یہاں بھی بھٹکنے سے بال بال بچے ہیں ۔ ایک اور نازک تر مقام میں انھوں نے جس طرح غیر جانب داری ، اعتدال اور انصاف پسندی کا نمونہ پیش کیا ہے اس کی اہل نظر نے بڑی قدر کی ہے ۔ ان کے استاد گرامی منزلت حافظ محمود شیرانی اور ان کے دوست ڈاکٹر محمد اقبال نے علامہ شبلی کی شعر العجم پر جس انداز سے تنقید کی اور اسی سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی قدس سرہ کے ساتھ ان کے جو علمی مباحثے ہوئے اور بالآخر طرفین کی طبیعتیں کھٹی ہوئیں اس کی بابت اہل علم سب کچھ جانتے ہیں ۔ اس لیے اپنے استاد کی محبت کی وجہ سے عین ممکن تھا کہ ان کی نظر میں شبلی و سلیمان کی عظمت کم ہو جاتی مگر کم ہونے کی بجائے اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا ۔ انھوں نے شبلی پر انگریزی و اردو میں بڑا معیاری لکھا ۔ شبلی کے شاگردوں پر تفصیلی طور پر سر دست تو نہ لکھ سکے البتہ سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی پر ایم ۔ اے کے دو طلبہ سے تفصیلی مقالات لکھوائے ۔ سلیمان ندوی والا مقالہ راقم الحروف کے ذمے تھا ۔ سید سلیمان ندوی کے بے شمار دینی ، علمی اور ادبی کارناموں کی بنا پر میرا خیال یہ تھا کہ میں صرف ان کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لوں مگر سید صاحب نہ مانے اور فرمایا کہ سید سلیمان

کی زندگی کے ایک ایک گوشے پر لکھو'' چنانچہ امتثال امر میں حسب استعداد ایسا ہی کرنے کی کوشش کی گئی - انہوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ اگر سید سلیمان ندوی والا مقالہ حلیہ طبع سے آراستہ ہو کر منصہ شہود پر آیا تو وہ سید سلیمان پر مقدمے کی شکل میں اپنے مفصل خیالات کا اظہار فرمائیں گے -

بحیثیت نقاد ان کی ایک اور خوبی قابل قدر ہے - ان کی عادت ہے کہ جب وہ کسی موضوع پر قلم اٹھانے لگتے ہیں تو بالعموم اس پر ہر لکھنے والے کے خیالات کو سامنے رکھتے ہیں اس کے بعد وہ ایک نئی چیز پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں - اس کا سب سے زیادہ فائدہ قاری کو یہ ہوتا ہے کہ اسے متعلقہ موضوع پر دیگر ناقدین کی آراء کا بھی علم ہو جاتا ہے - اس لیے اسے سید صاحب کے دلائل کی مضبوطی اور نئے پن کا صحیح احساس ہو جاتا ہے ایسے میں وہ اپنے اندر ایک یقین اور انبساط کی ملی جلی کیفیت سے دو چار ہوتا ہے یہ چیز تبھی نصیب ہو سکتی ہے جبکہ نقاد کے اندر ایک ہی وقت میں تحقیق ، تنقید اور تخلیق کی روح کار فرما ہو -

اردو تنقید نگاروں میں سید صاحب اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی تنقید و تحقیق کا دائرہ بڑا وسیع ہے - نثر و نظم ، شعر و ادب ، نظری و عملی تنقید وغیرہ ہر موضوع پر کثرت سے لکھا مگر جو کچھ لکھا اسے خاصے کی چیز بنا دیا - آپ ان کی تحریروں میں نہ تکرار پائیں گے نہ تضاد ، البتہ بعض مواقع پر ان کی تنقید میں تھوڑی سی تشنگی سی محسوس ہوتی ہے اس کا سبب جو میری ناقص سمجھ میں آ سکا یہ ہے کہ سید صاحب وضع داری کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں اس لیے ان کے ہاں بعض جگہ وضاحت کی بجائے ابہام کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے مگر اب کچھ عرصے سے وہ دو ٹوک بات کہنے کے شعار کو اپنا رہے ہیں -

اردو کے کئی ایک نقاد ایسے بھی ہیں جن کا انتقادی شعور بہت منجھا ہوا اور جن کا بحیثیت ایک ناقد بہت اونچا مقام ہے مگر وہ بسا اوقات اپنے دلائل کی کمزوری حسین اسٹائل اور انشا پردازی کی ظاہری چمک دمک سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں ، قاری ان کے دلکش اسلوب بیان سے متاثر ہو کر ان کی دلیلوں کی سطحیت کو بھول جاتے

ہیں ۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جب ان پر طرز نگارش کے جادو کا اثر زائل ہونے لگتا ہے تو انہیں دلائل کے بودے پن کا احساس ہوتا ہے ۔ سید صاحب ایسے کسی حربے کو استعمال نہیں کرتے اسی لیے ان کی تنقیدی نگارشات کا بڑا وزن ہے اور ان کا اثر دیرپا ہے ۔

دوسری چیز جس نے مجھے بلکہ ان کے تمام شاگردوں کو بے حد متاثر کیا ہے وہ ہے ان کی تدریس کی خصوصیت ۔ ایک کامیاب ترین اور معیاری مدرس و استاد کی حیثیت سے ان کی شہرت و مقبولیت اظہر من الشمس ہے اس لیے اس کا تفصیلی تذکرہ تحصیل حاصل ہے ۔ ان کے بڑے سے بڑے معترض کو بھی ان کی اس خوبی کا معترف ہی پایا ہے ۔ پڑھانے کے فن سے وہ فطری طور پر مناسبت رکھتے ہیں ۔ اس پر جتنا انہیں فخر ہے اس سے کہیں زیادہ ان کے شاگردوں کو خوشی ہے کہ انہیں ایسے مشفق و بہترین استاد کے آگے زانوے ادب تہہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ۔

اردو کے جتنے بھی نقاد یا استاد ہوئے وہ عام طور پر ایک یا دو زبانوں کے استاد ہوئے ہیں مگر سید صاحب بیک وقت تین زبانوں میں درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھے رہے (کچھ عرصے کے لیے ایم ۔ اے اسلامیات کو بھی پڑھایا ہے) یعنی عربی ، فارسی اور اردو اس سے ان کی جامعیت علمی کا پتہ چلتا ہے ۔ سید صاحب کو اپنے پڑھانے کی کامیابی اور مقبولیت کا احساس بھی رہتا ہے ۔ چنانچہ وہ لیکچر کے دوران جملہ ہائے معترضہ کے طور پر علامہ شبلی کے درس کی مقبولیت اور دلچسپی کا تذکرہ کیا کرتے تھے شبلی کے درس کی مقبولیت کا انہیں علم ہوگا جنھوں نے سنا ہو ہم تو سید صاحب کے درس کو نمونہ سمجھ کر شبلی کے درس کی مقبولیت کا قیاس کر لیتے تھے ۔

تدریس کے فن میں ان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کے متعلق خوب اچھی طرح سوچ بچار کرکے آتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ نے کبھی کوئی تشنگی محسوس نہیں کی ہے ۔ تحریروں میں اگر کہیں انہوں نے وضع داری سے کام لیتے ہوئے زیادہ کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہ بھی کیا ہو مگر پڑھاتے وقت انہوں نے کسی کی رو رعایت نہیں کی ۔ کھلم کھلا اپنے فیصلے سے آگاہ کیا ہے ۔ لیکچر دیتے وقت ان کی طبیعت بڑی شگفتہ رہتی ہے ، پھر دوران تقریر وہ جملہ

ھائے معترضہ ، علمی لطائف اور اشعار کا بر محل استعمال کر کے جماعت کی فضا کو زعفران زار بنا دیتے ھیں - ان کا اردو کا لیکچر بالعموم تیسرے چوتھے پیریڈ میں ھوتا تھا یہ وہ وقت ھوا کرتا تھا کہ طلبہ ایک دو لیکچر سن کر اکتاھٹ کا شکار ھو جایا کرتے تھے ایسے میں سید صاحب کا لیکچر ان کی تمام تھکاوٹ کو دور کر دیا کرتا - ایک گھنٹے کا پیریڈ ھوا کرتا تھا لیکن وہ بعض اوقات ڈیڑھ گھنٹے تک پڑھاتے رھتے ، اس کے باوجود طلبہ کو وقت کا احساس تک نہ ھوتا اور وہ ھمہ تن گوش ھو کر لذت و فرحت سے ھمکنار ھوتے رھتے -

وہ اپنے لیکچر کو کس طرح دلچسپ بناتے ھیں اس کی چند ایک مثالوں سے شاید وضاحت ھو جائے - ایک بار غزل گوئی کے ارتقا پر مختصراً گفتگو فرما رھے تھے مگر جگر مراد آبادی کا ذکر کرنا بھول گئے - احقر نے اختتام تقریر پر عرض کیا کہ کیا جگر اس قابل بھی نہیں کہ ان کی غزل گوئی کا تذکرہ کیا جائے - اس پر زیر لب تبسم فرماتے ھوئے یک لخت جواب دیا ''جگر یقیناً اس قابل ھیں ان کا ذکر ضرور کرنا چاھیے مگر عزیز من ! آپ کو علم ھوگا کہ میں دریا کو کوزے میں بند کر رھا تھا - ظاھر ھے کہ جب بہت سی چیزوں کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی نہ کوئی چیز باھر رہ جاتی ھے - یہی حال جگر کا ھوا'' اس کے بعد جگر کی غزل کی ایک آدھ خصوصیت کی طرف اشارہ کیا -

علامہ اقبال کی شاعری پر تبصرہ کرتے ھوئے Allegory کا ذکر کیا - ''فرمایا میرا دل چاھتا ھے کہ انگریزی کے اس لفظ کو اردو میں جوں کا توں استعمال کر لینا چاھیے بعض حضرات نے اس کا ترجمہ ''تمثیل'' کیا ھے جو مناسب معلوم نہیں ھوا کیونکہ ڈرامے کا ترجمہ بھی تو تمثیل کیا گیا ھے -'' معاً بڑے شگفتہ انداز میں فرمایا ''مگر الیگری کے لفظ کو اپنانے میں ایک دقت ھے کیونکہ اس کی جمع الیگریاں کرنا بڑا بھدا معلوم ھوگا'' لفظ الیگریاں کو اس طرح مزاحاً فرمایا کہ تمام جماعت ھنس پڑی - سید صاحب نے الیگری کا ترجمہ تصویر آفرینی کیا ھے جو بہت ھی مناسب ھے - جب کبھی وہ جملہ ھائے معترضہ کا استعمال کرتے تو اصل موضوع کی طرف لوٹنے سے قبل یہ جملہ فرماتے '' ھاں تو عزیزان من ! میں یہ کہہ رھا تھا'' اس جملے کی

لذت کو طلبہ ہی جانتے ہیں کہ اس سے کتنی شفقت ٹپکتی تھی۔ کبھی یہ بھی کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی کچھ اس طرح کی با معنی گفتگو شروع کر دیتے جس سے طلبہ کو تازگی مل جاتی۔ وہ چونکہ مشرقی تہذیب اور اسلامی روح کے دلدادہ تھے اس لیے وہ طلبہ کی تربیت کو بھی استاد کے فرائض میں شمار کرتے تھے۔ ان کے لیکچر کے دوران جملہ ہائے معترضہ صرف اسی مقصد کے پیش نظر ہوتے جس میں معاشرتی، سماجی اور قومی مسائل کا بڑے لطیف بلکہ بعض دفعہ طنزیاتی انداز میں تذکرہ ہوتا تھا۔ وہ مردم شناس بھی ہیں اس لیے وہ جس کسی طالب علم میں کچھ صلاحیتیں دیکھتے تو اس کا جماعت میں ذکر خیر کر کے چند ایک جملے ایسے کہہ دیتے جس سے اس کی ڈھارس بندھتی۔

انہوں نے بڑھاپے کی عمر کے باوصف ہمیشہ کھڑے ہو کر لیکچر دیا اور یونیورسٹی کی ملازمت کے چالیس سال (جس میں بتیس سال تدریس کے ہیں) کے دوران شاید ہی انہوں نے کسی ذاتی کام کے لیے چھٹی لی ہو اس سے ان کے تدریس کے فرائض اور تعلیمی انہماک کا پتہ چلتا ہے۔

سید صاحب کے علمی، ادبی، تصنیفی انہماک اور تدریسی شغف کے پیش نظر جب ان کی تنظیمی صلاحیتوں کی طرف نگاہ اٹھتی ہے تو حیرانی ہوتی ہے کہ وہ کیوں کر انتظامی امور جیسی نازک اور وزنی ذمہ‌داری سے عہدہ برآ ہوسکے۔ اہل علم و قلم حضرات (اور اس کے ساتھ اگر وہ مدرس بھی ہوں) تو علم کے اتھاہ سمندر میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ انہیں گرد و پیش کی خبر تو کیا بسا اوقات اپنے احوال کی بھی پوری خبر نہیں ہوتی لیکن سید صاحب با ہوش واقع ہوئے ہیں وہ بحیثیت منتظم (صدر شعبہ عربی، اردو فارسی، اسلامیات، لائبریرین اور پرنسپل وغیرہ) معاملات کی تہہ تک اس قدر جلد پہنچ جاتے کہ عقل دنگ ہو کر رہ جاتی۔ انہوں نے اپنی حکمت عملیوں سے بغیر ڈانٹ ڈپٹ کے جس طرح اپنے ماتحتوں سے کام لیا یہ انہی کا حصہ ہے۔ بعض حضرات کو ان کی پالیسیوں اور اقدام سے اختلاف بھی ہوتا مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کی نیت بخیر نہیں ہوتی تھی یا وہ کسی کے در پے آزاد تھے۔ یہ دوسری چیز ہے کہ ایسا منتظم شاید ہی کوئی ہوا ہو جس

کے ہر فعل سے کسی کو کوئی اختلاف نہ ہوا ہو۔ سید صاحب اس کلیے سے کیسے مستثنیٰ رہ سکتے تھے۔ ایک بہترین منتظم کی خوبی یہ تصور کی گئی ہے کہ اس کے اندر ضبط کا مادہ زیادہ مقدار میں ہو۔ سید صاحب بڑے متحمل مزاج واقع ہوئے ہیں۔ اپنے ماتحتوں کی کوتاہیوں کے باوجود جس طرح ضبط و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی، برداشت کی یہ قوت اور غصے کو پینے کی یہ عادت انہیں بڑے ریاض کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ بہر کیفیت بحیثیت مجموعی وہ ایک کامیاب منتظم ثابت ہوئے ہیں۔

زبان و ادب کے طالب علم گہرے سیاسی شعور سے قریباً عاری ہوتے ہیں سید صاحب جیسے طالب علم جو بیک وقت چار زبانوں (اور اگر جرمنی کو بھی شامل کر لیا جائے تو پانچ) کے مطالعے میں محو تدریسی، انتظامی اور قومی کاموں میں مصروف رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود سیاسی شعور سے بڑے بہرہ ور ہیں۔ ان کی سیاسی بصیرتوں کا اعتراف ہر اس شخص کو ہے جسے ان سے بالمشافہ گفتگو کرنے یا ان کے جماعت کے لیکچر سننے کا موقع ملا ہے۔ انتظامی امور میں کامیابی ایک لحاظ سے اسی سیاسی شعور کی مرہون منت ہے۔

ان کی صحبت میں یہ فیض دیکھا ہے کہ جو کوئی بھی ان کے زیادہ قریب ہوا اسے لکھنے پڑھنے کا شوق دامن گیر ہو گیا۔ کتنے اہل قلم ایسے ہیں کہ جنہیں لکھنے کی طرف برائے نام توجہ تھی مگر ان کی قربت کی وجہ سے آج وہ بحیثیت ایک اہل قلم اپنا ایک مقام بنا رہے ہیں اور کچھ بنا چکے ہیں۔ اورینٹل کالج میں بھی انہوں نے علمی اور تصنیفی ماحول بنانے کی کوشش کی اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

سید صاحب اپنے اساتذۂ کرام کا بڑے ادب کے ساتھ تذکرہ فرماتے ہیں میں نے انہیں اپنے فاضل استاد مرحوم ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی خدمت میں جس طرح مؤدب پایا اس کو دیکھ کر ہمیشہ ہی رشک پیدا ہوا۔

باہمہ مختلف عہدوں، وسیع حلقۂ شاگردان و عقیدت مندان اور باوصف کثیر مقالات اور ڈیڑھ دو درجن کتب کے مصنف ہونے کے سید صاحب کو ہمیشہ ہی عاجز و مسکین پایا، غرور، تفخر اور رعونت سے

خالی دیکھا - یہی ان کی باکمال شخصیت ہونے کی دلیل ہے - دنیا کے عظیم و سعادت مند انسان ہمیشہ ہی فروتنی کو دل میں جگہ دیتے آئے ہیں - سید الاولین والآخرین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبول ترین دعا یہ تھی الھم احیینی مسکیناًو وامتنی مسکیناً احشرنی فی زمرۃ المساکین (او کما قال) اس سے پتہ چلتا ہے کہ بارگاہ رب العزت میں فروتنی و عاجزی کی کتنی قدر و قیمت ہے - سید صاحب جب اپنے متعلق ایک ہیچمدان یا ایک طالب علم جیسے الفاظ کہتے یا لکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے کہہ رہے ہیں - ایک دفعہ لیکچر دیتے وقت فرمایا کہ میں نے ہزاروں صفحات لکھ مارے ہیں لیکن ابھی تک ایک ایسی سطر نہیں لکھ سکا ہوں جو مجھے زندہ رکھ سکے - سید صاحب نے جس سوز اور عاجزی سے یہ فقرہ کہا اس کا دل پر بڑا اثر ہوا - میں نے اپنے ایک ملنے والے پروفیسر سے (جو سید صاحب پر اکثر اعتراض کیا کرتے ہیں) جب مذکورہ جملے کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ سید صاحب انکساری سے ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ انہوں نے سینکڑوں ایسی سطور لکھ دی ہیں جو انہیں زندہ و پائندہ رکھیں گی -

وہ ایک مفکر ماہر تعلیم بھی ہیں - انہوں نے قومی تعلیمی مسائل کے بارے میں خطبات و مقالات کی صورت میں بڑی کثرت سے لکھا ہے - اسی طرح معاشرتی اصلاح کے متعلق بھی بعض بڑے خیال افروز مقالات و انشائیے سپرد قلم کیے ہیں - انہوں نے تعلیمی اور اصلاحی موضوعات پر لکھتے وقت ہمیشہ ہی مشرقی روح ، اسلامی تہذیب اور انسانی عنصر کو ابھارنے کی کوشش کی ہے - انہیں علوم شرقیہ کی ترقی کا ہرآن خیال رہا اور اس سلسلے میں انہوں نے بڑی جد و جہد کی ہے -

جہاں تک اردو کے مسائل اور اس کی ترویج کا تعلق ہے انہوں نے جس طرح اس کے لیے تگ و دو کی اور اس کی خاطر قربانیاں دی ہیں وہ ان کی حیات کا روشن ترین باب ہے - حقیقت یہ ہے کہ وہ "فنافی الاردیہ" ہیں - ان کی اردو خدمات کا باب بڑا طویل ہے اس لیے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں -

---

ڈاکٹر سید عبداللہ

میرا جواب

برسبیل شکر و حکایت

صدر محترم ! خواتین و حضرات !

میں اپنے محسنوں ، دوستوں ، اور ہم درس رفیقوں کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری عمر کے ساٹھ سال ختم ہونے پر ، میری عزت افزائی کے لیے اس تقریب کا اہتمام کیا ، میرا دل جذبات سپاس سے لبریز اور احساسات شکر گزاری سے لبالب ہے ۔ اور میں اس کو خدا تعالیٰ کا انعام خاص سمجھتا ہوں کہ اس نے اس حقیر پر تقصیر کو ایسے مخلص رفیق عطا فرمائے جن کے دل میں مجھ سے محبت میرے حق سے بہت زیادہ اور میرے لیے شوق اعتراف میری کار کردگی کی نسبت سے ہزار گنا زیادہ ہے ۔ میں اس پر خدا تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہی ہوگا ۔

ابھی ابھی بتایا گیا ہے کہ اس تقریب کے سلسلے میں سب سے زیادہ عدم تعاون خود میں نے کیا ـــــ میرا خیال ہے کہ لفظ کا انتخاب صحیح نہیں ہوا ، عدم تعاون کی جگہ اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ سب سے زیادہ اس تقریب پر حیرت بلکہ تشویش جس شخص کو ہوئی وہ میں تھا ، تو شاید میرے رویے کی صحیح ترجمانی ہوتی ـــــ یہ حیرت و تشویش مجھے اس لیے ہوئی کہ میرے نام سے جو کارنامے منسوب کیے جا رہے ہیں ، ان میں سے کسی ایک میں بھی ، میں کوئی شائستہ خدمت انجام نہیں دے سکا ۔ مجھے ایک آدھ چیز کے سوا کسی معاملے میں بھی بقدر ذوق یا بقدر شوق کامیابی حاصل نہیں ہوئی ـــــ یوں محض ذوق و شوق کی اگر کچھ قیمت ہے تو اس کا حقدار بننے میں مجھے کوئی عذر نہیں ـــــ اگر آپ میرے شوق یا لگن کا کچھ اعتراف فرما رہے ہیں

تو آپ کا شکریہ ادا نہ کرنا حق ناشناسی بلکہ اپنے دل کے ساتھ بے وفائی ہو گی ، مگر کیا محض لگن کسی ایسے ھنگامے کے لیے کافی وجہ جواز ھے ؟

حیرت آغاز و انتہا ھے
آئینے کے گھر میں اور کیا ھے ؟

میں نے اب تک اس وجود بے سود سے جو کام لیے ان کی فہرست غبار کی ایک لکیر کے سوا کچھ نہیں - مدرسی ، تحریر و تصنیف ، کچھ عملی جد و جہد ـــ ! مدرسی سب سے زیادہ دل کے قریب رھی ، شاید کالے گئون میں خود کو اپنا وجود اچھا لگتا تھا ـــ شوق تدریس میں چھ سات پشتوں کی وراثت بھی شاید کار فرما ہوگی - مگر وہ پہلی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ھے کہ کالے گئون میں خود کو اپنا وجود اچھا لگتا تھا ـــ بہ آب جو نگرم خویش را نظارہ کنم ، اس خود نگری پر آپ جو کچھ چاھیں کہہ سکتے ھیں مگر مجھے معلوم نہیں کہ میں ستائیس اٹھائیس برس کی تدریس میں کسی کو کچھ دے بھی سکا یا نہیں - اتنا ضرور یاد ھے کہ میرے بعض شاگرد جب خود استاد بن گئے تو میری پیروی کے جرم میں یا تو اداروں میں معتوب ہونے یا میری طرح ، تدریس کے مسند ھی سے ھٹا دیے گئے ! نقل کا جرم واقعی سخت تھا مگر خود اصل میں کیا تھا کہ کوئی میری نقل آتارتا - تاھم عزیزوں کی محبت قابل داد ھے کہ وہ پھر بھی میرے قریب رھے ، شاید میری یہ لغزش بھی دل خراش تھی کہ میں طالب علموں کے بارے میں ، اپنی بساط سے بڑھ کر سوچنے کا شوق رکھتا تھا :

نہ مارا جان کر بے جرم ، قاتل تیری گردن پر
رھا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا

(غالب)

رھا تحریر و تصنیف کا معاملہ ، سو اس میں بھی میرے محسن اور دوست اپنے خیال میں جو کچھ چاھیں گمان کر لیں ، خود مجھے اپنی کسی تحریر سے کبھی تسلی نہیں ہوئی ، کئی ہزار صفحات میں سے مجھے اپنی صرف دو تحریریں اچھی لگی ھیں ، ایک تو وہ مضمون جس کا عنوان "میں اور میر" ھے (جو اب نقد میر کا حصہ ھے) اور دوسری تحریر ھے

''راکھ کا ڈھیر'' جس کی راکھ محبی الطاف حسن قریشی نے میری آپ بیتی سمجھ کر اڑائی ہے۱ - اس کے سوا جو کچھ ہے شوق خامہ فرسائی ، محنت اور مجبوری کا مظاہرہ ہے--شاید چار سطریں بھی ایسی نہ ہوں گی جو مجھے زندہ رکھ سکیں -

اب آیا عملی جد و جہد کا معاملہ ، سو اس میں میری کوئی خصوصیت نہیں ، اس عملی جد و جہد کا تعلق قومی عقیدوں سے ہے - میرے سامنے بھی یہی عقیدے تھے ، مجھ سے یہ عقیدے جو کچھ کہتے رہے ، میں ان کے مطابق بھاگ دوڑ کرتا رہا--لڑکپن میں ، مولانا محمد علی ، مولانا ابوالکلام ، مولانا ظفر علی خان ، اور چودھری افضل حق کو بھاگ دوڑ کرتے دیکھا تھا ، میں بھی نقل آتارنے کی کوشش کرتا رہا - ورنہ ملازمت اور عملی جد و جہد میں وہی رشتہ ہے جو برق و خرمن میں تسلیم کیا جاتا ہے ، یا یوں کہیے کہ گاہ بہ سلامے برنجند و گاہ بدشنامے خلعت بدھند - یہ واضح رہے کہ میں نے عمر بھر بھی دشنام کسی کو نہیں دی کہ خلعت حاصل کر سکتا - البتہ سلام اکثر کرتا رہا ، اسی لیے اس کا صلہ میرے حق سے کہیں زیادہ مجھے ملتا رہا مگر صلہ و ستائش کی یہ کہانی بیان ہو تو کیسے ؟

کبھی شکایت رنج گراں نشیں لکھیے
کبھی حکایت صبر گریز پا کہیے

سو یہ ہے اس کار کردگی کی حقیقت جس کا انکشاف میں نے کر دیا ہے--! اس سارے عرصے میں کچھ تجربے (جو طویل ملازمت اور عملی زندگی میں لازمی طور سے ہر شخص کو حاصل ہو سکتے ہیں) مجھے بھی حاصل ہوئے - ان کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہوگا -

میں اپنی شعوری زندگی میں مسلسل پچیس سال مخلصانہ تجربوں کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ متاع خلوص کی اس بازار سود و زیاں میں قیمت کیا ہے ؟ معلوم ہوا کہ نفع پرستی کے اس دور میں اس کا دوسرا نام نادانی ہے مگر یہ جانتے ہوئے بھی نادانی پر مصر اس لیے رہا کہ میری لگن نے باقی سارے راستے بند کر رکھے

۱- اس مضمون کا ایک حصہ ''اردو ڈائجسٹ'' سے لے کر اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے - (م - م)

تھے - مجلسی سطح پر یہ بھی معلوم کرتا رہا کہ نیکی اور درد مندی کا ہماری عملی زندگی سے کیا تعلق ہے ؟ اور ایک فرد کے لیے آج ان لفظوں کے کچھ معنی وہ بھی گئے ہیں یا نہیں - میں علی الاعلان اپنی اس ناکامی کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں ان دو مقدس الفاظ کے تقدس تک نہیں پہنچ سکا - میں بڑے سے بڑے انسانی دکھ کے مسئلوں کو دیکھتا ہی نہیں رہا ان سے گزرتا بھی رہا - مگر پھر بھی اجنبی ہی رہا - یہ احساس ہمیشہ رہا کہ میر اور کبیر اور دوستوفسکی اور طالسطائے اچھے مسلک کے لوگ تھے مگر خواجہ حافظ نے کچھ اور کہا - غرض مسلسل تجربے کیے پھر بھی کچھ نہ کھلا کہ معاملہ کیا ہے -

اب احساس یہ ہے کہ سوسائٹی عموماً دکھ اور انسانیت کے معاملے میں بے حس ہوتی جا رہی ہے - ممکن ہے کہ میرا یہ انفرادی تجربہ محدود اور غلط ذہنی پیش قدمی کا نتیجہ ہو یا یہ ہے کہ اس سائنسی دور میں ابوبکر شبلی کی سی ذکاوت حس ممکن ہی نہیں اور حکایت ابوبکر شبلی کی یہ ہے کہ اس نے دیکھا : ایک چرواہا ایک بیل کو بڑی بے رحمی سے مار رہا ہے - شبلی نے بیل کا درد محسوس کیا ، اسے نظر آیا کہ لاٹھی کے نشان خود اس (شبلی) کی پیٹھ پر لگ رہے ہیں اور ضربات سے اسے وہی تکلیف محسوس ہو رہی ہے جیسی کہ قدرتاً ایسی ضربات سے ہونی چاہیے -

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اس تقریب میں ابوبکر شبلی کی حکایت بیان کرنے میں یا سوسائٹی کے سامنے یہ مسئلہ رکھنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں مگر اس سے میں انکار نہیں کر سکتا کہ درد انسانیت ایک ایسی اپیل ہے جو ہر دین و ملت کی بنیاد ہے - اور اسلام تو اس عقیدے کی شاہراہ اعظم ہے ! پس یہ سوال ہر سننے والے سے ہے کہ انسانوں کی اس دنیا میں خود انسان کا ساتھی بھی کوئی ہے یا نہیں ؟ خدا ہر جگہ ہے اور آسمان پر بھی ہے ، وہ سمیع و بصیر ہے مگر کیا کہیے ! زمین پر اس کے نائب بر حق کی امت اس کی نمائندگی کر رہی ہے مگر کیا لکھیے ! پھر آپ ہی فرمائیے کہ اس نگری میں بے دردی اور گداگری کس شرع کی رو سے روا ہے ! اس وقت انسان سے بڑھ کر انسان کا دشمن کوئی نہیں اور لازماً مسلمان سے بڑھ کر مسلمان کا بدخواہ بھی کوئی نہیں - بدی کے تہہ بہ تہہ سلسلوں کو ذرا چھیڑیے

تو سہی پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے ؟ حضرات ! میں غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا اشارہ اس وقت اجتماع کی طرف نہیں فرد کی طرف ہے - اس سے یہ مراد نہیں کہ میں اجتماع کو مانتا ہی نہیں ، مانتا ہوں مگر میں اجتماع کی خاطر بھی پہلے فرد ہی کو تسلیم کرتا ہوں - اور میرا خطاب اسی سے ہے -

میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ کہنے کی گنجائش نہیں - اب چند جملے تجدید عزم کے سلسلے میں کہنا چاہتا ہوں - مگر سچ یہ ہے کہ انسان کیا اور اس کا عزم کیا ؟ البتہ خدا تعالیٰ سے دعا ضرور کی جا سکتی ہے اور میں آپ کے ہمراہ خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں ان تمام مقاصد کے لیے آئندہ بھی کام کرنے کا موقع دے ، جن کے لیے ہم اس سے پہلے کچھ نہ کچھ کرتے رہے ہیں - جو مقاصد ہمارے پیش نظر ہیں ان کی فہرست آپ کے علم میں ہے - اس وقت دھرانے کی ضرورت نہیں - مجھے یقین ہے کہ ہم کچھ نہ کچھ کرتے رہیں گے توفیق خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے -

میں آخر میں جناب صدر آپ کا اور اس تقریب کے جملہ منتظمین کا اور بزرگوں ، دوستوں اور عزیزوں کا صدق دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کی اور مجھے میرے فرض کی طرف متوجہ کیا - خدا تعالیٰ آپ سب کو جزائے خیر دے -

راجه رشید محمود

یوم تجدید عزم

۵ اپریل کو "مجلس ارادت مندان سید" کے زیر اہتمام اردو فارسی ، عربی اور انگریزی پر یکساں قدرت رکھنے والے محسن زبان اردو ، ممتاز ماہر تعلیم اور مشرق پسند مفکر ڈاکٹر سید عبداللہ کی ساٹھویں سالگرہ ، انجمن ترقی اردو اور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے دفاتر واقع نواں کوٹ کے ملحقہ میدان میں بعنوان "یوم تجدید عزم" منائی گئی -

ڈاکٹر سید عبداللہ کے علمی ، تعلیمی ، تنقیدی اور تحقیقی کارناموں سے ملک کا ہر پڑھا لکھا آدمی واقف ہے - آپ تنقید و تدریس میں اعتدال ، دقت نظر ، اصول پسندی اور اپنی طبیعت کی روایتی نرمی اور دھیمے پن کے زیر اثر صحیح صحیح فیصلے صادر کرتے ہیں - اور دشمنی ، کد ، بیر اور نفرت تو شاید انہیں دنیا میں کسی سے بھی نہیں ہے - ان سے بھی نہیں ، جنھیں آپ نے اپنی آستین میں پالا اور انھوں نے بار بار آپ کو ڈسا :

کوئی حد ھی نہیں اس احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جس نے سید صاحب کو کئی موقعوں پر انتہائی دکھ پہنچائے ہیں ، مگر سید صاحب کی زبان سے آخری بات اس شخص کے متعلق میں نے ہمیشہ یہی سنی ہے کہ انھوں نے اردو کی خدمت کی ہے ، میں ان کے خلاف کچھ کہنا یا سننا نہیں چاہتا -

سید صاحب میر کو اپنا مرشد مانتے ہیں - لیکن تنقید میں غالب

کو میر پر فوقیت دیتے ہیں - آپ اقبال کے عاشق ہیں - فرمایا کرتے ہیں اقبال کا نام بھی عقیدت و احترام سے لینا چاہیے - فلسفے کی دنیا نے تین ہی تو عظیم انسان پیدا کیے ہیں - افلاطون ، کانٹ اور اقبال -

سید صاحب موازنہ کرتے وقت کسی شخصیت یا کسی دبستان کو سرے سے برا کہہ دینے کے قائل نہیں ہیں - دہلویت اور لکھنویت یعنی ادب میں داخلیت اور خارجیت کا مسئلہ ہو ، یا تصویریت اور رمزیت کا فرق - افلاطونی شاعری ، خالص شاعری ، اور مابعدالطبیعاتی شاعری کا ذکر ہو یا تاثراتی ، جمالیاتی ، عمرانی ، سائنسی اور نفسیاتی طریقہ ہائے تنقید کی بحث—وہ خرابیوں کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں کہ ہمارے دل میں کسی شخصیت یا دبستان یا نظریے سے نفرت نہیں پیدا ہوتی -

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب طلبہ کی تدریس میں مشغول ہوں یا احباب کی محفل میں ، آپ کی بذلہ سنجی ، نکتہ رسی ، ادیبانہ اور عالمانہ لطائف آپ کا طرۂ امتیاز ہیں - سید صاحب پڑھاتے وقت ہنسنے ہنسانے کے بھی قائل ہیں لیکن بہر حال وہ ایک بہترین منتظم ہیں اور قواعد و ضوابط کے معاملے میں خاصے سخت گیر ، گو ان کی سزائیں زیادہ تر نفسیاتی ہوتی ہیں -

استاذی سید صاحب اپنے آپ کو بنیادی طور پر اُستاد تصور کرتے ہیں - اور میں سمجھتا ہوں کہ درس و تدریس کا مشغلہ ہی سید صاحب کی زندگی ہے - :

یہ نہ ہو گر ، تو زندگی کیسی

آپ مشکل سے مشکل موضوع کو اپنے خطبے میں انتہائی سہل زبان میں بیان فرماتے ہیں - ایک ایک بات کو کئی مرتبہ دہرا کر ذہن نشین کراتے ہیں - اور پھر طلبہ کو تازہ دم رکھنے اور ان کی توجہ ہر لحظہ اپنی طرف مبذول رکھنے کے لیے اپنی طبیعت کی شگفتگی اور علمی و ادبی لطائف ، بر محل اشعار ، اپنے مخصوص اور دلکش انداز میں مختلف حکایتوں اور روایتوں کے بیان سے کام لیتے ہیں -

ہنسنے ہنسانے کی ان سب کوششوں کے ساتھ سید صاحب ایک پر درد دل کے مالک اور غم پسند اور درد مند انسان ہیں - آپ کا

غم اور مسرت کا فلسفہ مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے۔

''زندگی کے اس دکھ ساگر میں جہاں آرزوؤں کی کشتی تیرتی کم اور ڈوبتی زیادہ ہے، ہزاروں دکھی انسان بستے ہیں۔ اس میں گاہے ایک میٹھا بول اور ایک مشفقانہ مسکراہٹ وہ کام کر سکتی ہے جو کسی پرانی کہانی میں ایک چھوٹے سے پتے نے ایک ڈوبتے ہوئے مور ناتواں سے کیا تھا——جس دن آپ یہ میٹھا بول بولنے پر یا اس مشفقانہ مسکراہٹ پر قادر ہو جائیں گے۔ اس دن مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ اس ملک کی تہذیب اب خارجی آلائشوں سے داخلی طہارتوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔''

سید صاحب ایک مشرق پسند مفکر ہیں۔ آپ نے علوم مشرق کو ان کا صحیح مقام دلانے کے لیے اور اردو کو دفتری اور سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں جو کار ہائے نمایاں کیے، قوم انہیں کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ جب علوم مشرقیہ کے فاضل امتحانات کو ثانوی تعلیم کی سطح کی چیز قرار دے دیا گیا، تو سید صاحب نے فرمایا:

''علوم مشرقیہ کے فاضل امتحانوں کا صحیح مقام یونیورسٹی ہی ہے——خصوصاً آنرز یا فاضل کا درجہ تو کسی طرح ثانوی تعلیم کی سطح کی چیز نہیں——مولوی فاضل کے موجودہ نصاب پر نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نصاب تعلیم کے اعلیٰ درجوں کے مطابق ہے۔ اور اگر اس کو انٹرمیڈیٹ کے درجے پر لایا گیا ہے تو اس کا سبب ان علوم کی یتیمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ پاکستان میں ان کے بارے میں اس قسم کی یتیمی کے لیے کوئی وجۂ جواز موجود نہیں۔''

استاد گرامی منزلت تنقید میں ورڈزورتھ اور ٹی، ایس، ایلیٹ کا تذکرہ کرتے ہیں تو جاحظ، ابن رشیق اور شمس قیس کو نہیں بھولتے۔ آپ کا خیال ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے اسلاف کو جاہل سمجھنے کی روایت بڑی غلط ہے، اس کا سدباب ہونا چاہیے فرماتے ہیں:

''میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ ہم اپنے مدرسوں میں ضرور

ملا صدرا اور شمس بازغہ ہی پڑھاتے ، مگر کم سے کم ہر سال نکلتی ہوئی نئی نسلوں کو اتنا جان لینے میں کیا مضائقہ تھا کہ الجبرے میں کوئی خیام اور خوارزمی بھی تھا ۔ کیمیا میں کوئی ابن حیان بھی تھا فلسفے میں کوئی ابن رشد اور ابن سینا بھی تھا ـــــ لیکن ہوا یہ کہ ہم میکالے کے بہکانے میں آ گئے اور اپنے اسلاف کو جاہل اور بے علم سمجھ کر شاہ ایڈورڈ کی دہائی دینے لگے ــــ کہ اے شاہنشاہ فلک بارگاہ ! اگر تو نہ ہوتا تو ہم ناخواندہ ہی رہتے اور علم کی دیوی ہمیں قیامت تک منہ نہ دکھاتی ــــ کتنا غلط خیال تھا یہ :

آنچہ ما کردیم بر خود ہیچ نا بینا نہ کرد
درمیان خانہ گم کردیم صاحب خانہ را"

ایک عالم جانتا ہے کہ سید صاحب نے پاکستان میں سائنس کی ترویج کے سلسلے میں شاندار خدمات انجام دی ہیں ۔ اور اس وقت بھی مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سائنس کے فروغ کے لیے مؤثر اقدام کر رہی ہے ، بیک وقت کئی منصوبوں پر کام ہو رہا ہے ـــــ لیکن سید صاحب کی عظمت یہ ہے کہ وہ علم کے کسی شعبے اور زندگی کے کسی حصے میں اسلام سے قطع نظر نہیں کرتے ۔ ارشاد فرماتے ہیں :

"سائنس کا ہر استاد اپنے شاگرد کو صاف صاف بتا دے کہ مغرب کے عام سائنسی تفکر کے برعکس پاکستان کا سائنسی تفکر خدا اور الہام کو ایک زندہ حقیقت مانتا ہے اور اس کے بغیر ہر تصور کو نا مکمل خیال کرتا ہے اور پاکستان میں کسی ایسے سائنٹفک نقطۂ نظر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی جس میں خدا اور الہام کو تسلیم نہ کیا گیا ہو ۔"

یوں سید صاحب موصوف ، اکبر الہ آبادی کے ہمنوا ہیں کہ

تم شوق سے کالج میں پھلو ، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو ، چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اردو زبان کے محسن ، اور اردو کو اس کا اصلی اور جائز مقام دلوانے کی جد و جہد کرنے والے قافلے کے سرخیل اور قافلہ سالار کی حیثیت سے یونیورسٹی سینٹ کے ممبروں نے بھی ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کو دیکھا ، اور خاموش جلوسوں میں شرکت کرنے اور ان کا نظارہ کرنے والے عوام نے بھی - سید صاحب محترم و معظم اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سوال پر پورے عزم و استقلال سے ڈٹے ہوئے ہیں - آپ کا خیال ہے کہ انگریزی کے بغیر ترقی نہ کر سکنے کا بہانہ بنانے والوں پر عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثال صادق آتی ہے ـــــ سید صاحب کا عام فہم طرز استدلال ملاحظہ فرمائیے :

''اس غیر قدرتی نظام تعلیم نے ملک کی اعلیٰ اختراعی تخلیقی صلاحیتوں کو بالکل فنا کر دیا ہے - ہم میں آزادانہ سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی - ہماری سوچ کی دنیا تنگ ہو گئی ہے - ہم غلامانہ تفکر کے دائرے میں قید ہو کر اس تنگی کو بھی وسعت ہی خیال کرنے لگے ہیں ، اور نہیں سوچتے کہ جاپان ، روس اور چین بھی تو انگریزی کے بغیر جی رہے ہیں اور نظری اور تجرباتی علوم میں روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں اور روس کا غیر انگریزی دان سائنسدان تو اب آنسوئے افلاک پہنچنے کے لیے پر تول رہا ہے -''

استاد عظیم سے ملنے والا ہر شخص آپ کے حسن اخلاق کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا ہے - میں نے کبھی سید صاحب کی جبیں پر بل نہیں دیکھے - اس پیکر خلوص و محبت کی مشفقانہ اور ہمدردانہ باتیں ، میٹھا میٹھا اور دھیما دھیما لہجہ اور بیان میں اپنائیت کا رنگ ہر ملاقاتی کا دل موہ لیتا ہے - حد یہ ہے کہ وہ اپنے واضح ترین دشمنوں کے خلاف بھی ان کی حاضری میں یا غیبت میں کوئی سخت بات نہیں کہتے - بقول جناب ممتاز منگلوری صاحب :

''ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ سانپوں کو دودھ پلاتے رہتے ہیں - اور پھر یہی سانپ جب ناگ بنتے ہیں تو نہ صرف ان کی طرف پھن بڑھاتے ہیں بلکہ سید صاحب کے ارد گرد کے ان لوگوں کو بھی لپیٹ میں لے لیتے ہیں ، جنھیں سید صاحب پتھر پھینکنے سے منع کرتے رہے ہیں اور جب سید صاحب کی توجہ ان پالتو سانپوں کے بڑھتے ہوئے پھنوں اور ان کے زہر کی طرف

دلائی جاتی ہے تو وہ مسکرا کر یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں ،،

استاد معظم نے تعلیم کے موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے ۔ وہ انگریزی نظام تعلیم کے مخالف ہیں ، لیکن اس کے اچھے پہلوؤں کی نشاندھی کرتے ہوئے انھیں اپنانے کا مشورہ بھی دیتے ہیں ۔ وہ تعلیم کے لیے کسی واضح اور اعلیٰ نصب العین کی تعیین ضروری سمجھتے ہیں ۔ وہ تعلیم میں دین اور دنیا کی ہم آہنگی اور یک جائی کی ضرورت پر زور دیتے ہیں ۔ وہ مذھب کو کسی مرحلے پر بھی پیچھے چھوڑ دینے کے سخت مخالف ہیں وہ علوم مشرق کی ترویج و ترقی کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں ۔ اور پرائیویٹ تعلیم کی پر زور حمایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''پرائیویٹ تعلیم سے کسی اجارہ‌داری یا کسی قبضہ بلا شرکت پر کوئی زد نہیں پڑتی ۔ نہ کسی کی مشیخت کو نقصان پہنچتا ہے ۔ یہ تو محض غریبوں اور ناداروں کا مطالبہ ہے ، جو زندہ رہنے کا حق مانگتے ہیں ۔''

سید صاحب پبلک سکولوں پر ملک کا روپیہ برباد کرنے کے حق میں نہیں ہیں : آپ نے اگست ۱۹۶۴ء میں گورنمنٹ کالج ، ایبٹ آباد میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا :

''اس (پبلک سکولوں کی) فضا میں پہنچ کر مجھے فوراً وہ لاکھوں کروڑوں بچے بھی یاد آ جاتے ہیں ، جن کو مقدر نے بے زر ماں باپ کے گھر پیدا کیا ہے ۔ یہ وہ بچے ہیں ، جن کے پاس بعض اوقات قلم ، دوات ، کتابیں تک بھی نہیں ہوتیں ۔ ان کروڑوں کے اندر سے محض روپے کے زور سے ، محض چند زر داروں کے بچوں کو اعلیٰ اور خوبصورت تعلیم دلا کر ایک اعلیٰ اور برتر طبقہ پیدا کیا جا رہا ہے ۔ جس کو بظاھر ملازمت میں ترجیح ملے گی ، کیوں کہ اس کا کاچر اعلیٰ ، اس کی تعلیم خوبصورت ، اس کی turn out چاق و چوبند ۔ اور اس کی انگریزی بھی ایسی کہ کرنیل سنگھ بھی باغ باغ ہو جائے ۔''

علم کے مخلص اور بے لوث خادم۔۔۔ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا سب سے بڑا ''جرم'' ان کا خلوص ہی قرار پایا ہے۔۔۔سید صاحب نے ۴ اپریل ۱۹۶۶ء کو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات کے موقع پر خطبہ پڑھتے ہوئے فرمایا :

''اب اس ملک میں تعلیم چند تفریحات اور چند ملازمتوں کا نام ہے۔ علم کا قصہ اس سے بھی الم ناک ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اور یہ کہنا انکشاف راز نہ ہوگا کہ علم کی مخلصانہ خدمت سے بڑا جرم شاید اور نہ ہو گا۔۔۔اس جرم کی سزا اذیت اور نا قدردانی ہی نہیں، مدۃالعمر کی گمنامی بھی ہے۔''

کس کو ہے یہ خبر کہ بہ عنوان زندگی !
کس حسن اہتمام سے مصلوب ہم ہوئے

گمنامی سے مجھے یاد آیا، کہ گذشتہ ماہ اورینٹل کالج کے سلسلے میں ٹیلی ویژن پر ایک پروگرام ہوا تھا، جس میں کالج کے تمام سابق اور موجودہ پرنسپلوں کا تذکرہ کیا گیا اور تصویریں دکھائی گئیں۔ لیکن سید صاحب کا اس میں نام تک نہ تھا :

دیوار کی ہر اینٹ پہ لکھا ہے مرا نام
تعمیر مگر آپ سے منسوب ہوئی ہے

ممتاز منگلوری صاحب نے کتنی تلخ حقیقت کا اظہار کیا ہے

''میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اتنی خدمات کسی اور ملک میں کوئی استاد انجام دیتا۔۔۔جہاں صحیح استاد کا کوئی واضح تصور موجود ہے، تو قوم ان کے راستے میں آنکھیں بچھاتی اور حکومت فراخ دلی سے ان کی خدمات کا شایان شان اعتراف کرتی، لیکن۔۔۔ان سب خدمات کے باوجود یہاں کیا ہے؟ :

یک نگہ، ایک چشمک، اک سخن
ہے مگر اس میں بھی تامل سا (میر) ''

خدا کا شکر ہے کہ "مجلس ارادت مندان سید" نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے واضح اور برملا اعتراف کے طور پر ۵ اپریل کو "یوم تجدید عزم" کے سلسلے میں ایک جلسے کا انعقاد کیا - اجلاس کی پہلی نشست مجلس کے صدر جناب جسٹس سجاد احمد جان کی صدارت میں ساڑھے چار بجے سہ پہر شروع ہوئی -

مولانا عبدالستار نیازی ایم - اے نے تلاوت کلام پاک کی - اس کے بعد مجلس کے معتمد عمومی جناب ممتاز منگلوری نے تقریب کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے سید صاحب کی خدمات کا پر زور اعتراف کیا - اور سید صاحب کی ادبی ، علمی ، تہذیبی اور اسلامی کاوشوں پر انھیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا - ممتاز صاحب نے فرمایا کہ سید صاحب میں منصب اور انکسار کا اجتماع قابل رشک خصوصیت ہے - سید صاحب نے ۱۹۳۸ع سے ۱۹۶۵ع تک علوم مشرق کی بقا کے لیے تگ و دو کی ، قومی زبان اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے ۴۸ع میں ایک تحریک کی صورت میں جد و جہد شروع کی - پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے تحفظ اور تنظیم کے لیے محنت کی - اوریئنٹل کالج کو نہ صرف ترقی دی بلکہ بچایا بھی - اور ان سب کاموں سے انھوں نے کوئی نفع حاصل نہیں کیا -

ممتاز صاحب یہ سب کچھ کہہ رہے تھے ، اور میں سوچ رہا تھا کہ سید صاحب جیسی شخصیتیں واقعی قابل احترام ہیں ، کہ وہ صرف فکر ہی نہیں کرتے ، عملی جد و جہد میں اپنے مفادات کا نقصان بھی برداشت کرتے ہیں - اور قوم ، ملک ، مذہب اور اپنے نصب‌العین کی خدمت اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں - ظہوری نے کہا تھا :

در محبت آنچہ می گوییم ، اول می کنیم
پارۂ بیش است از گفتار ما ، کردار ما

ممتاز صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے اوریئنٹل کالج سے چلے آنے کا ذکر تو کیا - لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی خاص وجہ سے وہ کہنا چاہتے ہوئے بھی کچھ چھپا رہے ہیں :

اظہار تمنا کے لیے سینکڑوں ڈھب ہیں
ہم لوگ مگر مصلحتاً مہر بلب ہیں

اور ـــــ

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آفتد راز
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

ممتاز صاحب نے اپنی تقریر میں یہ مژدہ سنایا کہ سید صاحب اپنی خود نوشت سوانح عمری ''برسبیل حکایت'' میں کالج سے چلے آنے کے اسباب و عوامل کا تذکرہ کریں گے ــ لیکن مجھے یہ خدشہ ہے کہ سید صاحب کا یہ ارادہ بھی کہیں ان کی وضعداری کا شکار نہ ہوجائے ــــ یہ کام اگر ممتاز صاحب سرانجام دیتے تو بہتر ہوتا ۔ لیکن شاید ممتاز صاحب بھی یہ جان چکے ہوں ۔ کہ

بدل چکے ہیں بہت خوشنوائی کے معیار
خدا چمن میں کسی کی زباں نہ کھلوائے[1]

ممتاز صاحب کی تقریر کے بعد مشاہیر کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے مولانا غلام رسول مہر نے کہا ۔ ''سید عبداللہ صاحب ترک موالات کے بعد صحیح ، اصولی اور تعمیری کام کے لیے زیادہ سے زیادہ سعی و جہد کرتے رہے ۔ اس زمانے میں آپ کے مقالات زبیر ہزاروی کے نام سے چھپتے تھے ۔''

علامہ امتیاز علی عرشی (بھارت) نے فرمایا ۔ '' سید صاحب کا شمار اہم محققوں اور نقادوں میں ہوتا ہے ۔''

میاں حیات بخش (راولپنڈی) نے کہا ۔ ''سید صاحب طلبہ میں اسلامی کریکٹر پیدا کرنا ضروری سمجھتے ہیں ۔''

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا پیغام تھا ۔ ''ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے جس بے لوثی اور گہرے جذبے کے ساتھ اردو کی خدمت کی ہے' وہ تمام محبان اردو کے لیے مشعل راہ ہے ۔''

---

۱ اس موقعہ پر میں یہ اعلان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے ''برسبیل حکایت ،، کا ضمیمہ لکھنا شروع کر دیا ہے اور اس کے لیے ''ضمیمہ برسبیل حکایت ،، ہی کا نام تجویز کیا ہے [م-م]

ایم ۔ اسلم نے لکھا تھا ۔ ''وہ بامروت دوست ، خلیق انسان' مخلص ادیب اور مشفق استاد ہیں ۔''

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (سندھ یونیورسٹی) نے لکھا ۔ ''ڈاکٹر صاحب کے کارناموں میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کو فراموش کر دینا بڑی بے انصافی ہوگی ۔''

مالک رام (بھارت) نے کہا '' خدا نے چاہا تو سید صاحب کے خلوص کی روشنی پھیلتی جائے گی ۔ اور گردوپیش کا اندھیرا سمٹتا جائے گا ۔''

میجر آفتاب حسن (کراچی) نےفرمایا ۔'' سید صاحب کے مشن کو سرکاری سرپرستی کبھی حاصل نہیں رہی ۔ اور ہوتی بھی تو کیا ہوتا ۔''

پیغامات پڑھ کر سنائے جاچکے ، تو سید عبدالباقی نے ''تجدید وفا'' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی ۔ دو اشعار حاضر ہیں :

کشید آتش غم ہے یہاں شراب وفا
بڑھاؤ ہاتھ کہ گردش میں جام آیا ہے
''زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد''
کوئی کسی کے لیے یوں بھی کام آیا ہے

پھر قیوم شاکر نے ایک مضمون پڑھا ، جس میں کچھ مزاح کی چاشنی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی ۔ مضمون کے آخر میں انہوں نے جو شعر استعمال کیا تھا ، یہ ہے :

خواہش گل میں بجز اہل جنوں کون کانٹوں پہ چلا ہے یارو!

ذوالفقار حسین بخاری نے وقت کی کمی کے پیش نظر اپنے طویل مقالے کے اقتباسات پڑھ کر سنائے ۔ بخاری صاحب نے فرمایا ۔ ''ڈاکٹر صاحب کی ذات تنقید ، تحقیق ، تدریس اور تصنیف کا حسین امتزاج ہے ۔'' ــــــانہوں نے کہا کہ ''اپنے تدریسی انداز پر جتنا فخر سید صاحب کو ہے ، اس سے کہیں زیادہ ان کے شاگردوں کو خوشی ہے کہ انہیں ایسے مشفق اور بہترین استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ۔''

بخاری کے بعد ابوالاثر حفیظ جالندھری آئے ۔ اور کہا ''سید صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں تجدید عزم کیا ہے ، تو آج سڑسٹھ سال کی عمر

میں ، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ میرا تجدید عزم بھی ہے۔"
حفیظ صاحب نے فرمایا کہ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کے بعد میں ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے بے حد متاثر ہوا ہوں ——— پھر حفیظ صاحب نے اپنی ایک پرانی غزل نئی تشریحوں کے ساتھ سنائی ۔ دو اشعار پڑھ چکنے کے بعد انہوں نے سید صاحب کو مخاطب کیا ۔

"سید صاحب ! یہ آپ کی صداقتوں اور ان صداقتوں کی مخالفتوں کا ذکر ہے ——— آپ ان لوگوں کو نہیں جانتے ، جن کے نام تو آپ کے دوستوں کے زمرے میں آتے ہیں ۔ مگر حقیقتاً وہ آپ کے دشمن ہیں ۔"

اور پھر جناب حفیظ نے یہ شعر پڑھا :

یہ خوب کیا ہے ، یہ زشت کیا ہے ، جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزا ہو ، تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

میں نے اپنی زندگی میں ایسا پرسکون اجتماع نہیں دیکھا ہر طرف عقیدت و احترام کی فضا تھی ۔ بڑے بڑے شورش پسند عناصر بھی یوں دبکے بیٹھے تھے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی عظمت کا نقش میرے دل پر اور گہرا ہوتا گیا :

هر جنبش دامان جنوں جان ادب ہے
اس راہ میں آداب سکھائے نہیں جاتے

جمیل ملک نے ، جو رائٹرز گلڈ ، راولپنڈی کی نمائندگی کے لیے تشریف لائے تھے ، اپنا طویل لیکن پر مغز مقالہ پڑھا ، انہوں نے کہا " سید عبداللہ کی شخصیت میں فکر و جذبہ ، قرب و دوری اور حجاب و جلوہ کے تضادات اس طرح جمع ہوگئے ہیں کہ ایک تخلیقی فنکار کی طرح ان تضادات میں ہم آہنگی ، کثرت میں وحدت اور ہرجائیت میں یکتائیت پیدا کرنے کی کوشش ہی کو سید عبداللہ کا کارنامۂ خاص ٹھہرایا جاسکتا ہے" ——— انہوں نے مزید فرمایا ۔ "سید عبداللہ کی تحریروں پر ، اول تا آخر مسلم تہذیب و ثقافت ، زبان و ادب ، فکر و نظر اور علم و عمل کی چھاپ بڑی گہری ہے ۔"

میاں بشیر احمد سابق مدیر ہمایوں نے فرمایا ۔ "سید صاحب اور میں کبھی کبھی مل کر اردو کے حق میں "سازشیں" کرتے رہے اور انشاءاللہ آئندہ بھی کرتے رہیں گے ۔"

میاں صاحب کے بعد ڈاکٹر صابر علی خاں نے اساتذہ علوم مشرق کی طرف سے سید صاحب کو تحفہ پیش کیا اور علوم مشرق کی بقا و ترقی کے سلسلے میں سید صاحب کی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا -

چوہدری محمد افضل ـــــ رائٹرز گلڈ ، لاہور کی طرف سے شریک تقریب وفد کے سربراہ تھے - آپ نے گلڈ کی طرف سے ایک قلمدان سید صاحب کو تحفةً پیش کیا - اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب چالیس برس سے لوح و قلم کی خدمت کر رہے ہیں - اور ایک ادیب کے لیے قلم سے بڑا تحفہ نہیں ہوسکتا -

شاگردوں اور ارادت مندوں کی طرف سے میرزا ادیب نے تحفہ پیش کیا -

پھر انجمن ترقی اردو ملتان ، لائلپور ، لالہ موسیٰ اور دیگر شہروں سے آمدہ حضرات نے مختلف تحائف پیش کیے -

مرزا نصیر بیگ مالک جدید اردو ٹائپ پریس نے سید صاحب کو سفید کاغذوں کا ایک مجلد مجموعہ [جس کی جلد پر سنہری حروف میں "بر سبیل حکایت" از ڈاکٹر سید عبداللہ چھپا ہوا تھا] پیش کرتے ہوئے انہیں یاد دلایا کہ انہیں اپنی سوانح عمری لکھنی ہے -

اس کے بعد ڈاکٹر بشارت علی نے کہا کہ سید عبداللہ صاحب کو بجا طور پر اردو کا آدم ثانی کہا جاسکتا ہے - انہوں نے فرمایا کہ سید صاحب نے چونکہ ہمیں یہ سبق دیا ہے ، کہ اگر قوم کو زندہ رہنا ہے تو دریوزہ گری کو ترک کر کے اپنی زبان کو اپنانا چاہیے ، اس لیے سید صاحب ہمیشہ زندہ رہیں گے -

پروفیسر فضل الرحمان فیضی نے بڑے جذباتی انداز میں استاد محترم کی خدمت میں عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیے ـــــ ان کے یونیورسٹی سے فارغ ہونے کا ذکر بھی کیا ـــــ اور زبان بے زبانی سے شاید یہ بھی کہا کہ

ہونٹ سل جائیں ، اگر ہم کہہ دیں
وہ مناظر ، جو نظر سے گزرے

فیضی صاحب نے مجلس ارادت مندان سید کی طرف سے شایع شدہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے تعلیمی خطبات کا ایک نسخہ سید صاحب

کو پیش کیا ۔

شام کا وقت ہو چکا تھا ، مولانا عبدالستار نیازی کی تحریک پر شام کی نماز کے لیے وقفہ ہوا ۔

چائے کے بعد تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی تقریر ہوئی ۔ آپ نے مجلس ارادت مندان سید کو "مجلس محسنان سید" کہہ کر پکارا اور فرمایا کہ مجھے مدرس ہونے پر فخر بھی رہا اور مسرت بھی بہت زیادہ ہوئی ۔ شاید اس لیے کہ میرے اجداد چار پانچ پشتوں سے استاد رہے ہیں ۔ میں نے مدرسی کو دل سے قبول کیا ہے ۔

سید صاحب نے اپنی عملی جد و جہد کے سلسلے میں اپنے ساتھیوں اور ہمقدموں ، خصوصاً آقا بیدار بخت کا ذکر کیا ۔

استاد گرامی منزلت نے فرمایا :

"میں نیکی ، شرافت ، اچھائی ، خلوص اور ایمان کو زندگی میں بہت اہمیت دیتا ہوں—اگر ہم ایمان کے لیے ، نیکی کے لیے ، انسانی ہمدردی ، نکوکاری اور روحانی قدروں کے لیے کوئی "کیس" نہ بنا سکے ، تو یقیناً اس معاشرے کے برباد ہونے کا آج نہیں تو کل امکان ہے ۔"

سید صاحب نے مزید فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں نیکی کے لیے کوئی "کیس" بنانے کی کوشش کروں ۔ پاکستان میں روحانی اقدار کی ترویج اور اپنی تہذیب کے مٹے ہوئے نقوش کو اجاگر کرنے کے لیے کوئی کام کرسکوں ۔

استادعظیم نے قدرے جوش کے ساتھ فرمایا ۔ "میں انشاءاللہ اپنے مرنے سے پہلے انگریزی کو اس مقام سے رخصت ہوتے دیکھوں گا ، جس پر ایک طبقہ اسے فائز رکھنا چاہتا ہے ۔"

سچ ہے :

فقر بوذر کے ہیں امیں جو لوگ وہ زمانے کا رخ بدلتے ہیں

آخر میں انھوں نے کہا ۔ کہ یہ یوم تجدید عزم میرا ہی نہیں ، بلکہ یوم توثیق عزم آپ کا بھی ہے——یوں خود تو سید صاحب ساری عمر ہی اپنے نصب‌العین کی خاطر محنت کرتے رہے ۔ ' ہمیں بھی دعوت عمل دے گئے کہ :

آذری عمر ببازیچہ و غفلت بگذشت،
آنچہ باقی ست ، مشو غافل و فرصت دریاب

مہمان خصوصی کے بعد صدر مجلس جسٹس سجاد احمد جان نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا کہ اگر کسی ایسے شخص کی تعریف کی جائے جس کا وہ کماحقہ، مستحق ہو ، تو ضمیر کو سکون میسر ہوتا ہے ، خصوصاً آج کے معاشرے میں ، جہاں خوشامد کا دور دورہ ہے —— انہوں نے کہا - شاہ صاحب ان نامور لوگوں میں سے ہیں ، جنہوں نے محض اپنی کاوش اور محنت سے اپنی زندگی کی منازل کامیابی کے ساتھ طے کیں - آپ ان کامیاب لوگوں میں سے ہیں ، جو اپنے لیے ایک فلسفۂ حیات مرتب کر لیتے ہیں ، اور پھر اس پر سختی سے کاربند رہتے ہیں - اپنے سامنے ایک نصب العین رکھتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں -

جسٹس صاحب نے فرمایا - بسا اوقات مجھے شاہ صاحب کی مماثلت کے لیے کیانی مرحوم یاد آجاتے ہیں - کیانی اور سید صاحب وہ لوگ ہیں ، جو ارادے کے پکے ، بات کے سچے اور پہاڑوں سے ٹکرا جانے والے ہوتے ہیں - اور اپنی صلاحیتوں کو قوم کی خدمت میں صرف کرنے کا جنوں رکھتے ہیں -

انہوں نے بھی سید صاحب کے کالج سے چلے آنے پر اپنی حیرت کا اظہار کیا - یوں اس مجلس میں ایک بار پھر ''جرم اخلاص'' کا ذکر ہوا -

ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی رہے گی
گو جرم کئی آج بھی تشریح طلب ہیں

آخر میں جسٹس جان صاحب نے فرمایا - ''مجھے اصطلاحی طور پر شاہ صاحب کی شاگردی کی سعادت نصیب نہیں ہوئی ، لیکن آہستہ خرامی ، استقلال ، عزم اور سب سے بڑھ کر اپنے کام میں لگن کے خصائص میں نے سید صاحب سے سیکھے ہیں سید صاحب وہ عظیم شخصیت ہیں ، جنہیں راست بازی کی راہ سے ہٹایا نہیں جاسکتا - یہ وہ صاحب قلم ہیں ، جن کے قلم کی عصمت کی قسم کھائی جاسکتی ہے - ''

جسٹس جان صاحب کی تقریر کے بعد دوسری نشست شروع ہوئی ،

جس میں جیلانی کامران اور افتخار جالب نے نئی شاعری کے موضوع پر مقالے پڑھے۔

افتخار جالب کے مقالے کے بعد سٹیج سیکرٹری جناب ممتاز منگلوری نے فرمایا۔ کہ میں غلط فہمی سے آج تک نئی شاعری میں معانی تلاش کرتا رہا یہ تو اب جالب صاحب کے پر مغز مقالے سے علم ہوا ہے کہ اس میں معانی تو ہوتے ہی نہیں ہیں۔

یہ دوسری نشست پہلے جناب حکیم احمد شجاع اور پھر جناب پروفیسر چوہدری عبدالقادر کی صدارت میں ہوئی۔ جیلانی کامران کے بعد نعیم صدیقی صاحب نے اپنا مقالہ بعنوان ''ڈاکٹر سید عبداللہ اور اسلامی ادب'' پڑھا۔ میں نعیم صدیقی صاحب کے طرز تحریر اور تبحر علمی کا والہ و شیدا ہوں۔ اور مجھے یہ جان کر کہ نعیم صاحب بھی بجا طور پر سید صاحب کی خدمات علمی و ادبی و اسلامی پر انہیں خراج تحسین پیش کر رہے ہیں، خوشی ہوئی۔

نعیم صدیقی صاحب کے بعد پروفیسر فضل الرحمان فیضی نے موجودہ نصاب تعلیم کی خرابیاں گنوائیں۔ جلسے میں موجود ہر شخص نے یہ محسوس کیا کہ فیضی صاحب کی نبض ارباب تعلیم کی دکھتی ہوئی رگ پر ہے۔ میرا یہ عالم تھا کہ:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مرض کی صحیح صحیح تشخیص اور بہترین علاج پر طرہ یہ کہ فیضی صاحب کی تحریر اتنی شگفتہ تھی کہ محفل میں زندگی کی ہما ہمی پیدا ہوگئی۔

جناب فیضی کے بعد ریاض مجید صاحب (گورنمنٹ کالج، لائیلپور) نے ایک نظم سید صاحب کے متعلق پڑھی، جس کا ایک مصرع تھا ع

خدا کرے کہ مری عمر بھی تمہیں لگ جائے

پھر سید مسعود احمد اثیر صاحب نے بڑے پرمزاح انداز میں تقریر کی۔ وقت کافی ہوچکا تھا۔ اس لیے جناب اثیر کا مقالہ ''اردو کے خاموش جلوس'' اور پروفیسر چوہدری عبدالقادر کا مقالہ ''تعلیم اور فلسفہ'' پڑھے نہ جاسکے اور چوہدری صاحب کے سید صاحب کو والہانہ انداز میں ان کی خدمات کے اعتراف کے اعلان کے ساتھ، رات کے ساڑھے نو بجے یہ پر شکوہ

اور پر رونق تقریب اختتام پذیر ہوئی ـــــ اور میں یہ سوچتا ہوا گھر کی طرف جارہا تھا ، کہ استاد گرامی منزلت ڈاکٹر سید عبداللہ اب کرسی پر نہیں ہیں ، پھر بھی ان کا نام زندہ ہے ، ان کا کام زندہ ہے ۔ وہ خود اپنے عزم کی تجدید کر رہے ہیں ۔ اور جو لوگ کرسیوں پر بیٹھ کر بھی نیک کام نہیں کر سکتے ـــــ وہ اپنے آپ کو زندہ سمجھتے ہوئے بھی مردہ ہیں ۔

اُجڑ بھی جائے نشیمن ، تو پھر نشیمن ہے
قفس میں پھول بھی رکھ دیں ، تو آشیاں نہ کہو

ـــــــ

(بشکریہ ہفت روزہ "آئین" لاہور)

''ڈاکٹر سید عبداللہ کی ساٹھویں سالگرہ پر ایک ادبی نشست''

بزم اردو ایبٹ آباد (ہزارہ) کے زیر اہتمام ۳۰ مارچ ۱۹۶۶ کو گورنمنٹ کالج میں ڈاکٹر عبداللہ کی ساٹھویں سالگرہ پر ایک ادبی نشست زیر صدارت پروفیسر نفیس الدین احمد پرنسپل گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد منعقد ہوئی ۔ تلاوت کلام پاک کے بعد پروفیسر صادق زاھد ناظم اعلیٰ بزم اردو نے ڈاکٹر سید عبداللہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا ۔ ''ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت بین المملکتی شہرت کی حامل ھے ۔ اس لیے آپ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ اور پھر ادب کے طالب علم کی حیثیت سے میرا آن کی ذات کے بارے میں کچھ کہنا بالکل ایسے ھے جیسے سورج کو چراغ دکھانا ۔ کون ھے جو ڈاکٹر صاحب کی ذات گرامی سے واقفیت نہیں رکھتا ۔ لیکن ادبی اور غیر ادبی دنیا کے بہت سے لوگ اس بات سے یقیناً ناواقف ھیں اور کم ھیں جنہیں اس بات کا علم ھو کہ وہ سرزمین جس نے عبداللہ جیسی شخصیت کو جنم دیا وہ ہزارہ کے نام سے پکاری جاتی ھے ۔ سر زمین ہزارہ نے جہاں علامہ میر ولی اللہ مرحوم جیسی عظیم شخصیت کو پیدا کیا ۔ وھاں اسے یہ بھی فخر ھے کہ اس نے موجودہ دور کے اردو کے نگہبان اور مرد قلندر عبداللہ جیسی شخصیت کو بھی جنم دیا ۔ آج سے سو سال قبل مرزا غالب نے فرمایا تھا

حسن فروغ شمع سخن دور ھے اسد پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

ھم اس شعر کا مطلب شرحوں میں ڈھونڈتے رھے اور مطمئن نہ ھو سکے ۔ لیکن سید صاحب کی ذات گرامی کو دیکھ کر اس شعر کا مفہوم ھمارے ذھنوں میں آ گیا اور دل گداختہ والی بات بھی اب سمجھ میں آئی ۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی سالہا سال کی ریاضت اور محنت کے بعد جو مقام اپنے لیے اردو زبان و ادب میں حاصل کیا وہ صرف ڈاکٹر سید عبداللہ کی بے لوث اور انتھک کوششوں کا نتیجہ ھے ۔

مرزا غالب نے کسی فنکار اور اُس کے فن کو پرکھنے کے لیے اس شعر کی روشنی میں ایک معیار بھی مقرر کیا تھا - جس معیار پر مرزا غالب سے لے کر ڈاکٹر اقبال تک اور ڈاکٹر اقبال سے لے کر ڈاکٹر سید عبداللہ تک اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی ذات گرامی سے اب تک ھر فنکار نے کسی ادب پارے کو پرکھنے کے لیے جو چند ایک اصول اور قواعد و ضوابط مرتب کیے ھیں - اُن کی مدد سے آج کا فنکار نقاد خالق اور تخلیق کے درمیان اُن تمام ذھنی فاصلوں کو ایک مرکز پر لانے میں کامیاب ھو جاتا ھے - جہاں پہنچنے کے بعد خالق اور اُس کی تخلیق اپنے روحانی رشتے میں فنا ھو کر یک جان ھو جاتے ھیں - جس کے بعد آنے والے محققین و ناقدین حضرات اپنی تحقیق اور تنقید کا سنگ بنیاد رکھتے ھیں - مرزا غالب کے اسی شعر کی پیروی کرتے ھوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی بحیثیت ایک ادیب و نقاد کے ادب اور فن کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ھے ''ادب بھی ایک فن ھے - یہ اس لیے کہ آجکل اس کے متعلق بہت سی پریشان خیالی پائی جاتی ھے - اگر غور کیا جائے تو فن انسانی طبیعت کے ایک ناگزیر داخلی تقاضے کو پورا کرتا ھے اور اپنی اصل میں بڑی آزاد اور بے ساختہ معصوم چیز ھے - یہ در اصل ان جذبوں اور خیالوں کے متعلق ھے جن کی کڑی تنظیم ممکن نہیں - یہ جذبے اور خیال طبع انسانی میں کچھ اس طرح اُگ آتے ھیں جس طرح مرغزاروں میں خود رو پھول اُگ آتے ھیں - شاعر یا فنکار ان پھولوں کے اُگ آنے میں آزاد مگر مجبور سا ھوتا ھے ، اور بڑی حد تک خارجی جبر اور قید سے بے نیاز اندر کی تحریک سے اظہار پر مائل ھوتا ھے - ایسی صورت میں اُس کے ارادے پر کسی خارجی مقصد کا دباؤ نہیں ھوتا - نہ اُس کے ارادے میں خیر و شر کا کوئی جھگڑا یا اچھائی اور برائی کی کوئی لڑائی ھوتی ھے - وہ تو مرغزار کے اُس پھول کے اندر سے خود بخود اُبھرا چلا آتا ھے - یا یوں کہیے کہ شاعر کی مخصوص فطرت بے ساختہ اُس کو بروئے کار لاتی ھے - اور اُس کے زیر اثر فن اور ادب کے پھول کھلتے رہتے ھیں - لیکن اس سلسلے میں ایک حقیقت کو نہیں بھولنا چاھیے کہ ادبی یا فنی اظہار کسی داخلی یا خارجی تحریک کا محتاج ھوتا ھے - یہ تحریک زندگی کے شعور اور حسن کے احساس سے پیدا ھوتی ھے مگر زندگی کا شعور یا حسن کا احساس

یہ دونوں چیزیں ناقابل تعریف ہیں - اور آن کو عقلی تعریفوں اور تشریحوں میں محدود کرنا ممکن نہیں -''

اسی طرح ڈاکٹر سید عبداللہ بحیثیت ایک نقاد کے کسی ادب پارے کو پرکھنے کے لیے جہاں تنقید کے چند جچے تلے اصولوں کو کام میں لاتے ہیں - وہاں وہ تنقید کرنے سے قبل تحقیق کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں - آن کے نزدیک تحقیق کے بغیر تنقید بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے - اسی طرح وہ کسی ادب پارے کی صحیح قدر و قیمت مقرر کرنے سے قبل تحقیق اور تنقید دونوں کا سہارا لے کر آگے بڑھتے ہیں - اسی طرح ڈاکٹر صاحب بحیثیت ایک نقاد کے ایک محقق کے فریضے کو بھی انتہائی خوش اسلوبی سے سر انجام دیتے ہیں - جس کی بنا پر یہ اصول آن کی تمام تنقیدی نگارشات میں پوری طرح واضح ہے -

ڈاکٹر سید عبداللہ بحیثیت ایک ادیب اور نقاد کے اردو زبان و ادب کے لیے مشرقی اقدار زندگی اور اسلامی نظام حیات کو ضروری سمجھتے ہیں - اور وہ ہمارے آج کے ترقی پسند ادیبوں کے اس مسلک کے ہرگز ہرگز قائل نہیں ہیں جس کی بنا پر اردو زبان و ادب فقط فرائڈ اور مارکس کے نظریات کا ایک ادنلی پروپیگنڈا بن کر رہ جائے - بلکہ ہمارے ادب کو مشرقی اقدار زندگی اور تجربات و رجحانات کا امین ہونا چاہیے اور اس ادب کی اپنی روایت ہونی چاہیے -جس کا ہماری روزمرہ کی زندگی سے قریب کا تعلق ہو -

ڈاکٹر صاحب بحیثیت ادیب و نقاد کے ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے نظریے کے سختی سے قائل ہیں - اور آن کی اپنی ادبی تحریروں میں یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ فن اور ادب میں قواعد و ضوابط کو اولیت کا مقام حاصل ہونا چاہیے -

ڈاکٹر صاحب آس تہذیب و ثقافت اور مشرقی اقدار زندگی کی آخری کڑی اور روشن شمع ہیں جس کی ابتدا ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد سر سید احمد خاں جیسے دور اندیش رہنما اور مفکر نے کی تھی - آس روایت کو آگے بڑھانے میں سر سید احمد خاں کے رفقاً کار ، حالی ، شبلی ، آزاد ، مولانا چراغ علی اور ڈاکٹر نذیر احمد وغیرہ انہی کوششوں کو پورے خلوص اور تندھی سے عمل میں لائے - جس کی گواہی اردو ادب کی ایک صدی کی تاریخ دینے پر مجبور ہے - اس تحریک کا ایک دور

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی ذات گرامی پر ختم ہو جاتا ہے ۔ اور آج اس روایت کو آگے بڑھانے میں دنیائے ادب کے راہی ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے قلم اور خون جگر کی روشنائی سے شب و روز مصروف ہیں ۔

اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب اس تہذیب و ثقافت کو زندہ کرنے کے خواہاں ہیں جس کا خواب شاعر مشرق نے دیکھا تھا ۔ آن کے نزدیک پاکستانی قوم کی بقا بحیثیت قوم اس راز میں مضمر ہے کہ وہ مشرقی ادب کی قدیم روایات اور مذہب اسلام کو اپنانے کی کوشش کریں جس کا احیا آج کی پاکستانی قوم کے لیے از حد ضروری ہو چکا ہے ۔

آج ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی زندگی کی ساٹھ بہاریں مکمل کرنے کے بعد اس منزل کے متلاشی ہیں جہاں پر اردو زبان و ادب اور دیگر علوم شرقیہ ایک بار پھر قوم کی زندگی میں ایک روح پیدا کریں جس کی بدولت ہم صحیح معنوں میں قوموں کی تاریخ میں مشرقی تہذیب و ثقافت کے امین کہلانے کے مستحق ہوں ۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ آرزو ہے جس کا اکثر وہ اپنی نجی و ادبی محفلوں میں بحیثیت ایک دانشور کے ذکر کرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی تحریر میں چند ایک ایسی لافانی سطور چھوڑ جائیں جو ہر دور کی دکھی انسانیت کے لیے مرہم کا کام سر انجام دے سکیں علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب نے آج کے ادب کے طالب علم کو اپنی فکر و نظر کی بدولت مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا وہ لافانی درس دیا ہے جو تا ابد زندۂ جاوید رہے گا ۔ اسی طرح انہوں نے ایک کامیاب مدرس کا وہ فریضہ سر انجام دیا ہے جس کی ہر دور کی انسانیت کو ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ حضرات اس تعارف کو ختم کرنے سے قبل فقط یہی کہوں گا ۔ خداوند تعالےٰ آنھیں عمر خضر اور صحت کامل عطا فرمائے آمین! اللہ کرے زور قلم اور زیادہ !

پروفیسر صادق زاھد ناظم اعالی بزم اردو کے تعارف کے بعد پروفیسر سید حسین شاہ فدا صدر بزم اردو نے ڈاکٹر سید عبداللہ کے حضور منظوم نذرانۂ عقیدت بعنوان ''یوم تجدید عزم'' پیش کیا جو درج ذیل ہے:—

تجھ کو اے اردو کے فاضل رھنما، میرا سلام
''یوم تجدید زباں کی ابتداء'' میرا سلام

عبد حق بابائے اردو اور تو روح رواں
تجھ سے ہی اردو کی ہے نشو و نما، میرا سلام
ڈاکٹر عبد الہ ! اردو کے گلشن میں بہار
تیری جانب سے ہی لائی ہے صبا، میرا سلام
لب مہک اٹھے زباں پر کس کا آیا ہے یہ نام
ذکر تیرا کس قدر ہے جاں فزا میرا سلام
تیرے دل میں دن بدن بڑھتی ہے اردو کی لگن
تو ہے اردو کے لیے وجۂ بقا، میرا سلام
کس مپرسی میں بھی اردو کی ترقی ہے کمال
تجھ کو دنیا نے کہا ہے مرحبا، میرا سلام
ملک و ملت کی ہے قسمت، ہے جو اردو کا عروج
تو ہے اردو کے لیے گویا ھما، میرا سلام
تو ہے مخلص، کامیابی نے قدم چومے تیرے
کیسی عمدہ تو نے پیدا کی فضا، میرا سلام
تو نے اس دور ادب میں اک اجالا کر دیا
کب ملے گا تجھ سا اردو آشنا، میرا سلام
تو مسیحا تجھ سے اردو نے ہے پائی زندگی
کر رہے خرد و کلاں ہیں اقتداء میرا سلام
خادم اردو کی حیثیت سے اونچا ہے مقام
تو نے خدمت کی بھی کر دی انتہا، میرا سلام
آزمائش کا رہا ہے تجھ پہ ہر لخطہ نزول
اور مصائب سے ہے تو بے اعتنا، میرا سلام
جان جوکھوں کا تھا کتنا کام مشکل اور کٹھن
تو نے آخر کی ہے طے راہ وفا، میرا سلام
تو نے اردو کے لیے کار نمایاں کر لیا
تو نے ہی اردو کو بخشی ہے ضیا، میرا سلام
جب تلک اردو ہے زندہ تجھ پہ اس کو ناز ہے
تو ہے اردو کے لیے اک کیمیا، میرا سلام
تجھ سے گویا دامن اردو کا قائم ہے وقار
تو ہے ہر حالت میں اردو کا عصا، میرا سلام

تو نے اُردو نثر میں گلشن ھیں پیدا کر لیے
اس ضمن میں ھر طرف گونجی صدا میرا سلام
ہے تکلف تیری خدمت کا کریں ھم اعتراف
تیری خـدمت ھے مسلم برملا میرا سلام
تیری تصنیفات کا عالم میں چرچا ھـو گیا
تحفتاً حاضر ''قلم ھے اور عبا'' میرا سلام
آسماں پر جاکے پہنچے گا یہ عظمت کا نشاں
ھو اگر منظور میری یـہ دعـا میرا سلام
کوئی خدمت کا صلہ بھی تجھ کو دے سکتا نہیں
تجھ کو دےگا اک خدا اس کی جزا میرا سلام
ھر کسی کو یہ سعادت ، تمکنت کیسے ملے
خدمت اُردو پہ تیری ، میں فـدا ، میرا سلام

اس کے بعد پروفیسر رشید مرزا نے ایک مقالہ بعنوان ''ڈاکٹر سید عبداللہ بحیثیت ایک ادیب و نقاد'' پیش کیا:-

مقالہ:-میں نے اپنے زمانۂ طالب علمیٰ میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی دو کتابیں ''نقد میر'' اور ''ولی سے لے کر اقبال تک'' پڑھی تھیں۔ اور ان دونوں کتابوں میں ڈاکٹر صاحب نے میر کی زندگی اور شاعری پر جس محققانہ انداز سے روشنی ڈالی ھے۔ اسے پڑھ کر قاری کو ایسا محسوس ھوتا ھے جیسے ڈاکٹر صاحب پر بھی وھی کیفیت طاری ھو جو کسی زمانے میں میر پر طاری تھی اور یہی وجہ ھے کہ مجھے بھی ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر صاحب کے متعلق یہ رائے قائم کرنی پڑی کہ ان کتابوں کا مصنف میر کی طرح غم جاناں اور غم روزگار کا شکار ھے۔ اور میرے اس احساس نے مجھے آپ کی دوسری کتابیں پڑھنے اور آپ سے ملنے کے لیے مجبور کیا۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۰ میں کل پاکستان اُردو تدریس کانفرس لاھور کی سٹیج پر ھوئی۔ گو یہ ملاقات بہت ھی مختصر تھی لیکن آپ کو دیکھ کر میرا یہ تأثر تو اسی وقت ختم ھو گیا کہ ''نقد میر'' کا مصنف غم روزگار کا شکار ھے۔ مگر اس کے ساتھ ھی میرے اس شک نے یقین کی صورت اختیار کر لی کہ یہ ھستی جسے لوگ سید عبداللہ کے نام سے پکارتے ھیں غم روزگار کا شکار ھو یا نہ ھو غم جاناں کا

شکار ضرور ہے - لیکن آپ کا محبوب کون ہے؟ کیسا ہے؟ کیا ہے؟ اور کہاں رہتا ہے؟ اس طرح کے کئی سوال میرے ذہن کے افق پر ابھرے لیکن میرے پاس سوائے خاموشی کے ان سوالات کا کوئی جواب نہ تھا - اور اس طرح ایک مدت دل و دماغ کی کشمکش میں گزر گئی - بارہا اس کشمکش سے نجات پانے کے لیے میں نے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا ارادہ کیا لیکن آپ کی سنجیدگی اور اصولی گفتگو کا خیال آتے ہی مجھے اپنا ارادہ ترک کرنا اور صبر کے میٹھے پھل مل جانے کا انتظار کرنا پڑا - آخر کیوں نہ کرتا - بزرگوں کی کہی ہوئی باتیں اکثر سچی ہوتی ہیں، کیونکہ وہ آن کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہوتی ہیں اور خصوصاً صبر کے میٹھے پھل والی بات کے معاملے میں تو میں یہ کہوں گا کہ صبر کا پھل صرف میٹھا ہی نہیں ہوتا بلکہ حسین بھی ہوتا ہے - اگر آپ کو یقین نہ ہو تو کسی فرقت کے مارے دل جلے سے پوچھیے کہ انتظار کی گھڑیاں کیسے گزرتی ہیں یہ باتیں کہنے اور سننے کی نہیں تجربے کی ہیں - مجھے بھی اس کا تجربہ پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے معاملے میں ہوا - ورنہ نہ معلوم میں بھی کب تک زندگی کی ان حقیقتوں کو مجذوب کی بڑ اور شاعرانہ مبالغہ ہی سمجھتا رہتا - بہر حال میں تو اپنی سب کوششوں کے باوجود ڈاکٹر صاحب کے دل کی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکا - لیکن ۱۹۶۳ء میں جب ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اپنی داستان عشق سنا دی - اس وقت یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ اس اٹھاون سالہ نوجوان کو اردو سے عشق ہے - آپ نوجوان کا لفظ سن کر چونک پڑے ہونگے لیکن میں نے یہ لفظ جان بوجھ کر اس لیے استعمال کیا ہے کہ میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب جیسے مخلص و بے لوث محنتی اور با حوصلہ انسان کو اس کے مشن کی تکمیل سے پہلے بوڑھا کہہ دینا گالی دینے کے مترادف ہوگا - پھر آپ کے جوان ہونے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے، کہ آپ کو جس زبان و ادب سے عشق ہے - اگر ہم اس کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو یہ بات ہم پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ اردو کا ماضی، حال اور مستقبل درخشندہ اور تابندہ ہے - اور ایسی سدا بہار زبان کا مٹ جانا یا اسے مٹا دینا مشکل ہی نہیں، بلکہ نا ممکن ہے - اب آپ خود ہی سوچیے اور فیصلہ کیجیے کہ جس شخص

نے اپنا سب کچھ اردو زبان و ادب کے لیے وقف کر دیا ہو اس پر ادبی زوال کیونکر آ سکتا ہے اور وہ کیسے بوڑھا ہو سکتا ہے - یہی وہ نقطہ ہے جہاں میر اور عبداللہ کے عشق کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے - گو یہ درست ہے کہ میر نے اپنی ذات کو زندہ رکھا - ان کے محبوب کو تاریخ کے اوراق چاٹ گئے لیکن اس کے برعکس میر کے قدر دان سید عبداللہ کا محبوب اتنا سخت جان ہے اس کا نہ تو تاریخ کچھ بگاڑ سکی نہ زمانے کی گردش - گردش فلکی نے بڑے بڑے فرعونوں کو مٹا کر رکھ دیا - ان کی یاد تک دلوں سے محو ہو گئی لیکن ڈاکٹر صاحب کا محبوب جوں جوں زمانہ گزرتا ہے، حسین سے حسین تر ہوتا چلا جاتا ہے - پھر اس حسن کی یہ کیفیت ہے کہ جو بھی اسے دیکھتا ہے - وہ اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے - اور اب تو اس کے حسن کا یہ عالم ہے کہ حکومت وقت نے بھی اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا - حسن کو یہ مقام دلانا دراصل عاشقوں کا کام ہے - اور اسی لیے ڈاکٹر صاحب نے بھی اردو کی عظمت منوانے کے لیے کانفرنسوں سے لے کر خاموش جلوس تک نکال ڈالے - یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ کسی تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے تنظیم، سنجیدگی، وقار اور اصول پرستی کی ضرورت ہوتی ہے - اور یہ سب باتیں ڈاکٹر صاحب کی ذات میں بہ درجہ اتم موجود ہیں - یہی وجہ ہے کہ اردو کی تحریک آپ کی سرکردگی میں ہمارے معاشرے کی ایک مضبوط اور ناقابل تسخیر تحریک بن چکی ہے - اور ڈاکٹر صاحب کا یہ وہ کارنامہ ہے جسے اردو کے بولنے، پڑھنے اور لکھنے والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے - لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ صرف اور صرف اردو تحریک کے روح رواں ہیں اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں - بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ موجودہ دور کے بہترین رہنما، ماہر تعلیم، دانشور اور مفکر ہونے کے ساتھ ایک بااصول نقاد، اور باضمیر ادیب بھی ہیں - کون نہیں جانتا کہ آپ دنیائے ادب میں ایک محقق کی حیثیت سے آئے اور اپنی تحقیقی جگر سوزی، محنت اور ہمت کی وجہ سے اپنا ایسا نام پیدا کیا کہ موجودہ دور کے محققین آپ کے نام کو تحقیق کے ایک اصول کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہی بات آپ کی تنقید کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے کیونکہ آپ نے عالم تحقیق سے عالم تنقید میں قدم رکھا

ہے - اس لیے آپ کی تنقید کو تحقیق سے جدا نہیں کیا جا سکتا - اگر ہم ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ ایسے ہی ہوگا جیسے گوشت کو ناخن سے جدا کرنا - اور اسی کشمکش میں نہ تو ہم نقاد ڈاکٹر کو سمجھ سکیں گے اور نہ ہی محقق عبداللہ کو - ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی محل کے چار ستون یا اصول ہیں - تفتیش ، تحقیق ، تحلیل و تجزیہ ، آپ ان اصولوں پر عمل کرتے ہوئے جب تک کسی چیز پر مکمل عبور حاصل کر کے اس کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے ، اس وقت تک اس پر کسی قسم کی تنقید کرنا جائز نہیں سمجھتے - اور جب وہ تنقید کے لیے قلم اٹھاتے ہیں تو خلوص نیت اور غیر جانبداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ، کیونکہ آپ کا تنقید کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ تنقید میں نقاد کی نیت اور اس کی ذات کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے - اگر وہ تنقید کرتے وقت ان دو اصولوں پر عمل نہیں کرے گا تو پھر ایسی تنقید تنقید نہیں بلکہ تنقیص بن جاتی ہے - کیونکہ اس جذبے کو نقاد کی ذات سے علیحدہ کر دینے سے تنقید کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے - ڈاکٹر صاحب نے ان اصولوں پر دوسرے کو ہی عمل کرنے کی تلقین نہیں کی - بلکہ خود بھی جب کبھی کوئی تنقیدی مضمون لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان دونوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر کسی چیز کی اچھائی یا برائی کو پرکھتے ہیں - اور اس مقام پر وہ اقدار ادب کا دامن نہیں چھوڑتے - اپنی تنقید سے کسی کی برائیوں کو اچھالنے کی بجائے اس کی اچھائیوں کو اجاگر کرتے ہیں اور برائیوں کو دور کرنے کی تلقین کرتے ہیں - تنقیدی معاملات میں ڈاکٹر صاحب کی مثال اُس سرجن کی سی ہے جسے ایک طرف تو مریض کی تکلیف کا احساس بھی ہو ، اور وہ مریض کے جسم سے فاسد مادہ نکالنے کا اس لیے متمنی ہو کہ مریض صحت یاب ہو جائے تا کہ خود سرجن کو کسی قدر ذہنی سکون ملے - تو دوسری طرف وہ اپریشن کے وقت کلورو فارم بھی استعمال نہیں کرتا - بلکہ وہ مریض کے جسم کو انجکشن لگا کر سلا دیتا ہے جس کا اپریشن کرنا ہو تاکہ مریض اپنے جسم کے نقص کو دیکھ بھی لے اور اسے تکلیف بھی نہ ہو - اس طرح کے تنقیدی عمل سے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کسی مصنف کی پوری تخلیق کو متاثر نہیں کرتے بلکہ اس طرح وہ فنکار کی خاص خاص خامیوں کو بیان کر دیتے ہیں -

لیکن یہاں بھی وہ عجلت یا جلد بازی سے کام نہیں لیتے - اور نہ ھی اپنے جذبات سے متاثر ھوتے ھیں - بلکہ ھر جملہ لکھنے سے پہلے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے ھیں اور پھر سوچ بچار کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ کر اس پر قلم اٹھاتے ھیں - یہی وجہ ھے کہ آپ کے تنقیدی مضامین ٹھوس دلائل پر مبنی ھیں - آپ اپنی بات منوانے کے لیے جوش و جذبات کا سہارا یا الفاظ کے ڈیر پھیر سے کام نہیں لیتے ھیں - اس کے برعکس آپ اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لیے ایسے ٹھوس دلائل پیش کرتے ھیں جنھیں سننے والا سن کر اور پڑھنے والا پڑھ کر خود بخود آپ کے سامنے جھک جاتا ھے - لیکن اس مقام پر ھمارے سامنے نقاد عبداللہ کی بجائے محقق عبداللہ آ جاتا ھے - اور ھم یہ محسوس کرنے لگتے ھیں کہ یہ مضمون کسی نقاد نے نہیں بلکہ محقق نے لکھا ھے - آپ کی نثر کا انداز نہایت جچا تلا اور سنجیدہ ھے - اور زبان و بیان کو اختیار کرتے وقت وہ اپنے خیال کو پیش نظر رکھتے ھیں - یہی وجہ ھے کہ بعض دفعہ ڈاکٹر صاحب ایسے ثقیل الفاظ استعمال کر جاتے ھیں کہ ایک معمولی علمیت کا انسان ان کی تحریر سمجھنے سے قاصر رھتا ھے شاید اس کی وجہ یہ ھو کہ آپ نے عربی اردو فارسی کا بہت گہرا مطالعہ کیا ھے اور دوران تحریر ان دونوں زبانوں کے الفاظ خود بخود آپ کے قلم سے نکل پڑتے ھوں ، لیکن جب سلیس اور آسان اردو لکھنے پہ آتے ھیں تو بڑے بڑے پیچیدہ مسائل ، باریک نکات اور مشکل اصلاحی بحثوں کو نہایت صفائی ، سادگی ، بے تکلفی اور زور قوت کے ساتھ بیان کر جاتے ھیں - یہاں آپ کی تحریروں میں زبان و محاورے کی لطافت ، بیان کی سادگی و صفائی ، سلاست و روانی ، استعارہ و تشبیہ اور دوسری صنعتوں کا اعتدال کے ساتھ استعمال ، استدلال کا زور ، حسب موقع متانت اور ظرافت سب چیزیں صحت اور موزونیت کے ساتھ جمع ھو جاتی ھیں - آپ نے تحقیقی تنقیدی ، علمی ، ادبی ، تعلیمی ، اصلاحی اور معاشرتی ، سبھی قسم کے مضامین لکھے ھیں - جہاں تک آپ کے تحقیقی اور علمی مضامین کا تعلق ھے ، تو میں یہ بات بلا خوف تردید کہوں گا کہ آپ کی تحقیق مستند تحقیق ھے - اور علمی مضامین میں جو کچھ آپ نے لکھا ھے ان میں آپ کا جذبۂ حب الوطنی کارفرما ھے ، کیونکہ آپ تعلیمی اور علمی مضامین ، قومی اور ملکی نقطہ نگاہ سے لکھتے ھیں - اور جس چیز کو

ملک اور قوم کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں ، اس پر ببانگ دھل تنقید کرتے ہیں - چونکہ آپ موجودہ نظام سے مطمئن نہیں اس لیے آپ نے اسی پر کافی تنقیدی مضامین لکھے ہیں - جنہیں پڑھ کر ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ پاکستان میں تعلیم کی بنیاد مذہبی اور انسانی اصولوں پر رکھنا چاہتے ہیں - اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے آپ پاکستان میں اسلامی نظریات کی تعلیم دینا اور قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا ضروری سمجھتے ہیں - یہ بات منوانے کے لیے ڈاکٹر صاحب اپنی علمیت کے سہارے آگے بڑھتے ہیں مگر تھوڑی دور چل کر آپ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتے - یہاں قاری اعتدال اور میانہ روی کے ان اصولوں کی کمی محسوس کرنے لگتا ہے جو آپ کے دوسرے مضامین کا طرۂ امتیاز ہے - لیکن اس میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی قصور نہیں - کیونکہ یہ مضامین آپ نے ایک نقاد یا محقق کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مشفق استاد کی حیثیت سے لکھے ہیں - یہی وجہ ہے کہ یہاں آپ کی تحقیق و تنقید سے زیادہ استادانہ کا رنگ نمایاں ہے - اور پھر نظریاتی طور پر بھی آپ اس بات کے قائل ہیں کہ جب تک استاد کو معاشرے میں اس کا جائز مقام نہیں ملتا ، اس وقت تک قوم کی ترقی مشکل ہے - یہی وہ نکتہ ہے جسے سمجھانے کے لیے سید صاحب کی تحریر میں شبلی کا سا جوش خود بخود پیدا ہو گیا ہے - ڈاکٹر صاحب کے مضامین کی دلکشی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ اپنے مضامین کو غیر ضروری طور پر پھیلانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے کسی نکتہ کو سمجھانے کی کوشش میں قیاس آرائیوں اور خوش گپیوں سے کام لیتے ہیں - ان کے یہاں فکری نظم و ضبط ، قوت استدلال اور منطقی توانائی کا شیرازہ نہیں بکھرتا اور آپ کے بیان میں حسن پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی تحریر کا ہر فقرہ با مقصد اور با معنی بن جاتا ہے - میرے خیال میں ایجاز و اختصار کا ایسا نمونہ اس دور میں شاید ہی کسی دوسرے ادیب تحریر میں ملے ، گو اس وقت رشید احمد صدیقی کا نام ہمارے ذہن میں ضرور آئے گا ، لیکن رشید صاحب اپنی علمیت اور ثقیل و مشکل الفاظ کے سہارے اپنی تحریر میں ایجاز و اختصار پیدا کرتے ہیں ، اور عام لوگوں کی علمی استطاعت کو مد نظر نہیں رکھتے - لیکن ڈاکٹر صاحب دوران تحریر اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ ان مضامین کو پڑھنے

والے اکتاھٹ محسوس نہ کریں ، اور درمیان ھی میں ادھورا نہ چھوڑ دیں ، بلکہ مصنف جو کچھ کہنا چاھتا ھے اسے سمجھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں - یہ ھے وہ نمایاں فرق جو آپ دونوں کی تحریروں میں ھمیں نظر آئے گا -

ڈاکٹر صاحب کی آج تک جتنی کتابیں میری نظر سے گزریں - اُن کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آپ کی تحریر میں سر سید کی سی قوت استدلال ، حالی کی سنجیدگی اور سادگی ، شبلی کا جوش اور وسعت تحقیق ، اور مولانا آزاد کی لطافت اور موزونیت پائی جاتی ھے - اور ان سب خصوصیات نے مل کر آپ کو ایک با اصول نقاد ، باضمیر ادیب اور مستند محقق بنا دیا ھے - یہی وہ چیزیں ھوتی ھیں جس سے کسی شخصیت کی عظمت کا پتہ چلتا ھے - گو آج ھم حقائق سے چشم پوشی کرتے ھوئے اُن کی عظمت و خدمات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے ، لیکن جوں جوں وقت گزرتا جائے گا ، ھمیں ان کی عظمت کا احساس ھوتا چلا جائے گا کیونکہ ایسی ھستیاں جو تاریخ ادبیات عالم کے ابواب میں ایک اور باب کا اضافہ کریں ، قوموں میں بڑی مشکل سے پیدا ھوتی ھیں ، اور ڈاکٹر صاحب انہی ھستیوں میں سے ایک ھستی ھیں - اس لیے آج وقت ھے کہ ھم اپنے اس محسن کا پورا پورا احترام کریں - یہ ھماری تہذیب و ثقافت ، ادب و زبان کے علمبردار اور سپہ سالار ھیں - ان سے بے پروائی برتنا پوری قوم سے بے پروائی برتنے کے مترادف ھے ، اور یہ وہ جرم ھے جس کی سزا ھمیں آئندہ آنے والی نسلیں بھی دیتی رھیں گی - اگر ھم سے کچھ اور نہیں ھو سکتا تو کم از کم اتنا تو کر سکتے ھیں کہ ان کے بتائے ھوئے اصولوں پر عمل کریں اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی پوری پوری کوشش کریں -

مت سہل ھمیں جانو پھرتا ھے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ھیں

پروفیسر رشید مرزا کے اس مقالہ کے بعد شبیر نیازی نے ڈاکٹر سید عبداللہ کے حضور منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا -

[امین‌الحق ھاشمی]

تعلیمی غلامی کے خلاف جہاد

خیالات و احساسات روح کی غذا ہوتے ہیں - وہ لوگ کتنے قابل قدر ہیں جو اپنے میکدۂ دل و دماغ سے اچھے خیالات و احساسات کے ساغر بھر بھر کے لنڈھاتے ہیں ، اور برابر لنڈھاتے ہی چلے جائیں -

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ بھی ایسی ہی قابل قدر ہستیوں میں سے ایک ہیں -

اخبارات میں ان کی جو بھی تقریر و تحریر آئی ، ایسا معلوم ہوا کہ کسی کف گل فروش سے لالہ و گل اچھل رہے ہیں دریا سے کوئی لہر اٹھی اور موتی بکھیر گئی - نسیم سحر کا کوئی جھونکا آیا اور شمیم جانفزا سے مشام کو معطر کر گیا - جب کوئی بات ڈاکٹر صاحب نے کی تو ندرت کے ساتھ کی - نغز گفتاری کے جوہر دکھائے - ساتھ ہی ہمیشہ اپنا تعمیری مقصد پیش نظر رکھا -

ڈاکٹر صاحب کے فیضان خاص سے اورینٹل کالج کی فضائیں اگرچہ محروم ہو گئیں لیکن اب ان سے فیضان عام کی آمیدیں استوار ہو گئی ہیں -

دور ایسا ہے کہ ضمیروں پر بوجھ بڑھ گیا ہے ، خصوصاً ملازمت خواہ کتنے بھی اونچے درجے کی ہو آدمی کو آج ایسی مکروہ قسم کی کشاکش میں ڈال دیتی ہے کہ سیرت و کردار کے بہت سے گراں بہا جوہر جنھیں خاندان نے نسلوں سے یکے بعد دیگرے ودیعت کیا ہوتا ہے اور کسی شخص نے برسوں اپنے اندر پالا ہوتا ہے ، کافور ہونے لگتے ہیں - آج مرتبے میں جتنی بلندی آتی ہے کردار میں اتنی ہی پستی پیدا ہوتی ہے - جسم جتنا پھلتا پھولتا ہے خودی اتنی ہی مرجھا جاتی ہے - سید صاحب کا بھی اس گھناؤنے دور سے سامنا ہوا اور حق یہ ہے کہ سید صاحب نے نظریں جھکائیں نہیں بلکہ زمانے کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کے دیکھا اور اس مرد درویش نے ایک نظر میں زمانے کے شاہانہ انداز نگاہ کو شکست دے دی - وہ اپنی مسند سے نیچے آئے اور بلند تر ہو گئے -

یہ چھوٹا سا انقلاب جو اوریئنٹل کالج میں یا سید صاحب کی زندگی میں واقع ہوا ، جس میں ایک پہلو رنج کا ہے اور ایک مسرت کا ، اس کے ظہور پر سید صاحب سے ملاقات کی ایک تمنائے بے تاب دل میں پیدا ہوئی - مگر جب تصور آیا ان کی مصروفیت کا ـــــ ان کی بے پناہ مصروفیت کا تو طبیعت کچھ ٹھٹک سی گئی - وہ مصروفیت جو خارج سے نہیں بلکہ سید صاحب کے داخل سے اُبھرتی ہے ، جو از خود پیدا نہیں ہو گئی بلکہ سید صاحب نے اُسے خود پیدا کیا ہے ، اسے ایک دیوار کی طرح تعمیر کیا ہے اور آئے دن بلکہ ہر لمحے اس پر نئے ردے رکھتے ہیں - یہ ایک قلعے کی فصیل کی طرح ہے - آخر اسے کون سر کرے - اس کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے پھر ہر وہ شخص جو ملازمت میں ہو یا جس نے ملازمت میں عمر گزاری ہو ، اس کا محتاط مزاج ایسے لوگوں سے توحش رکھتا ہے جن پر سیاسی دلچسپی کے گناہ کبیرہ کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہو - یہ لیبل کچھ اسی شان کا ہوتا ہے جیسے دواؤں کی بعض بوتلوں پر سرخ حروف میں لفظ زہر (Poison) لکھا ہوتا ہے - طرفہ ماجرا ہے کہ وہی چیز زہر بھی ہوتی ہے اور وہی دوا بھی - یہی حال اپنے انداز کے لوگوں کا ہوتا ہے کہ وہ معاشرہ کے لیے ضروری بھی ہوتے ہیں اور باعث حذر بھی ، تو جو لوگ اپنے سے حذر کرتے ہیں ، کیوں نہ ان سے خود بھی حذر کیا جائے - انھیں پریشانی میں کیوں ڈالا جائے -

مگر سید صاحب کی فطرت آزاد کی بال جنبانی کو ملازمت کی گرد پہلے بھی کبھی کم نہ کر سکی تھی ، اب تو انھوں نے اس گرد ہی کو جھاڑ دیا -

اور یوں بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سید صاحب سے مسلسل ملاقات رہتی ہے (اگرچہ رسمی ملاقات ہوئے عرصہ گزرا) جی ہاں ! یہاں کوئی فاصلۂ زمان و مکان حائل نہیں - دل بے تاب جہاں بھی ہو دوسرے دل بے تاب سے گہرا رشتۂ قرب رکھتا ہے -

یہ بہر حال مبارک بات ہے کہ سید صاحب پہلے سے زیادہ

ولولۂ کار لے کر آزاد فضاؤں میں پرورش لوح و قلم کرنا چاہتے ہیں——
وہ تعلیمی غلامی کے خلاف جہاد کرنا چاہتے ہیں جو ایک غلامانہ نظام تعلیم کا منطقی حاصل ہے ۔ وہ غلامانہ نظام تعلیم جس سے آزادی کے سترہ سال بھی ہمیں نجات نہ دلا سکے ۔ ان کا دوسرا موضوع خدمت اردو زبان ہے ۔ یعنی وہ زبان کی غلامی کے خلاف بھی نبرد آزما ہونا چاہتے ۔ یہ دونوں غلامیاں——یعنی تعلیمی غلامی اور لسانی غلامی—— جس دن ہمارے سروں سے ٹل گئیں ، اس دن دوسری تمام غلامیاں ختم ہو جائیں گی اور تمام آزادیاں بحال ہو جائیں گی ۔ لسانی غلامی خود اسی تعلیمی غلامی کا ایک شعبہ ہے ۔ جامع مسئلہ تعلیمی غلامی ہی کا ہے ۔ ابھی تک حال یہ ہے کہ ع

مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست

اس لیے شاہین بچوں کو خاکبازی کا سبق مل رہا ہے اور تعلیم کے تیزاب میں آہنی خودی کو ڈال کر راکھ کا ڈھیر بنایا جا رہا ہے ۔

تعلیم ہی تعمیر فرد اور تعمیر ملت کا عظیم ترین وسیلہ ہے ۔ تعلیم درست ہو جائے تو ساری مصیبتوں کا مداوا ہو سکتا ہے ۔

سید صاحب ! نظام تعلیم کی درستی کے لیے عمر کے آخری دور کی ایک ایک گھڑی کھپا دیجیے ۔ اور پھر اپنے مالک کے سامنے یہی سرمایۂ عمل لے کے پیش ہو جائیے کہ میں نے انسانیت ساز سانچوں کو درست کرنے کی بھرپور مہم اٹھائی تھی ۔ اسے قبول فرما لے ۔ یقین جانیے کہ آپ سرخرو ہوں گے !

———

ادرایہ ، ماہنامہ سیارہ لاہور ، اپریل ۱۹۶۵ء

جیلانی کامران

نئی شاعری کا مفہوم

نئی شاعری کے بارے میں ایک بات قابل غور ہے کہ اس کے شعری عقاید میں ہیرا فریس کی کوئی بھی گنجائش نہیں ہے - نئی نظم کو آسان نثر میں ترجمہ کرنا کسی مشکل کو حل نہیں کرتا - کیونکہ نئی نظم ، شعری اور نثری ، دونوں حالتوں میں نظم ھی کا مقام رکھتی ہے - ہماری ادبی تاریخ کا یہ زمانہ جب نئی شاعری ظاہر ہوئی ہے ، اس اعتبار سے ایک نہایت قابل ذکر زمانہ ہے کہ لکھنے والوں نے ان تمام رسمی اور روائتی ضروریات کو ترک کر دیا ہے جن کے ماتحت ادبی تخلیق کا کام ان کے آنے سے پہلے انجام پاتا تھا - مجھے اس سارے کاروبار میں سب سے پہلے شاعر کا خلوص دکھائی دیتا ہے - اور اس کے بعد جو خوبی نظر آتی ہے وہ شاعر کا اپنے آپ پر اعتماد ہے - روایت ، خلوص اور اعتماد ، دونوں کو ڈھانپ دیتی ہے - ان حالات میں نئے شاعر کا روایت کو ترک کر کے اپنے طور پر لکھنا انتہائی ذمہ داری کا کام ہے -

پچھلے آٹھ برس سے ، یعنی جب سے نئی شاعری کا باقاعدہ تخلیقی اور تنقیدی مطالعہ شروع ہوا ہے ، اس سچائی کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے کہ نئی شاعری ایک نئے تجربے کا نام ہے - تجربے کو سچائی مان کر نئی شاعری کو شعری اظہار کے لیے چنا گیا ہے - ساری وفا داریاں تجربے سے شروع ہوتی ہیں - اور تجربے ھی پر ختم ہوتی ہیں - تجربے کی صداقت کے علاوہ کوئی دوسری صداقت ایسی نہیں ہے جسے نئی شاعری میں شامل کیا جا سکے - ساری دقتیں یہیں سے پیدا ہوتی ہیں - لوگ شاعر سے تجربے کی صداقت نہیں ، حقیقت ظاہری کے بارے میں وضاحتی بیان مانگتے ہیں - اور وہ اپنی جگہ درست تقاضہ

کرتے ہیں کیونکہ اُن کی تربیت ایک ایسی شاعری نے کی ہے جسے اُنہوں نے اپنی پہلی فرصت میں سمجھا ہے - اور جس میں شاعر اور اُن کے درمیان کسی خندق کو پاٹنا نہیں پڑتا - نئی شاعری جسے تجربے کی سچائی کہتی ہے اسے وہ سمجھ نہیں سکتے - اور نئی شاعری ادبی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتی ہے -

شاعری کا کبھی کوئی مفہوم نہیں ہوتا - مفہوم زمانہ پیدا کرتا ہے - مگر زمانے بدل جاتے ہیں - اور اسی طرح مفہوم کے بارے میں کوئی حتمی رائے بھی قائم نہیں کی جا سکتی - اور بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ جو شے پھیلتی اور بدلتی ہے وہ صرف تجربے کی سچائی ہے - صرف یہی شے ہمیشہ رہنے والی ہے - مطالب و معانی ہر نسل کے بعد متروک اور بے کار ہوتے رہتے ہیں - انسانی زندگی کا ہر پردہ ایک نیا پردہ ہے جس پر نئے لوگ، نئے کارنامے اور نئی دنیا ظاہر ہوتی ہے - ان حقیقتوں کا ظہور، شاعر کے تابع نہیں ہے - اور دنیا کے موجودہ انتظامی اور سیاسی ڈھانچے میں اُس کا وجود مرکزی بھی نہیں ہے - اُس کے کہنے اور کرنے سے دنیا کے لائحہ عمل پر بہت کم اثر پڑتا ہے - اور خاص طور پر اس ملک میں شاعر کا مقام ایک ایسے شخص کے مانند ہے جو کسی بہت بڑے بجلی گھر کے باہر ٹھہر کر وزنی مشینوں کی صرف آواز سن سکتا ہے - روشنی اور تاریکی کا سوئچ بورڈ ماہروں کے قبضۂ قدرت میں ہے - ایسی صورت میں اُس کی جانبداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ روشنی کی حمایت کرتا ہے یا اُس کی وفاداریاں تاریکی کی قوتوں کے ساتھ ہیں - حقیقت یہ ہے کہ وہ اُن دونوں میں سے کسی کے ساتھ نہیں ہے - وہ صرف باہر ہے اور بجلی گھر میں مشین کام کر رہی ہیں - اگر اس استعارے کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ شخص جو بجلی گھر کے باہر ہے صرف ایک حس کو استعمال کرنے پر قادر ہے - اور وہ ہے، سننے کی حس! وہ دیکھنے سے قاصر ہے، وہ کچھ کر نہیں سکتا کیونکہ بجلی گھر کا دروازہ بند ہے - اور بجلی گھر کے اندر اے - سی کرنٹ کے برقی ذخیروں کے پاس موت کا علامتی نشان خطرے کی خبر دیتا ہے -

بجلی گھر کے استعارے کی دوسری شکل کچھ یوں ہے کہ اگر دروازے کے باہر ٹھہرا ہوا شخص دروازے میں داخل نہ بھی ہو،

اگر وہ چلا بھی جائے ، سو جائے یا صرف آسمان ہی کی جانب دیکھتا رہے - بجلی گھر کا سوئچ بورڈ ، برابر بجلی تقسیم کرتا رہے گا اور سپلائی کے نظام کے مطابق ، روشنی اور تاریکی ہوتی رہے گی - جب تک سوئچ بورڈ ماہروں کے پاس ہے ، پاور ہاؤس کام کرتا رہے گا اور شاعر دروازے کے باہر اس بجلی گھر کی وزنی مشینوں کو کام کرتے ہوئے سنتا رہے گا . . . . نئی شاعری سے پہلے ، ادبی تحریکوں کا مقصد سوئچ بورڈ پر کام کرتے ہوئے ماہروں کو بدلنے کا تھا - ان تحریکوں کے اعلیٰ دماغ مفکروں میں سے شاید کسی کا ایسا خیال نہ تھا کہ سوئچ بورڈ کو نا پسند افراد سے خالی کروا کے سوئچ بورڈ کو لکھنے والوں کے حوالے کر دیا جائے گا تا کہ وہ الیکٹرک سپلائی کی تقسیم کریں - اگر یہ بات درست ہے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر کا اصل مقام دروازے کے باہر ہے ، وہ ہر قسم کی چار دیواری کے لیے بے کار ہے - کیونکہ اُس کا مقام چار دیواری کے باہر ہے - اور جو کچھ چار دیواری کے اندر ہے اُس کے ساتھ شاعر کا رشتہ مختصر رسمی ہے -

جس نسل سے میں تعلق رکھتا ہوں اُس نسل کے بہترین نوجوان تخلیقی ذمہ داریوں کے اہل تھے - مگر اُن کے نزدیک چار دیواری کے باہر ٹھہرنا ناقابل قبول تھا - اس لیے وہ مختلف طریقوں سے چار دیواری کے اندر داخل ہو گئے - اور حیرت کی بات یہ ہے کہ کچھ عرصے کے بعد چار دیواری کے اندر گونجتی ہوئی آوازوں میں اُن کی آوازیں بھی گونجنے لگیں - اور اس طرح وہ بھی بجلی گھر میں کام کرنے والوں کی طویل فہرست میں شامل ہو گئے - حقیقت یہ ہے کہ دنیا جس موڑ پر سے اس وقت گزر رہی ہے ، اور ہم بھی جس دور میں سے گزر رہے ہیں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا ، جو اس بجلی گھر کے استعارے کو قبول نہ کرتا ہو - اور جس کے نزدیک بجلی گھر کا فائدہ مند ہونا ثابت نہ ہو - یہ بجلی گھر ، ایک اعتبار سے سچ مچ کا بجلی گھر ہے - مگر ہر اعتبار سے اس استعارے کے پیچھے نہ صرف اجتماعی زندگی دکھائی دیتی ہے بلکہ ہر مکان ، ہر خاندان ، ہر شخص ، ہر ادارہ ، اور ہر تنظیم ، اسی استعارے ہی کی جانی پہچانی شکلیں ہیں - اور ان شکلوں کے پیچھے ایک بڑی اور دھندلی صورت ہے ، یہ ہماری قومی تاریخ ہے ، جس کے

ھوش ربا ظہور کے سامنے نیا شاعر اُسی شخص کے مانند ٹھہرا ھوا دکھائی دیتا ھے جسے میں نے پاور ھاؤس کے باھر ٹھہرا ھوا شخص بتایا تھا . . . .

کیا ادبی تاریخ نے ایسے شاعر کو آج سے پہلے کبھی دیکھا ھے ؟ اور کیا یہ شاعر واقعی نیا شاعر ھے ؟ ایسے سوالات ھیں جن کا فوراً جواب دینا مشکل ھے کیونکہ ان کے جواب نفی اور اثبات دونوں میں ھیں - ان سوالات کا مثبت جواب اس لیے ھے کہ پچھلے ایک سو برس سے ادبی تاریخ ایسے شاعر سے آشنا نہیں ھے - اور منفی جواب اس لیے کہ ایسا شاعر ھماری شعری تاریخ کا ھمیشہ سے مرکزی کردار رھا ھے - شاہ حسین کے زمانے میں بجلی گھر کا استعارہ ، چرخے کی علامت محفوظ تھا - اور میر حسن کے زمانے میں چار دیواری کے باھر سفر کرنے والا شاعر مثنوی کا شہزادہ تھا - چار دیواری ھمیشہ سے موجود تھی ، اور شاعر ابتدا ھی سے اس چار دیواری کے باھر تھا - غزل کے شاعر اس چار دیواری سے ھٹ کر جس پائیں باغ میں فروکش ھوئے تھے وھاں انھوں نے چار دیواری کے اندر گونجنے والی آوازوں کے مقابلے میں ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی - اور نئی آوازوں کو سننے کی خواھش میں اپنے لیے نیا صنم اور نئی مذھبیات پیدا کی تھی - مگر غزل کے شاعروں سے ایک بڑی غلطی یہ ھوئی کہ انھوں نے جس چار دیواری کو ترک کیا ، اور جن آوازوں کو چار دیواری کے اندر نا پسند کیا ، پائیں باغ کے اندر اُسی نوع کا صنم اور زمانے ھی کے مزاج کی مذھبیات پیدا کی - وہ ایک چار دیواری کے باھر تھے - مگر اُسی رسم و سلوک کی ایک دوسری چار دیواری میں قید ھو گئے - غزل کی دنیا اس اعتبار سے شاعر کے قید و بند کی کہانی تھی - پچھلے ایک سو برس سے ھر ادبی تحریک کا مقصد اسی چار دیواری کو توڑنے کا تھا - اور شاعر کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس جہاد میں شرکت نہ کرتا - اس لیے حالی سے لے کر فیض تک ھر شاعر چار دیواری کو توڑنے میں مصروف رھا - اور ادبی تحریکوں کا مقصد یہی رھا کہ چار دیواری کے اندر گونجنے والی آوازیں بخوبی سنائی دیں اور سنی جا سکیں - آوازوں کو اُن کے اصل روپ میں پیش کرنا ، ان تحریکوں کی ادبی حکمت عملی کا ایک نہایت ضروری حصہ تھا . . .

پچھلی سب ادبی تحریکوں کی کامیابی اس بات سے ثابت ہے کہ اس وقت ہمارے شعری ادب میں نہ تو چار دیواری باقی ہے اور نہ پائیں باغ ، اور نہ پائیں باغ میں ظاہر ہوتا ہوا نیا صنم اور نہ وہ مذہبیات ہی باقی ہے جسے غزل کے شاعروں نے پیدا کیا تھا ۔ اس کامیابی سے ایک نقصان یہ ہوا کہ چار دیواری کو توڑتے توڑتے دوسرے تخلیقی فنکاروں کے ساتھ شاعر بھی تھک چکا ہے اور وہ نسل بھی تھک چکی ہے جو اس جہاد میں شریک تھی ، اور دوسرا نقصان یہ ہوا کہ آوازوں کو اُن کے اصل روپ میں پیش کرکے ، شاعروں نے جس ادبی محاورے کو پیدا کیا وہ اب تخلیقی طور پر کار آمد نہیں رہا ـــــ لیکن ان باتوں کا کئی بار پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے ۔

نئی شاعری کا ادبی نقشہ ٹوٹی ہوئی چار دیواری اور اجڑے ہوئے پائیں باغ کا نقشہ ہے ، جس پر بجلی گھر کی علامت ظاہر ہوئی ہے ۔ بجلی گھر کے ظاہر ہونے سے جہاں ایک بڑے پیچیدہ تعمیری عمل کا ظہور ہوا ہے وہاں آوازوں کی چار دیواری بھی ظاہر ہوئی ہے ۔ یہ آوازیں وزنی مشینوں کے استعارے اور ہماری قومی تاریخ کے ظاہر ہوتے ہوئے سلسلے سے پیدا ہوتی ہیں ۔ یہ ایک آواز نہیں کئی آوازیں ہیں ۔ ایک شخص نہیں ان گنت لوگ ہیں ، ایک پردہ نہیں کئی پردے ہیں ، آوازوں کا تصادم ، قدموں کی آوازیں ، ارادوں کا تصادم اور خواہشوں کا ٹکراؤ . . . . اس بڑے صوتی منظر نامے میں سوچ بورڈ پر کام کرتے ہوئے ماہرین اپنے کام میں برابر مصروف دکھائی دیتے ہیں ۔ اور نیا شاعر آوازوں کے دروازے کے باہر اس حیرت ناک منظر کو پھیلتے ہوئے دیکھتا ہے جو سننے کی شہادت سے پیدا ہوتا ہے ، مگر آنکھوں کے سامنے حیرت انگیز طور پر نئی نئی صورتیں اختیار کر لیتا ہے ـــــ یہی صورتیں ، نئی شاعری کے مفہوم کی وحشتوں کو پیدا کرتی ہیں ۔

کیا آپ نے ان آوازوں کو سنا ہے ؟ اگر آپ ان آوازوں کے گونجتے ہوئے صوتی منظر کو کسی ایک فقرے میں ، یا کسی ایک واضح پیراگراف میں بیان کر سکتے ہیں ، تو آپ کو اُس دشواری کا بھی علم ہوگا جو نئے شاعر کو در پیش ہے ، نئے شاعر کا مفہوم اُس کی نظم میں نہیں آوازوں کے اس مہیب شور اور تلاطم میں ہے جسے وہ

سن رہا ہے ۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ظہور کے ان گنت مناظر ہیں ، جن میں ٹوٹتے ، بنتے ، بڑھتے ، اور بگڑتے ہوئے کئی ایک منظر ہیں ۔ مگر یہ سارے منظر ایک ہی وقت میں ظاہر ہوتے ہیں اور ایک ہی لمحے میں ڈوب جاتے ہیں ۔ زندگی نے ہمیشہ اسی کھلے طور پر اپنا آپ ظاہر کیا ہے ۔ مگر شاعر اس بڑے سلسلے میں سے صرف ایک پہلو چن کر اسے اپنے تجربے کے ساتھ منسلک کر لیتا تھا ۔ نیا شاعر پہلوؤں کا چناؤ نہیں کرتا اس لیے جہاں آوازوں کی صورت کشی سے ظہور کے قریباً تمام مناظر تجربے کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں وہاں تجربہ بھی پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے ۔

نئی شاعری کا مفہوم تجربے کی پیچیدہ صورت میں پوشیدہ ہے ۔ اور یہ پیچیدہ صورت آوازوں کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے ۔ نیا شاعر اپنے تجربے کو آوازوں کے شور میں شامل نہ کرے تو آوازیں اپنی ہی گونج میں گم ہو جائیں گی ، جیسے ویرانے میں ہواؤں کی آوازیں ریت کے ٹیلوں میں جذب ہو جاتی ہیں ۔ نئے شاعر کا یہ کام کہ اس نے تجربے کی کوری سطح پر آوازوں کا تصادم محفوظ کیا ہے ایک ایسا کام ہے جسے صرف آنے والے زمانے کے لوگ پڑھ کر چونک اٹھیں گے کہ ماضی میں ہماری قومی تاریخ کا ظہور کس حیرت ناک صوتی منظر نامے میں سے گزرا ہے ۔ ان آوازوں میں ہم سب کی آوازیں ہیں ۔ اور اگر کسی طرح ہم اپنی آواز کو آوازوں کے اس بڑے ذخیرے میں پہچان لیں تو یقیناً وہ مفہوم بھی واضح ہو جائے گا جس کے لیے ہماری آواز ایک وسیلہ بنی تھی ۔ نئی شاعری اسی بڑے مفہوم کو بیان کرنے کا وسیلہ ہے ۔

———

یوم تجدید کی دوسری نشست میں پڑھا گیا

خود نوشت

[ایک سوالنامے کا جواب]

میں ایک ذی علم خاندان کا فرد ہوں - درس و تدریس میرے بزرگوں کا عمومی مشغلہ تھا - میرے والد ھی میرے اولین استاد تھے - میں نے ابتدائی دینی و دنیوی تعلیم انہی سے حاصل کی - قران مجید کے بعد ، کریما ، نامۂ حق ، پند نامہ عطار ، گلستان بوستان ــــ سکندر نامہ بری بحری ، یوسف زلیخا تک فارسی، ــــ خط کتابت ، انشائے شکستہ ، خوش خطی بعد میں حساب بھی انہی سے پڑھا -

میرے دوسرے استاد ، پرائمری سکول منگلور کے صدر مدرس مولوی محمد سعید اللہ ، شعر و شاعری کا خاص ذوق رکھتے تھے - گلستان بوستان کے اشعار اور فقرے ، نوک زبان رھتے تھے - شعر پڑھنے کا طریقہ خوب تھا - مسدس حالی ان کی محبوب کتاب تھی ، بر محل پڑھتے تھے اور سب کو متاثر کرتے تھے -

میں پرائمری کی تعلیم کے بعد مانسہرہ کے مڈل سکول میں داخل ہو کر پانچ سال تک اسی سکول میں پڑھتا رھا - اس زمانے میں آب حیات (آزاد) اور توبتہالنصوح (نذیر احمد) ساتویں جماعت کے نصاب میں تھی - آب حیات کی جذباتی عبارتوں اور متعلقہ اشعار نے بہت متاثر کیا ــــ ، میں لڑکپن کی منزل میں پہنچ چکا تھا ــــ ، چاندنی ھر سو کھلتی دکھائی دیتی تھی ، سفیدہ اور گوند کے بلند بالا نہالوں کے قد بہت خوب صورت معلوم ھونے لگے تھے - مانسہرہ میں اپریل میں قہر آلود زمستاں کا اختتام ھو کر بہار آنے لگتی ھے - چشموں کے کنارے خود رو پھول اُگ آتے ھیں اور کوہ و دمن پر پھولوں کے بستر بچھ جاتے ھیں - ایسے میں ، آب حیات میں میر و سودا کے اشعار نے عجیب کیفیت پیدا کی - ان اثرات کے تحت میں شاعر

ہو گیا اور ایبٹ آباد ہائی سکول میں پہنچ کر باقاعدہ شاعری شروع کر دی ـــــــ پھر داستان پڑھنے کا شوق پیدا ہوا - ایک دوست کے پاس طلسم ہوش ربا کی ایک جلد تھی - گرمیوں کی لمبی دوپہریں ، اس کے مطالعہ میں صرف ہونے لگیں - کمپنی باغ (جناح باغ) کے دیودار اپنے بازو پھیلا کر میرا استقبال کرتے تھے ، میں ان کے زیر سایہ اس عیش بافراغت کے مزے لوٹا کرتا تھا -

ایبٹ آباد سے لاہور آنے پر ماحول بدل گیا ـــــــ، میں اب دین اور سیاست میں دلچسپی لینے لگ گیا - تحریک خلافت کا زمانۂ شباب تھا ـــــــ زمیندار اخبار اس زمانے میں ادب و سیاست کا دو آتشہ مہیا کرتا - تقریباً روزانہ مولانا ظفر علی خاں کی نظم زمیندار میں چھپتی اور سارے شہر کو تڑپا جاتی - میں بھی زمیندار کا مشتاق ہو گیا ـــــــ طبیعت نے سیاسی شاعری کا مزا پایا - اس اثنا میں پروفیسر سید عبدالقادر (استاد تاریخ اسلامیہ کالج لاہور نے) جذبات قومی کے نام سے قومی شاعری کا انتخاب چھاپا - میں نے بڑے ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کیا - شاید تمام کتاب حافظے میں محفوظ ہو گئی - اس واسطے سے میں اقبال ، حالی ، اکبر ، شبلی ، آغا حشر ، چکبست وغیرہ سے روشناس ہوا اور یہ نشہ مجھ پر اس درجہ غالب آ گیا کہ مجھے غزل کی شاعری کے خلاف ایک طرح کا تعصب پیدا ہو گیا ـــــــ یاد رہے کہ یہ میں میٹرک کے زمانے کی بات کر رہا ہوں -

پھر قدرت مجھے علی گڑھ لے گئی - میں تحریک خلافت کا ایک کم عمر سپاہی بن کر جامعہ ملیہ علی گڑھ کا طالب علم ہو گیا ـــــــ مولانا محمد علی رئیس‌الجامعہ تھے - اقبال کی تدریس ان کے ذمے تھی - وہ ہفتے میں ایک دن لیکچر دیا کرتے تھے - اسرار خودی پر ان کا ایک لیکچر $6\frac{1}{2}$ بجے صبح سے لے کر $12\frac{1}{2}$ بجے تک جاری رہا - اس تقریر میں مولانا محمد علی نے قوموں کے عروج و زوال کے اسباب شمار کیے - مجھ پر پہلی مرتبہ منکشف ہوا کہ اقبال ، ایک عظیم فلسفی اور عظیم تر شاعر ہیں -

علی گڑھ میں دینی ادب کی تدریس کا خاص اہتمام تھا - مگر میں اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا - اس وقت میری عمر تقریباً سولہ سال تھی -- مولانا عبدالحی استاد تفسیر تھے مگر میں ان کے پیش کیے

ہوئے معارف کو سمجھ نہیں سکتا تھا ۔ دینی علوم سے میری دلچسپی ، علی گڑھ سے واپسی پر ، لاہور میں اس وقت بڑھی جب میں مرحوم و مغفور مولانا احمد علی صاحب کے حلقۂ درس میں شریک ہوا ۔ اور بعد میں مولانا غلام مرشد سے بھی استفادہ کا موقعہ ملا ۔

زمانے کا انقلاب بھی عجیب چیز ہے کہ ۱۹۲۲ع میں میرے مطالعات اور میرے ذوق کا محور بالکل بدل گیا ـــــــ، دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے ۔ انگریزوں کے نظام تعلیم کا مقاطعہ جاری نہ رہ سکا ۔ میں پھر انگریزی نظام تعلیم کے ملامت کدے میں داخل ہو گیا ۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں اب اس نظام تعلیم کو اچھا سمجھنے لگا تھا بلکہ اس انکشاف کی بناء پر کہ قوم میں بے قدری اور نا قدردانی اس درجہ غالب نظر آئی کہ خلافت کے لیے لڑنے والے ، مسلمانوں کی نظر میں معتوب اور غدار ٹھہرے ۔ اس نا قدردانی نے یہ محسوس کرایا کہ مسلمانوں کی نئی ذہنیت کے پیش نظر ، قربانی سے بڑھ کر کوئی کام بے مدعا نہیں ۔ خصوصاً یہ نکتہ طلباء کے سمجھنے کا ہے کہ اس ذہنیت کے ہوتے ہوئے ، اپنی تعلیمی تکمیل اور تعمیر ہر شے پر مقدم ہے ۔

یہ انکشاف مجھ پر ہونے کو تو ہو گیا لیکن اس کو قبول کرنے میں بڑی دیر لگی ـــــــ اس تضاد اور ذہنی انتشار کے عالم میں ، تعلیم کے ہمراہ ، مطالعہ کی ضرورت ایک روحانی ضرورت بن گئی ، چناں چہ میں نے ہر قسم کی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں ۔ اس سے پہلے میں غزل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا ۔ مگر اب حسرت موہانی کا دیوان ہر وقت پیش نظر رہنے لگا ۔ بجنوری کے رسالہ یا مقدمہ (محاسن کلام غالب) نے بہت متاثر کیا ۔ شبلی کے زیر اثر تاریخ کا ذوق ابھرا مگر مجھے ناول کے خلاف بدستور تعصب رہا ۔ میں سوانح عمری کو حقیقت اور ناول کو تخیل کی ملمع کاری سمجھتا رہا ۔

۱۹۲۵ع میں میں نے ایم ۔ اے فارسی کا امتحان پاس کیا ۔ ۱۹۲۶ع سے ۱۹۳۳ع تک میں اوریئنٹل کالج کے اساتذہ کے زیر تربیت رہا ، اور قدیم ادب اور تاریخ میں دلچسپی لیتا رہا ۔ لیکن عشقیہ شاعری ، سوانح عمری اور کلچر اور سیاسیات کی کتابیں بھی پڑھتا ۔ تہذیب کا مطالعہ بھی میرا محبوب مشغلہ تھا ، برفالٹ کی کتاب تشکیل انسانیت ، ون وڈ ایڈ کی کتاب ، 'شہادت انسان' ـــــــ اور مل کا

رسالہ آزادی نہایت شوق سے پڑھا ، بعد میں میکالے کی تاریخ انگلستان اور عظمائے یورپ کی سوانح عمریاں پیش نظر رہیں . ایبٹ کی کتاب حیات نپولین کے علاوہ رشلو ، میزنی ، بس مارک کی سوانح عمریاں بھی دیکھیں - جب ۱۹۳۲ع میں طالسطائے کے ناول ''جنگ اور امن'' کا مطالعہ کیا تو میری آنکھیں کھل گئیں - دردمندی کے مسلک سے آگاہ ہوا - مگر اس زمانے میں محبت کی بات سب سے زیادہ متاثر کرتی تھی ، درد و الم اور انسانی مقدر کی شکست کا تخیل اچھا نہیں لگتا تھا - گاندھی کی سوانح عمری نے متاثر کیا لیکن اس کا فلسفہ صحیح ہونے پر بھی اونچا اور ناقابل عمل نظر آیا ـــــ !

۱۹۳۵ع سے ۱۹۴۸ع تک میرے مطالعات کی فہرست بے حد طویل ہے - سیاست ہندوستان ، تاریخ ہندوستان ، تاریخ اقوام اسلامی ، دینی افکار ، تہذیب اور اردو فارسی شعرا کے دواوین پیش نظر رہے ، فارسی میں ، میں سب سے زیادہ حافظ سے متاثر ہوا اور اب تک ہوں -

۱۹۴۷ع کے بعد تدریسی ضرورتوں نے میر تقی میر سے روشناس کیا ـــــ اب میں نے اردو ادب کے عظیم شاہکاروں کی طرف توجہ کی - پریم چند کی انسان دوستی نے بے حد متاثر کیا - یوں قاضی عبدالغفادر کی 'لیلیٰ کے خطوط' کی جذباتی انشا بھی خاصی دل کش رہی ـــــ ، نیاز فتح پوری کی کتابوں سے میں مرعوب ہوا - مگر مجھے نیاز کی یہ ادا کبھی پسند نہ آئی کہ مخلوق ہو کر خالق سے لڑائی کرنے کا دعویٰ کرتے رہتے ہیں - خدا کی ہنسی اڑاتے ہیں مگر دراصل اپنا مذاق اڑاتے ہیں -

ترقی پسند ادیبوں میں ، میں فیض سے بے حد متاثر ہوا اور نثر میں کرشن چندر ، احمد ندیم قاسمی ، اشفاق احمد ، مرزا ادیب میرے خاص نثر نگار ہیں - میں منٹو کی مصوری کو مانتا ہوں مگر منٹو ، اکثر اپنی شخصیت بنانے کے لیے جرم کے داعی اور مجرموں کے سب سے بڑے وکیل بن جاتے ہیں - یہی حال عصمت چغتائی کا ہے ـــــ جو خاتون اپنے بھائی کو دوزخی کہنے سے گریز نہیں کرتی وہ دوسرے انسانوں کے بارے میں کیا کیا نہ سوچتی ہوگی -

میں نے میراجی کو شوق سے پڑھا ، مجھے ان کا جذب اور شغف بہت اچھا لگا اور دوری و نارسائی کے نقشے بھی بہت اچھے تھے مگر

تر دامنی کا جو نیا تصور انھوں نے پیش کیا وہ روحانی ابتری کی علامت ہے - میں اب جس منزل میں ہوں اس میں مجھے غالب کے اشعار پھر اچھے لگتے ہیں۔، غالب انسانی تقدیر کی شکست کا مقابلہ اچھا کرتے ہیں - مگر انسان کیا اور اس کی تقدیر کیا ؟ سب وہم معلوم ہوتا ہے -

میں نے آپ کے ابتدائی سوالوں کو یک جا کرکے اکٹھا جواب دے دیا ہے ، اس ضمن میں میں یہ واضح کر دوں کہ میں مغرب کے ادب سے دلچسپی تو رکھتا ہوں لیکن دل کی کلی نہیں کھلتی - طبیعت صرف اپنی زبانوں کے ادب سے کشادہ ہوتی ہے ، اور میں در حقیقت مشرق ادیبوں ہی کا طالب علم ہوں -

میں غم پسند آدمی ہوں اس لیے غم کے مضامین بہت اچھے لگتے ہیں ــــــ مگر غم کے مضامین میں محبت کے عنوان موجود ہوں تو میرا دل کھل جاتا ہے ــــ دور دور تک باغ پھیلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں -

محبت سے میری مراد عام محبت کا جذبہ ہے - اگرچہ میرے اس رویے نے مجھے دنیاوی طور سے بہت نقصان پہنچائے ہیں پھر بھی مجھے یوں لگتا ہے کہ محبت ہی دنیا کے ہر دکھ کا علاج ہے ــــ یعنی ان سے بھی محبت جن سے گزند پہنچا ہو ــــ بڑا ناقابل عمل فلسفہ ہے یہ ، مگر شرافت کی شریعت میں اس کے بغیر چارہ نہیں -

بدی کا جواب بدی سے دینا ممکن ہے مگر یہ تو بدی کے کاروبار کو پھیلانا ہے ــ آخر کوئی جگہ تو ہو جہاں بدی کا سلسلہ ختم ہو سکے -

میرا سب سے محبوب مشغلہ خود کلامی ہے - اس خود کلامی میں میرا خطاب خود سے یوں ہوتا ہے - ''اس کے باوجود خدمت کیے جاؤ ، اس کے باوجود محبت کیے جاؤ ، اس کے باوجود مسکراتے رہو'' ــــــ میں کوشش کرتا ہوں کہ ان فقروں پر عمل بھی ہوتا رہے - اور شاید اسی خود کلامی کی برکت تھی کہ میں تازہ ترین آزمائش[1] میں زیادہ ناکام نہیں رہا ــــ ، میں نے جس ذہنی و روحانی تکلیف سے اپنے کالج کو چھوڑا اس کا اندازہ بے دردوں کے شہر کے باسی نہیں لگا

۱- بعض ناسماعد حالات کی بنا پر یونیورسٹی سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ پر مجبور ہونے کا واقعہ جو اس قوم کی علمی تاریخ کے مورخ کی نظر میں یقیناً ایک قومی سانحہ ہوگا - [م-م]

سکتے ـــــ اور اب ان بے دردوں سے مجھے کلام کی ضرورت بھی نہیں :

ہر سنگ و خشت ہے صدف گوہر شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

مطالعہ کے لیے تنہائی مل جائے تو سبحان اللہ مگر آج تک یہ نعمت ملی نہیں ۔ میں پھول اخبار بلڈنگ میں رہتا تھا ۔ وہاں کثرت آمد و رفت کے علاوہ شور و شغب کا ایک محشرستان بپا رہتا تھا ۔ چونکہ مطالعہ ناگزیر تھا اس لیے بہت جلد طبیعت کو ہنگاموں سے مانوس کر لیا ـــــ !

سفر میں مطالعہ کرتا ہوں اور اس میں بڑا مزا آتا ہے ـــــ ریل میں ، ہوائی جہاز میں ، اپنی موٹر میں ، تانگے میں ، غرض کہیں بھی ہوں ، مطالعہ میری ملاقات سے انکار نہیں کرتا ۔ وجہ یہ ہے کہ میں لاڈلا نہیں ہوں ۔ میں کتابوں پر نشانات بھی لگاتا ہوں اور ضرورت ہو تو حاشیے پر اپنا رد عمل بھی لکھتا جاتا ہوں ـــــ ، یونیورسٹی لائبریری کی ہزاروں کتابیں دیکھیں ، چونکہ حاشیہ نویسی کی عادت سے مجبور تھا اس لیے کتاب کے اندر حاشیے چڑھانے کی بجائے ، شروع اور آخر کے سادہ اوراق پر اپنے تاثرات لکھتا رہا ـــــ عادت اچھی نہ تھی مگر جاری رہی ۔

میری ذاتی لائبریری میں پیش کش کی کتابیں زیادہ ہیں ـــــ ، میں نے خود جو کتابیں خریدیں ، تدریسی ضرورتوں کے تحت خریدیں میرا کتب خانہ ایک مدرس کا کتب خانہ ہے ۔

آپ کے سوالوں کی فہرست طویل ہے ، اس لیے سب کا جواب ممکن نہیں ۔ سوال نمبر ۲۵ کا جواب یہ ہے کہ ناظرہ قران چھڑوانے کی تحریک ، بد نیتی یا احمقانہ نیک نیتی پر مبنی تھی ۔ اس سے بہت نقصان ہوا ۔ ضرورت ہے کہ ناظرہ قران پڑھانے کی تحریک پھر جاری کی جائے ۔

مطالعہ کی یہ سرگزشت سرسری ہے ـــــ ، ہم لوگ جن کا ذریعہ معاش کتاب و قلم سے وابستہ ہے ، مطالعہ نہ کریں گے تو کیا کریں گے ۔ جن لوگوں کو مطالعہ کا ذوق ہے اور اس سے کوئی غرض دنیوی وابستہ نہیں ـــــ ان کی تعداد قوم میں کچھ زیادہ نہیں ـــــ ، ہمارے یہاں کی نو دولتی نے دولت کے ساتھ ابھی شوق کتاب کو جمع نہیں کیا ۔

ڈائجسٹوں نے ادبی رسالوں کی توقیر کم کر دی ہے ۔ تاہم ان سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ اردو گھروں کے اندر پہنچ گئی ہے اور خواتین کو اپنی زبان میں پڑھنے کے لیے مواد مل جاتا ہے ۔

بس یہ ہیں میرے خیالات ، مطالعہ کے موضوع پر فقط والسلام ۔

ماہانہ سیارہ ، لاہور کے ۱۹۶۵ع کے سالنامے میں ''میرامطالعہ'' کے عنوان سے ایک سوالنامے کے جواب میں چھپا ۔

زبیر مشہدی
صدر انجمن احباب فکر — ایبٹ آباد

علوم شرقیہ کے محسن اعظم ڈاکٹر سید عبداللہ

مت سہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں (میر)

ڈاکٹر لائٹنر اوریئنٹل کالج کے پہلے پرنسپل اور ڈاکٹر ایلفرڈ وولنر پرنسپل اور وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی علوم شرقیہ کے بڑے محسنوں میں تھے - انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ مشرق کی پراسرار زمین کے ادبی ذخائر میں معلومات کے بیش بہا خزانے چھپے ہوئے ہیں اور ان کارناموں کو سرانجام دینے والے قعر گمنامی میں چھپے ہوئے ہیں لہٰذا قدرت کے ان انمول رتنوں کی تصنیفات سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ ان کو اجاگر کیا جائے اور ان گنج ہائے گراں مایہ سے لوگوں کو مستفید کرایا جائے اور ان معلوم کردہ حقائق کی روشنی سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور علوم شرقیہ کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کی جائے تاکہ یہ علوم دوسرے مغربی علوم کی زد میں آ کر تباہ نہ ہو جائیں - اس مقصد کے لیے انہوں نے مشرقی علوم کے الگ ادارے اوریئنٹل کالج کی آبیاری اور ترقی کی طرف خصوصی توجہ دی -

اس ادارے کو کامیاب بنانے کے لیے عوام نے بھی لائٹنر اور وولنر صاحب کا ہاتھ بٹایا - اس زمانے میں مغربیت کا زہر قوم میں اتنا نہیں پھیلا تھا لہٰذا انہیں کوئی خاص مشکل در پیش نہ آئی -

حالات بدلتے رہے زمانہ گزرتا رہا - اور یہ درس گاہ بھی اپنا کام کرتی رہی - اس ادارے میں اعلیٰ اور بلند پایہ اساتذہ مامور کیے جاتے

رہے جو اپنے علم و فضل اور انتھک محنت سے اس ادارے کو راہ ترقی پر گامزن کرتے رہے ۔ اور ایک دن وہ بھی آیا جب وولنر کے بعد خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب کو اس کی قیادت سونپی گئی ۔ اس علم کے عظیم پیکر اور بحر جود و سخا نے اس ادارہ کو بہت کچھ دیا ۔ اور اس کی اہمیت کو لوگوں پر روشن کرتے رہے ۔ اور ادارہ کو سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کو مجبور کرتے رہے ۔

اس دوران میں حالات زمانہ نے تیزی سے پلٹا کھایا ۔ لوگوں میں مغرب زدگی کا زہر تیزی سے پھیلتا چلا گیا ۔ ادب کے طالب ، ادب کے طالب نہ رہے ۔ ان پر مغربیت کے حسن کا جادو چل گیا ۔ اور قوم نے سہل انگاری اختیار کی اور سہل انگاروں کی طرح صرف اس بات پر اکتفا کرنا ہی کافی سمجھا کہ مغرب والے علوم و فنون کی ہر شاخ میں ان کے آباو اجداد کے کارناموں کے مقلد ہیں اور اسی پر قوم مست رہی کہ وہ بوعلی سینا ، رازی ، غزالی ، ابن بیطار ، ابن زہراوی اور خیام جیسی عظیم ہستیوں کی اولاد ہیں ۔ مگر کبھی نہیں سوچا کہ ہم ان کے نام لیوا ہیں اور ہمیں بھی چاہیے کہ ان کی معلوم کردہ حقائق کی روشنی میں آگے بڑھیں اور ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا سبب بنیں ۔ مگر مغرب نے ان کی رگوں میں تن آسانی کا زہر ایسا پھیلا دیا تھا کہ ان کی حالت حافظ شیراز کے اس شعر کے بمصداق ہو گئی کہ :

قومے بجد و جہد گرفتند وصل دوست
قومے دگر حوالہ بتقدیر مے کنند

ایک دن ڈاکٹر مولوی محمد شفیع بھی اس ادارے کی قیادت سے سبکدوش ہوگئے ۔ اور اب یہ ادارہ اس سفینہ کی مانند تھا جس کا کوئی ناخدا نہ ہو ۔ سیل حوادث کی موجیں اس ادارے کی کشتی کو پرکاہ کی طرح جدھر جی چاہتا لیے پھرتیں ۔ اور باد تند و تیز نے ایک زلزلے کی حیثیت اختیار کر لی ۔ اور یہ امکان روشن ہونے لگا کہ اس ادارے کی بقا اور سلامتی اب مشکل ہے ۔ اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ چند دنوں میں ایلفرڈ وولنر کے اس پودے کو باد سموم بھسم کر دے گی ۔

مگر قادر مطلق کو کچھ اور ہی منظور تھا اور اس کی شان کریمی اس ادارے کو ہر سیلاب بلا خیز کے گرداب سے محفوظ رکھتی رہی ۔ کیوں کہ قدرت کا منشا یہ نظر آتا تھا کہ تیزی سے

پستی کی منازل طے کرنے والے اس ادارے کو مستقبل قریب میں اس سے زیادہ تیزی سے اوج ثریا سے ہم کنار کرنا ہے - چنانچہ قدرت نے اس ادارے کی قیادت ایسے ہاتھوں کو سونپی - جس نے علامہ اقبال کے مرد مومن کی یاد تازہ کر دی اور قدرت نے وہ مرد مومن کی روح ڈاکٹر سید عبداللہ کی عظیم شخصیت میں دکھائی -

ایسے ناسازگار حالات میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اس ادارے کی قیادت سنبھالی جب کہ اس ادارے کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا یوں کہیے کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا - اور عربی ، فارسی اور اردو کی بقا کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا - لوگ اپنی ثقافت سے بیزار تھے اور ہر ایک عروس فرنگ کا شیدا تھا - ارباب اختیار علوم شرقیہ کو علوم غربیہ کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتے تھے - اور صاحب دل حضرات اس بات پر متاسف تھے کہ سید صاحب نے ایسے ادارے کی قیادت کیوں سنبھالی جس کی بنیاد ریت پر رکھی ہوئی ہے اور اس ادارے کے خاتمہ کا وقت اگر قریب نہیں تو دور بھی نہیں مگر انہیں کیا خبر تھی کہ سید صاحب کی مضبوط اور بے پناہ قوت خود اعتمادی اور جفا کشی اس ادارے کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بجھنے نہیں دے گی -

سید صاحب نے محنت شاقہ اور بے لوث اخلاص کو بروئے کار لا کر اس ادارے کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو شمع بنا کر رکھ دیا اور خون جگر سے اس کو وہ نمو بخشی کہ اس کی ضو سے کوہ و بیاباں بھی روشن ہو گئے - یہ صرف سید صاحب کا عزم ، ولولہ ، اور جوش تھا جس کے طفیل یہ ادارہ اوج تک جا پہنچا اور لوگ انگشت بدنداں رہ گئے - اس ادارے کی حالت ان کے قیادت سنبھالنے سے قبل ناگفتہ بہ تھی مگر اب اس ادارے کی حالت ہی اور ہو گئی - ہزاروں لوگ جوق در جوق اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے آتے - اور یہ صرف سید صاحب کا فیض نظر تھا - اگر اس ادارے کے در و دیوار کو قادر مطلق ایک لمحہ کے لیے قدرت گویائی سے نوازے تو وہ بھی اپنی گزشتہ حالت سے موازنہ کرنے کے بعد پکار اٹھیں گے :

میں جس مقام پہ پہنچا مرا مقام نہ تھا
مری تلاش غم روزگار ہو نہ سکا (زبیر مشہدی)

سید صاحب کی قیادت سے پہلے اس ادارے کے محل وقوع اور نام

سے محدودے چند لوگ آشنا تھے - اس کی ہستی کا علم بمشکل ہوا کرتا تھا - لوگ اس ادارے تک لاء کالج کی وساطت سے آیا کرتے تھے - کوئی شخص باہر سے آتا تو وہ حیران ہوتا کہ اس کالج کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں - جیسے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قوم بت فرنگ کی کافر ادائیوں کی شیدا تھی اسے اپنی تہذیب و تمدن سے گھن آتی تھی وہ اس ادارے کی تضحیک و تذلیل کرتے اور اس ادارے کو مولویوں کا کالج کہہ کر اس ادارے کا تمسخر اڑاتے تھے - مگر سید صاحب نے اس ادارے کو اپنے خون جگر سے وہ نمو بخشی جو کسی دوسرے ادارے کو نہیں ملی - انہیں کے دم سے اورینٹل کالج کو وہ عظمت ملی جس کا وہ مستحق تھا -

سید صاحب نے اپنے کردار ،گفتار اور عمل سے اس ادارے کی اہمیت قوم کے افراد کے دل نشیں کرنے کے لیے اردو ، عربی ، اورینٹل کانفرنسیں منعقد کیں - مزید برآں اس ادارے کا یوم تاسیس منانے کی رسم قائم کی اور اس کو نبھایا بھی خوب - سید صاحب کی قیادت سے قبل لوگ اس ادارے کو اہمیت نہ دیتے تھے مگر اب اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ اورینٹل کالج کے سند یافتہ ہیں -

سید صاحب کو اس ادارے کی ترقی و ترویج کے لیے بے شمار قربانیاں دینی پڑیں - انہیں سہولتوں کی جگہ اکثر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا - اور درس و تدریس ، تحقیق و تنقید کے علاوہ ادارے کے نظم و نسق کے لیے اپنا بہت سا وقت دینا پڑا - آپ حیران ہونگے کہ چوبیس گھنٹوں میں بمشکل پانچ گھنٹے، وہ بھی رات کو ، انہیں آرام کرنے کا وقت ملتا تھا مگر اس کے باوجود ان کی زبان سے کبھی یہ لفظ نہیں نکلا کہ میں تھک گیا ہوں یا مجھے تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے -

سید صاحب عدیم النظیر استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بے نظیر منتظم بھی ہیں - انہوں نے اپنے ادارے کا انتظام اس تیزی سے بحال کیا کہ لوگ عش عش کر اٹھے - انہوں نے اس ادارے کو زینت بخشنے کے لیے بے مثال گوہر گرانمایہ چنے کہ بے ساختہ لوگوں نے داد دی - مزید برآں ان کی سرپرستی میں جو ادبی اور تحقیقاتی کام ہوئے وہ بھی اپنی جگہ قابل ستائش ہیں اور بذات خود جو کچھ انہوں نے علوم شرقیہ ادب کو دیا ہے وہ الگ ہے - سید صاحب کا نصب العین یہی رہا کہ اس

ادارہ کو اس مقام پر پہنچایا جائے جہاں سے یہ صرف معمولی سی کوشش سے ایک یونیورسٹی بن جائے اور ایک مثالی ادارہ بن جائے۔ مزید برآں وہ یہ چاہتے تھے کہ علوم شرقیہ کی ترقی و ترویج کے لیے کوشش کی جائے اور مسلمانوں کی عظمت اور اسلامی ثقافت کی روح سے لوگوں کو بہرہ ور کیا جائے اور تعلیم کی بنیاد اسلام کو بنایا جائے۔ ہر کس و ناکس کو عام کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں کہ وہ بلا امتیاز شمع علم سے مستفید ہو۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ بھی میرے ساتھ متفق ہونگے کہ اوریئنٹل کالج اور علوم شرقیہ کو عظمت بخشنے میں اور دوبارہ اس کا مقام بنانے میں ڈاکٹر صاحب کی ہستی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ انہوں نے انتھک اور بے لوث خدمت سے اس ادارہ کو اس مقام تک پہنچا دیا جو اس کی منزل تھی اور قوم کے دلوں میں علوم شرقیہ کی عظمت کے چراغ روشن کر دیے۔

سید صاحب کی بے لوث خدمات کا صلہ کیا دیا جا سکتا ہے۔ اور ارباب اختیار نے جو صلہ دیا ہے وہ دنیا کے دستور کے عین مطابق ہے کیوں کہ آج تک دنیا نے کسی کو اس کی خدمات کے مطابق صلہ نہیں دیا ، بلکہ ان اصحاب کے دامن پھولوں کے بدلے خاروں سے مزین کیے گئے ہیں۔ قصہ مختصر علوم شرقیہ اور تاریخ ادبیات کا مورخ ان کی خدمات کو فراموش نہیں کرے گا۔ ۲

---

۱ - حضرت میر کے شعر میں تھوڑا سا تصرف کیا ہے۔ انہیں کی جگہ ہمیں اصل شعر میں ہے۔

۲ - یہ مقالہ یوم تجدید عزم کے موقع پر ایبٹ آباد میں پڑھا گیا۔

ضیاء رضوی ' ایم - اے

اب نہ آئے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد

سید صاحب جا رہے ہیں !

برگد کا پرانا درخت اداس ہے !

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کی فضائیں اداس اداس ہیں - در و دیوار سر جھکائے کھڑے ہیں - معلوم ہوتا ہے وہ اپنے ہم سفر دیرینہ کی جدائی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں - برگد کا وہ درخت جس کی مدافعت کے لیے کبھی سید صاحب سینہ سپر ہو گئے تھے ان کو کالج سے رخصت ہوتا دیکھ کر مضمحل سا کھڑا ہے - اس کے آنسو ڈھلک کر زمین تک آ گئے ہیں - وہ ان کے کالج کی علامت ہے - سید صاحب کو اس کے ساتھ روحانی لگاؤ اور قلبی تعلق ہے - ایک مرتبہ یونیورسٹی کی طرف سے اس درخت کو کاٹنے کے لیے کچھ لوگ آئے تھے تو سید صاحب نے کہا تھا یہ درخت ہمارے کالج کا سمبل ہے - یہ آرا میرے جیتے جی اس درخت پر نہیں چل سکتا - کالج کا وہ درد مند جسے اپنے کالج کی بے جان چیزوں میں بھی زندگی کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے کالج سے رخصت ہو رہا ہے -

اورینٹل کالج ' لاہور کی قدیم درسگاہوں میں سے ہے اور عہد گذشتہ کی بہت سی تدریسی روایات کو اب تک اپنے سینے میں چھپائے کھڑا ہے - یہاں استاد اور شاگرد کے درمیان وہ مقدس رشتہ اب بھی قائم ہے جو اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے ہوا کرتا تھا اور اب افسانہ ماضی بن چکا ہے - مغربی طرز کی درس گاہوں سے فارغ شدہ طالب علم جب کبھی بھولے بھٹکے اردو ' فارسی عربی ایم - اے کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے یہاں آ پھنستے ہیں تو انہیں اس تجربے سے بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ یہاں استاد شاگرد کو سگریٹ پیش نہیں کرتے - یہاں سرکش سے سرکش طالب علم بھی استادوں کی شفقت پدری کے سامنے جھک جانے پر مجبور ہو جاتا ہے - یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی خصوصیات اورینٹل کالج کی روایت بن چکی ہیں - اور یہ ان ہی چند بزرگ اساتذۂ کرام کے دم قدم کی بدولت ہیں جن کے قائد جناب ڈاکٹر سید عبد اللہ

صاحب پرنسپل اورینٹل کالج ہیں ۔

اپنے کالج کے طالب علموں سے جناب سید صاحب کی شفقت و محبت کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ۔ اس درس گاہ کی زندگی کے چند ہی دن اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ یہاں ہمیں کسی وسیلے کے بغیر بھی ہر وہ سہولت مل سکتی ہے جس کے ہم مستحق ہیں ۔ میں پہلے پہل جب اس کالج میں داخلہ لینے کی غرض سے سید صاحب محترم کی خدمت میں حاضر ہوا تو دل میں سینکڑوں وسوسے تھے ۔ سید صاحب کی خدمت میں فارم پیش کیا ۔ انہوں نے حسب عادت مسکرا کر فرمایا "تشریف رکھیے" اور فارم کو الٹتے پلٹتے ہوئے دریافت کیا ۔ "کبھی اردو پڑھی ہے ؟" عرض کیا "جی ہاں" "شاعری کرتے ہیں ؟" "جناب شاعری سے لگاؤ تو بہت ہے البتہ شعر کہتا نہیں ہوں ۔" میں نے جواب میں کہا ۔ سید صاحب نے دستخط فرمائے اور فارم میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے "اچھا فیس داخل کر دیجیے" ——— یہ تھا وہ انٹرویو جس کی خاطر میں کئی دن پہلے سے فکر مند تھا اور یہ تھی وہ شفقت جس کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اورینٹل کالج میں تو داخلہ مل ہی جاتا ہے ۔

سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر شاید ہی کوئی طالب علم کبھی مایوس لوٹا ہو ۔ وہ صحیح معنوں میں طالب علموں کے نبض شناس ہیں ۔ وہ ان کے دکھ کو پہچانتے اور ان کی دشواریوں کا پورا پورا علم رکھتے ہیں ۔ یہی درد شناسی تھی جس کے تحت ایک مرتبہ کلاس میں طالب علموں کو ذوق و شوق اور محنت سے پڑھنے کی تلقین کرتے ہوئے سید صاحب نے فرمایا تھا "میں جانتا ہوں کہ ان رنگ برنگ سوٹوں ، ٹیڈی لباسوں میں ملبوس طلباء اور طالبات میں سے کتنے ایسے ہیں جو تعلیمی مصارف برداشت کر سکتے ہیں !" اور کلاس میں بیٹھے ہوئے میرے جیسے بہت سے طلباء اور طالبات کی گردنیں نہ معلوم کیوں خود بخود جھک گئی تھیں ۔

اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے سید صاحب بے حد نرم گفتار ، نرم طبیعت اور بہت ہی نازک دل واقع ہوئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی اپنے طالب علموں کی چھوٹی سے چھوٹی بے جا حرکت پر ، جو ان کی طبیعت کے خلاف ہو ، خفا بھی ہو جاتے ہیں لیکن ان کی خفگی میں قہر اور غضب کی بجلیاں پوشیدہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ بھی ایک انداز محبوبی لیے ہوتی ہے ۔ اور سید صاحب زبان حال سے فرما رہے ہوتے ہیں کہ روٹھ تو ہم گئے ہیں

لیکن اگر ہمیں منانے میں جلدی نہ کی گئی تو ہمیں خوف ہے کہ اپنی شفقت و محبت کے ہاتھوں بے بس و مجبور ہو کر کہیں ہم خود ہی نہ من جائیں ۔ غالباً ہمدردی اور محبت کا یہی جذبہ ہے جس کے تحت سید صاحب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ کالج کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہو جانے کے باوجود بھی موجودہ تعلیمی سال کے آخر تک درس دینے کے لیے کالج آتے رہیں گے ۔[1]

آج کی دنیا میں یہ بات کتنی انوکھی ہے کہ اورینٹل کالج کے فارغ التحصیل طلباء بھی سید صاحب کی کالج سے رخصتی کو اس شدت سے محسوس کر رہے ہیں جس طرح کہ سال رواں کے طلباء ۔ سید صاحب برسوں تک ملک و قوم کی گراں بہا خدمت انجام دینے کے بعد صدہا نیک نامیاں اور لاکھوں دعائیں اپنے دامن میں بھرے ہوئے کالج سے فارغ ہو رہے ہیں ۔ یہ لمحہ باعث ہزار مسرت ہے لیکن پھر بھی خوشی محسوس نہیں ہوئی ۔ کیا اورینٹل کالج اور ڈاکٹر سید عبد اللہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ؟ —— کیا یہ کبھی جدا نہیں ہو سکتے ؟ —— یا انہیں الگ نہیں ہونا چاہیے ؟ —— شاید ایسی ہی کوئی بات ہے جبھی تو اورینٹل کالج کے بام و در نے اپنی باہیں پھیلا رکھی ہیں جیسے کہہ رہے ہوں ——

" یہ تیرے نغموں کی کڑیاں ٹوٹ کر رہ جائیں گی
ذرہ ذرہ کروٹیں بدلے گا تیری یاد میں "

۱۔ بعد میں بعض مصالح کی بنا پر یونیورسٹی نے سید صاحب کو درس دینے کی اجازت نہ دی اور یوں طالب علم ایک عظیم استاد کے فیض سے محروم کر دیے گئے ۔

فروری ۱۹۶۵ع میں سید صاحب کے طویل رخصت پر جانے کے موقع پر ایک الوداعی تقریب میں پڑھا گیا ۔

منور ابن صادق

وسیع النظر نقاد ، قومی ہیرو ، عظیم انسان ، استاذالاساتذہ

ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ایک مدرس اور منتظم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی کی چالیس سالہ سرگرم خدمت کے بعد چند ماہ "ریٹائرمنٹ کی تیاری کی رخصت" گزار کر ۳۰ ستمبر ۱۹۶۶ع کو یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

یوں تو سید صاحب کو یونیورسٹی کی بعض عملی کارروائیوں کے مطابق اسی وقت سے سبکدوش متصور کر لیا گیا تھا جب وہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر اپنی محبوب درس گاہ سے یک دم کنارہ کش ہو کر طویل رخصت پر چلے آئے تھے لیکن سید صاحب کے معتقدین اور ان کی خدمات کے معترفین کے لیے ۳۰ ستمبر ایک لمحۂ فکریہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ اسی دن یونیورسٹی سے سید صاحب کی باضابطہ علیحدگی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی دن تاریخی سرمائے کا حصہ بنے گا کہ یہ ایک مثالی استاد اور استاد گر شخصیت کی زندگی کے اہم موڑ کی نشان دہی کرتا ہے۔

سید صاحب کے فیض یافتگان کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ خود اورینٹل کالج کے موجودہ مدرسین میں سے اکثر سید صاحب کے پرانے شاگرد ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان کے اکثر کالجوں میں السنۂ شرقیہ کے استاد سید صاحب کے شاگرد یا ان کے شاگردوں کے شاگرد ہیں اور ان کے علاوہ بھی علمی و ادبی حلقوں سے متعلق اکثر اہل عقل و دانش سید صاحب کے حلقۂ ارادتمندان میں شامل ہیں!

مجھے اردو کالج لاہور کے توسط سے سید صاحب سے شرف تلمذ حاصل کرنے کا موقع تو نصیب ہو گیا لیکن ایک تو وقت کی کمی اور اس کے ساتھ خود اپنی طبیعت جو کچھ زیادہ اثر پذیر واقع نہیں ہوئی لہٰذا مجھے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ میں اس سرچشمۂ فیض سے کماحقہ سیراب ہو سکا ہوں اور طبعاً انگلی کو لہو لگا کر شہیدوں میں نام لکھوانے کو بھی پسند نہیں کرتا لہٰذا سید صاحب سے ہر چند نیازمندی کے باوجود میں یہ دعویٰ کرنا مناسب

نہیں سمجھتا کہ میں بھی حلقۂ ارادتمندان سید میں شامل ہوں ! —— ہاں مگر اتنا ضرور ہے کہ مجھے " حلقۂ ارادتمندان سید " کے طواف کا موقع ضرور ملتا رہا ہے - ذیل میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اسی دوران میں " تانک جھانک " کا ماحصل ہے - ع

زبیرون خانہ رفتم ز درون خانہ گفتم

سید صاحب کی شخصیت میں درس و تدریس کا پہلو بہت نمایاں ہے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوا ہے - سید صاحب کو درس و تدریس سے دلی شغف تھا ' اس حد تک کہ شدید بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں داخل رہنے کے بعد جب فارغ ہوئے تو سیدھے کالج پہنچے - ان کے شاگرد بھی ان کا لیکچر سننے کے لیے بے تاب ہوے تھے - اب یہی فضا اردو کالج میں نظر آتی ہے - سید صاحب کے لیکچر کا ایک مخصوص انداز ہے جس میں ان کے کردار کا نمایاں وصف " دھیاپن ' صاف جھلکتا ہے - اس سے نہ صرف سبق ذہن نشین ہو جاتا ہے بلکہ لیکچر کے اکثر حصے زبانی بھی یاد ہو جاتے ہیں - علمی قابلیت و صلاحیت اور ان کے ساتھ ساتھ ایک شفیق استاد کا دل شاگردوں کے دل پر محبت و عقیدت کا گہرا نقش چھوڑتے ہیں -

"آہستہ خرامی یا دھیاپن" سید صاحب کے کردار کا نمایاں وصف ہے - " آہستہ خرام و بخرام" ان کا اصول ہے جس پر وہ ہمیشہ عمل پیرا ہوتے ہیں - اس سے ان کی زندگی میں مسلسل حرکت و استقامت اور پر وقار سرگرمی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے اور اس پر مستزاد وہ شگفتہ مزاجی ہے جسے وہ کسی حال میں ختم نہیں ہونے دیتے - بر محل لطیفے ان کے درسی لیکچروں میں بھی ایک خوشگوار عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں -

سید صاحب ایک قومی کارکن کی حیثیت سے بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں - انہوں نے اپنی غیر معمولی تنظیمی قابلیت سے کارکنوں کی ایک بڑی تعداد کو مغربی پاکستان کے کونے کونے میں پھیلا دیا ہے - اگرچہ اس سلسلے میں رسمی جماعت بندی کا اہتمام نہیں کیا گیا لیکن یہ رضا کار سید صاحب کی آواز پر جمع ہونے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور پھر سید صاحب نے اپنے عمل سے اپنے معاونوں اور عقیدت مندوں کی ذہنی تنظیم کر دی ہے - انہوں نے قومی کارکن کی حیثیت سے واضح نصب العین متعین کر رکھا ہے اور وہ ہے صحیح قومیت کی تشکیل' یہی ان کی سرگرمیوں کا محور ہے خواہ وہ انجمن ترقی اردو کی صورت میں ہوں یا انجمن فروغ عربی و فارسی کی شکل میں'

تعلیمی میدان میں ہوں یا ادبی میدان میں ۔

سید صاحب کو دور سے جاننے والے انہیں فقط اردو کا ہیرو سمجھتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ملک گیر "اردو تحریک" کے سربراہ ہیں لیکن ان کی جامع الحیثیات شخصیت اس سے کہیں زیادہ وسعت رکھتی ہے ۔ اسلام کے بعد اردو کو ہمارے نظریۂ قومیت میں بنیادی حیثیت حاصل ہے لہٰذا سید صاحب اردو کی ترقی کے ذریعے قومی تعمیر نو کا کام کر رہے ہیں اور اردو کو اپنے قومی نظریات و تصورات کی تبلیغ و اشاعت کا موزوں ترین ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ اس کے علاوہ اسلامی تہذیب و ثقافت اور اتحاد عالم اسلام کے بارے میں سید صاحب بڑے واضح تصورات رکھتے ہیں اور یوں تو ان کی اکثر تحریروں میں اسلامی روح جھلکتی ہے لیکن ان کے بعض مضامین و خطبات کا موضوع ہی اسلامی نظام و ثقافت ' علوم شرقیہ یا علوم اسلامیہ ہے ۔

تعلیم و تعلم کے میدان میں سید صاحب ایک مدرس کے طور پر مثالی حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک باخبر ماہر تعلیم بھی ہیں ۔ ان کے تعلیمی خطبات اصول تعلیم اور نظام تعلیم کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں ۔ انہوں نے پاکستانی نظام تعلیم کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور اس کی اصلاح کے لیے عملی تجاویز بھی پیش کی ہیں ' فلسفۂ تعلیم کی اہمیت پر زور دیا ہے اور پاکستان کے لیے مقاصد تعلیم کی نشان دہی کی ہے ۔ یہاں بھی جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ نظریۂ قومیت میں ان کا غیر متزلزل ایمان ہے ۔

ایک ادیب' محقق اور نقاد کے طور پر سید صاحب کی حیثیت مسلم ہے اور ان کی تصنیفات اعلیٰ مقام رکھتی ہیں ۔ ایک نقاد کی حیثیت سے سید صاحب وسعت نظر اور عظمت فکر کے ساتھ ساتھ میانہ روی اور وضعداری کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں اور اس کے باوجود جانب داری سے پہلو بچائے رہتے ہیں ۔

ان سب حیثیتوں سے بڑھ کر سید صاحب ایک ہمدرد انسان بھی ہیں ۔ وہ عالمگیر انسانی اقدار کے مبلغ اور علمبردار اور عملی نیکی کو بہت اہمیت دیتے ہیں خواہ وہ نیکی بظاہر کم درجہ ہی معلوم ہو ۔ وہ انسانی ہمدردی کو عملی نیکی کی بنیاد قرار دیتے ہیں ۔ وہ ہلکی مسکراہٹ سے دل کے زخموں کا مرہم مہیا کرنے کے قائل ہیں اور یہ بات صرف نظریات تک محدود نہیں بلکہ سید صاحب اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں —— دھیما پن ' میانہ روی 'ور وضعداری اس عظیم انسان کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ جیسی منفرد شخصیت کا یہ خاکہ کسی طرح بھی مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ بر سبیل تذکرہ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اصل ذکر تو سید صاحب کی ریٹائرمنٹ کا تھا جو بذات خود ایک تاریخی واقعہ ہے!

سید صاحب کی ریٹائرمنٹ کے ساتھ چند سوالات بھی سامنے آتے ہیں۔ ۳۰ ستمبر کو ریٹائر ہوئے لیکن وہ کئی ماہ پہلے ہی سبکدوش ہو چکے تھے - روایتاً ان کی طویل رخصت کو "ریٹائرمنٹ کے لیے تیاری کی رخصت" کا نام دیا گیا ہے اور یہ طریقہ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے سید صاحب کو یہ طریقۂ تیاری قبول کرنے کے لیے کس طرح تیار کیا، یہ ابھی تک ایک سربستہ راز ہے—— یونیورسٹی کے ریکارڈ میں غالباً اس کے متعلق کوئی معلومات نہ ہوں گی لیکن سید صاحب جیسے ذوق تدریس رکھنے والے عظیم استاد کے متعلق یہ باور کرنا ذرا مشکل ہے کہ وہ تدریسی زندگی سے علیحدگی کے لیے اتنی طویل تیاری کو ضروری سمجھ سکتے ہیں جب کہ عملاً وہ تدریسی زندگی سے قطعی علیحدگی کا کوئی ارادہ بھی نہیں رکھتے۔

اس صورت حال میں عوامی سطح پر قیاس آرائی فطری سی چیز ہے۔ اس سلسلے میں بعض اوقات یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے ارباب اختیار نے اپنی روایتی حکمت عملی کے تحت "بانٹ کر کھانے کا اصول" نافذ کیا ہو یعنی سید صاحب ایک عرصہ تک اورینٹل کالج کے پرنسپل رہ چکے اب کسی اور کو موقع ملنا چاہیے۔ ایسے حالات میں اگر کوئی شخص دوسروں کے لیے جگہ خالی کرنے کے لیے برضا و رغبت تیار نہ ہو تو اسے تیار کیا جاتا ہے اور یہاں تو ویسے بھی ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ تھا کہ بیک وقت دونوں حضرات پرنسپل رہے۔ ایک پرنسپل (رخصتی) اور دوسرا قائمقام پرنسپل —— اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس عبوری دور میں قائمقام پرنسپل کو پورے پرنسپل کی حیثیت سے ذمے داری سنبھالنے کے لیے تیار کرنا مقصود ہو لیکن اس صورت میں اصولاً ایسی تیاری پہلے ہونی چاہیے اور خود جانے والا شخص اس قسم کی تربیت دینے کا زیادہ اہل ہو سکتا ہے!

مختصر یہ کہ چند مہینے کی رخصت کے دوران سید صاحب "ریٹائرمنٹ" کے لیے باقاعدہ طور پر تیار ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، یہ سوالیہ نشان بہرحال موجود رہے گا کہ یونیورسٹی سید صاحب کی سبکدوشی سے پیدا ہونے

والے خلا کو برداشت کرنے کے لیے قبل از وقت کیسے تیار ہو گئی ؟ ——
یہ امر بہر حال مشکوک ہے کہ یونیورسٹی' او ینٹل کالج کے لیے سید صاحب
کا نعم البدل تو کیا صحیح بدل بھی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔
پھر آخر اس میں کیا حکمت تھی کہ یونیورسٹی میں اساتذہ کے فقدان کی عام
شکایت کے باوجود عمداً ایک عظیم استاد کی خدمات سے قبل از وقت بے اعتنائی
برت لی گئی ؟

کیا ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ اس میں بھی کوئی مصلحت تھی ؟

کوہستان ۲ اکتوبر ۱۹۶۶ع -

مسرور کیفی

برگد اداس رہے گا

گزشتہ برس مارچ کے مہینہ میں اورینٹل کالج کے در و دیوار "عزیزان من" کی جس شفیق آواز سے محروم کیے گئے تھے۔ اب وہ اس سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔ اب کالج کی سیڑھیوں میں چڑھتے چڑھتے کوئی قلم اجنبی لوگوں کے امتحانات کے فارموں پر دستخط نہیں کرے گا اور کالج کی گیلریوں میں "مصروف کار" مخلوط ھجوم کسی آھٹ پر نہیں چونکے گا۔ کیونکہ ایک اور سقراط نے مصلحتوں کے امرت کی بجائے سبکدوشی کا زہر مسکراتے ہوئے پی لیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ جو مارچ ۱۹۶۵ع میں قبل از ریٹائرمنٹ طویل رخصت پر چلے گئے تھے ۳۰ ستمبر ۱۹۶۶ع کو ریٹائر ھوگئے ھیں۔

اورینٹل کالج کے خاموش در و دیوار آج بھی اپنے اس رفیق کے منتظر نظر آ رہے ھیں جو ڈیڑھ برس قبل اچانک ان سے رخصت ھوگیا تھا۔ برگد کی شادابی میں بڑھاپے کی جھلک نظر آنے لگی ہے اور اس کی شاخوں اور پتوں میں بے ثباتی کے آثار دکھائی دینے لگے ھیں۔ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے وقت کے جامد خلاؤں میں سہما سہما کسی مانوس سی آھٹ کا منتظر ہے۔ اسے انتظار ہے کہ اب بھی شاید کسی دن وہ کار اس کے سائے میں آ کر پھر رکے جس میں سے باھر آنے والی شخصیت دفتر کی طرف بڑھنے سے پہلے اسے دیکھا کرتی تھی اور جس کی دوستی کا پودا بھی اب چالیس سالہ تناور درخت بن چکا ہے۔ یہ دوستی جو اس کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی ہے اور کڑی سے کڑی آزمائش میں پوری اترتی رہی ہے۔ آج وقت کا سیل رواں اسے بہائے لیے جاتا ہے۔

برگد سے تو ڈاکٹر صاحب کی دوستی نصف صدی پر محیط ہے لیکن وہ چھوٹے چھوٹے چلتے پھرتے برگد بھی جنہیں صرف دو سال کے لیے اس علم و فیض کے سرچشمہ سے اپنی پیاس بجھانے کا موقع ملا ' وہ بھی ھمیشہ کے لیے اسی کے ھو رہے یہ ھزاروں برگد بھی آج بوڑھے برگد کی اداسی میں شامل ھیں۔ اور محسوس کرتے ھیں کہ یہ اداسی ان کے رگ و پے میں اتر رھی ہے۔ کیونکہ اب اس برگد کے نیچے ان تمام برگدوں کا اجتماع شاید کبھی نہ ھو سکے۔ اب انہیں بھی اس سرچشمہ علم و فن کی طرح اس عظیم برگد کو خیر باد کہنا ھوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے چالیس سال تک یونیورسٹی کی خدمت کی اور اس طویل عرصۂ ملازمت کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے پنجاب یونیورسٹی میں جو گرانقدر خدمات سر انجام دی ہیں، وہ یقیناً اس یونیورسٹی کی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں اور ہر کس و ناکس ان کا معترف ہے۔

میرے ذہن پر ان کی شخصیت کا جو نقش اولین اجاگر ہوا، وہ بطور استاد ان کی لازوال عظمت کا ہے۔ مجھے طالب العلمی میں جن اساتذہ سے بھی اکتساب علم کا شرف حاصل ہوا، ان میں سے پورے احترام کے باوجود ایک نام سب سے زیادہ روشن ہے اور وہ ہے استاذالاساتذہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ استاذ گرامی کو بھی اردو زبان کے بعد اگر کسی سے محبت ہے تو وہ بلا مبالغہ ان کے شاگرد ہیں۔ مجھے اورینٹل کالج میں استاذ گرامی کے زیر سایہ اپنے چار سالہ طالب علمی کے دوران میں اس کی متعدد مثالیں دیکھنے کو ملیں اور میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یونیورسٹی سے ان کی قبل از وقت ریٹائرمنٹ میں ان کے بعض کرم فرماؤں کے بعد دوسری وجہ ان کے بعض شاگردوں کا تحفظ بھی شامل رہا۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کی ساری عمر ہی ان برگدوں کے تحفظ میں صرف ہوئی ہے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب ایک صبح یونیورسٹی کے بھیجے ہوئے چند کارندے اپنے کندھوں پر آرے کلہاڑے رکھے مادر علمی میں آ وارد ہوئے۔ وہ بوڑھے برگد کو گرا دینا چاہتے تھے کیونکہ اس کی وجہ سے یونیورسٹی کو اورینٹل کالج کا حسن دبتا دکھائی دیتا تھا لیکن ابھی اس برگد کا دوست اورینٹل کالج میں موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو جونہی اس کی اطلاع ہوئی تو وہ اپنے دوست کے تحفظ کے لیے آ کھڑے ہوئے اور انہوں نے یونیورسٹی کے کارندوں کو صاف صاف کہہ دیا کہ ان کے ہوتے ہوئے اس پیڑ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ یہی محبت ڈاکٹر صاحب کو چھوٹے برگدوں سے بھی تھی، جب بھی انہوں نے یونیورسٹی کے کسی کارندے کو کندھے پر آرہ کلہاڑا رکھے کسی برگد کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ اس کی راہ میں آ کھڑے ہوئے اور اسے بتا دیا کہ اس برگد پر کوئی ظلم توڑنے سے پہلے تمہیں اس نگہبان سے دوچار ہونا ہوگا، جس نے جگر کا خون دے دے کر اس برگد کو پالا ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ڈاکٹر صاحب اس شفقت اور محبت پر ضابطوں اور قواعد کو قربان کر دیتے تھے۔ وہ جس طرح اپنے شاگردوں سے

محبت میں ہر کڑی آزمائش پر پورے اترتے رہے اسی طرح ان کو بطور پرنسپل کالج کے قواعد و ضوابط کا مکمل احترام بھی عزیز تھا ۔ اس کا ایک واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا ۔

کالج کے انتخابات میں میرا ایک ہم جماعت اور عزیز دوست ایک عہدہ کا امیدوار تھا اور انتخابات میں صرف ایک دن باقی تھا انتخابی مہم عروج پر تھی ۔ اس لیے میں کالج کے برآمدے میں کھڑا اپنے دوست کے لیے ووٹ حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھا کہ ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے ۔ انہیں دیکھتے ہی سب طالب علم ادھر ادھر ہوگئے تاہم میں انتخابی مہم کی مصروفیات کو خود پر طاری کیے کھڑا رہا ۔ ڈاکٹر صاحب میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے وہاں کھڑے رہنے کا سبب دریافت فرمایا میں نے مختصراً بیان کیا ۔ تو انہوں نے مزید دریافت کیا کہ میں کلاس میں کیوں نہیں گیا ۔ جس کا جواب میرے پاس انتخابی مہم تھا سو میں نے کمال اطمینان سے بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ اس مصروفیت کی وجہ سے میں آج کلاس میں نہیں جاسکتا ۔ ڈاکٹر صاحب نے جب یہ سنا تو انہیں بہت ناگوار گذرا ۔ فرمانے لگے میرے نزدیک طالب علم کے لیے سب سے زیادہ اہم کام اس کی کلاس ہے اور اگر آپ انتخابات کو اس سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں ' تو میں ابھی انتخابات ختم کیے دیتا ہوں ۔ اس کے بعد مجھے کبھی کلاس پر کسی اور کام کو اہمیت دینے کی ہمت نہ ہو سکی ۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی معجزہ بیان شخصیت سے تدریس کو فن کی جن بلندیوں سے روشناس کرایا ہے ۔ اس سے ان کی کلاس میں بیٹھ کر ہی لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے ان کے الفاظ "عزیزان من" کی شیرینی آج بھی ان کے ہزاروں شاگردوں کے لیے سب سے بڑی مسرت ہے ' آپ تنقید ایسے خشک موضوعات کو بھی اپنے دل نشین انداز میں ایسا شگفتہ بنانے کی قدرت رکھتے ہیں کہ عام طالب علم بھی محسوس کرنے لگتا ہے گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ۔ مجھے ان کی اس شگفتہ بیانی کو احاطہ تحریر میں نہ لا سکنے کا اعتراف ہے ۔ اگر الفاظ کے آئینے صیقل کرنے کے فن پر مجھے کچھ قدرت حاصل ہوتی تو شاید میں اس کی ایک آدھ کرن منعکس کر لیتا ۔

ڈاکٹر صاحب کے لیکچر کے دوران میں جب کسی کا قلم ذرا سست ہونے لگتا یا بقول استاذ محترم قلم کی روشنائی خشک ہونے لگتی ۔ تو ڈاکٹر صاحب اپنے لیکچر کو اسی مرحلہ پر روک دیتے اور کسی دلچسپ گریز

سے تازہ بہ تازہ نو بہ نو لطائف سناتے جس سے طالب علم پھر سے تازہ دم ہو جاتے اور قلموں کی خشک ہوتی ہوئی روشنائی میں پھر سے روانی آجاتی ۔ لیکن جب لیکچر دوبارہ شروع ہوتا ۔ تو ڈاکٹر صاحب عین اسی نکتہ سے آغاز کرتے جس نکتہ پر وہ "عزیزان من" کو تازہ دم کرنے کے لیے رکے تھے ۔ میرے لیے یہ امر خاصی دلچسپی اور حیرت کا باعث بنا رہا ۔ اور میں نے خصوصاً کوشش بھی کی کہ کسی دن ان کے درس میں کسی لطیفہ کے بعد کوئی ایسا واقعہ نوٹ کروں جب استاذ محترم نے ربط میں کوئی کمی واقع ہونے دی ہو ۔ لیکن میرے ساتھ ساتھ ان کے اور ہزاروں شاگردوں بھی شاید اس کی کوئی مثال نہ دے سکیں ۔

ڈاکٹر صاحب کے لطائف میں تازگی اور شگفتگی کے علاوہ یہ امر بھی خاصا حیران کن تھا کہ انہوں نے کلاس میں کوئی لطیفہ دوبارہ نہیں سنایا میرے نزدیک فرداً فرداً ہر جماعت میں اس کا التزام رکھنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور ہے ۔

استاذ محترم کی تدریس کے میدان میں اس معجز بیانی اور طالب علموں کی فریفتگی کا دوسرے اساتذہ کو بھی علم تھا ۔ اور بعض محترم اساتذہ نے اس تقلید کی کوشش بھی کی لیکن انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ یہ ان کے بس کی بات نہیں کیونکہ انہوں نے جب کسی لیکچر کے دوران میں لطیفہ سنایا لیکچر کا دوبارہ اسی مرحلہ پر واپس آنا تو کجا اکثر یہ لیکچر ہی موضوع سے بھٹک گیا ۔ کیونکہ "میر کا شیوۂ گفتار" ان کے بس میں نہیں تھا ۔

روزنامہ مغربی پاکستان ' یکم اکتوبر ۱۹۶۶ع ۔

سید عبدالباقی
گورنمنٹ کالج، کیمبل پور

تجدید وفا

چمن کو موسم گل کا پیام آیا ہے
جنوں کو وحشت دل کا سلام آیا ہے

چھلک رہا ہے مئے آرزو سے جام حیات
پیو کہ دار و رسن کا مقام آیا ہے

کشید آتش غم ہے یہاں شراب وفا
بڑھاؤ ہاتھ کہ گردش میں جام آیا ہے

بنام ساقیٔ کوثر بنام سوز دروں
ادھر بھی دیکھ کوئی تشنہ کام آیا ہے

زمانہ سخت کم آزار ہے، بجان اسد
کوئی کسی کے لیے یوں بھی کام آیا ہے

ہے مرد حر، ید باطل شکن زباں کا دھنی
وہ جس کے نام میں اللہ کا نام آیا ہے

بتاؤ بادہ کشو کیا ہے عزم ساقی آج
قسم میں کیا کہیں باقی کا نام آیا ہے

پروفیسر محمد انوارالحسن انوار
اسلامیہ کالج، لائل پور

ہدیۂ عقیدت

(بخدمت ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب)

خدمت اردو وقف ہوئی جب سید عبداللہ کے لیے
قدرت نے انہیں پھر ہمت دی، ہمت کے لیے اوصاف دیے

سینے میں دل بے باک جو تھا خدمت کے لیے بے تاب ہوا
تحریروں، تقریروں سے اردو کے لیے کچھ کام کیے

جب بزم السنۂ شرقیہ پر تاریکی سی چھائی تھی
تب سید نے محفل میں آ کر روشن کر ڈالے تھے دیے

ایک علیگڑھ میں سید تھا اک سید لاہور میں ہے
اس نے علم کے باغ لگائے اس نے چمن سیراب کیے

ہے دل سے مرے انوار دعا اس پیکر علم و ہنر کے لیے
تابندہ رہے یہ دنیا میں اردو کی خاطر خوب جیے

ڈاکٹر اکرم شاہ
استاذ شعبہ فارسی اوریئنٹل کالج ، لاہور

شور آرزو

تقدیم باستاد ارجمند

آقای دکتر سید عبدالله رئیس دانشکده خاوری لاهور

خواجگی در جهان نمی خواهم — بنده را بیزبان نمی خواهم
خواه آتش زنم بجامه‌ی خویش — ظلمت اندر جهان نمی خواهم
اشک مفلس نمی توانم دید — در بتاج شهان نمی خواهم
بنده احساس نیز هم دارد — خواجه را حکمران نمی خواهم
ای بسا بام و در نمی دارند — قصر جنت نشان نمی خواهم
هیچ دستی که زندگی دارد — زیر سنگ گران نمی خواهم
هیچ مردی که دارد احساسی — بنده ی دیگران نمی خواهم
نوک تیغ و سر سنان اولی — فرق بر آستان نمی خواهم
زندگی نام کشمکش کردند — من ز دنیا کران نمی خواهم
گردد از وا نه بهر حق گویی — آن لب و آن زبان نمی خواهم
حسرت خویش را کنم اعلان — هرچه خواهم نهان نمی خواهم
جور آدم ز میر و سلطان است — طعنه بر آسمان نمی خواهم
بنی آدم ز خون یکد گرانند — فرق ها درمیان نمی خواهم
بهر عیش شب چهار و پنج — روز ده صد گران نمی خواهم
یکی آقا و دیگری بنده — آدمی را چنان نمی خواهم
گشته ام دلفگار ازین ترتیب — غم خود را بیان نمی خواهم
چشم باید که لخت دل بارد — دیده ی خونفشان نمی خواهم

چاره ی درد دل همی جویم — تیغ و تیر و سنان نمی خواهم
تا نه یکسر شود جهان تاریک — آه خود را دخان نمی خواهم
عندلیبم ز گلشن اسلام — جز بدین آشیان نمی خواهم
هرچه در دین حق حرام آمد — من نخواهم من آن نمی خواهم
دیده ای را پر اشک نپسندم — هیچ لب در فغان نمی خواهم
یک در و بام آرزوی فقیر — دلی و اصفهان نمی خواهم
زندگی را بسا لوازم هست — من فقط آب و نان نمی خواهم
بنده را آمده شعور خودی — خواجه را درگمان نمی خواهم

تا نه برهم شود جهان اکرام
آرزو را جوان نمی خواهم

ریاض مجید
گورنمنٹ کالج، لائل پور

خدا کرے کہ مری عمر بھی تجھے لگ جائے

(استاد محترم سید عبداللہ کی نذر)

میں تیرے سامنے آ تو گیا ہوں کچھ کہنے
زباں لرزتی ہے اور ہونٹ کپکپاتے ہیں

مثال ابر گہر بار تیری شخصیت
تری حیات گلستان دانش و فرہنگ
خلوص فن کی نمایندہ تیری تحریریں
کہ جن کو پڑھ کے حصول ادب کی جاگی امنگ

کھلی ترے سخن پر اثر سے دل کی کلی
جو تیری بزم میں آیا وہ کامیاب ہوا
تری نگاہ نے ذہنوں کو روشنی بخشی
یہاں پہ ذرہ بھی آیا تو آفتاب ہوا

مجھ ایسا شخص تو فرخندہ بخت ہے جس نے
تجھ ایسے صاحب کامل سے آگہی پائی
لیا تقدس و پاکیزگیٔ فن کا سبق
خلوص و مہر و محبت کی روشنی پائی

تری جبیں پہ جمی گرد ماہ و سال تو کیا
کبھی گہن نہ لگے گا ترے عزائم کو
کسی نے شمس کے چہرے پہ جھریاں دیکھیں!
شعاعیں بھی کبھی بوڑھی ہوئی ہیں، سوچو تو!

سدا کھلا رہے تیری نوازشوں کا چمن
خدا کرے یہ تیرا فیض عام جاری رہے
رہے نگاہ میں عہد حیات کا مقصد
دلوں میں پڑھنے پڑھانے کی لہر ساری رہے

خدا کرے کہ مری عمر بھی تجھے لگ جائے
تری بقا میں میں اپنی بقا کو ڈھونڈتا ہوں

راجه رشید محمود

استاد عالی مرتبت

دیں کی فوقیت پہ ہر حالت نظر رکھتے ہیں آپ
ساتھ ہی، دیکھا تو دنیا کی خبر رکھتے ہیں آپ

حق پرستی اور حق گوئی ہے مسلک آپ کا
اور فضل حق سے چشم حق نگر رکھتے ہیں آپ

نوجواں طبقے کے آگے با خلوص و التزام
مغربی تہذیب کے برگ و ثمر رکھتے ہیں آپ

جو قدم اٹھ جائے، ناممکن ہے اس کو روکنا
جو قدم رکھتے ہیں، کافی سوچ کر رکھتے ہیں

ملک میں اقدار اسلامی کے احیاء کے لیے
دیں کو ہر اک مرحلے میں معتبر رکھتے ہیں آپ

طالب العلم آپ کی شفقت کے گن گاتے رہے
ان سے ہمدردی کا جذبہ بیش تر رکھتے ہیں آپ

ملک میں قومی زباں کو اس کا جائز حق ملے
بات یہ ہر وقت ہی مدنظر رکھتے ہیں آپ

قوم کے محسن، مرے استاد عالی مرتبت
غم پسند انسان ہیں، دامان تر رکھتے ہیں آپ

شہر اخلاص و مروت کے ہوئے ہیں شہریار
خار زار انس و الفت میں گزر رکھتے ہیں آپ

وادیٔ تحقیق میں ہیں آبلہ پا اور بھی
دیدہ ریزی میں مگر شان دگر رکھتے ہیں آپ

انحطاط جرأت و فقدان ہمت کا ہے دور
اس میں بھی حق بات کہنے کا جگر رکھتے ہیں آپ

دل میں رکھتے ہیں توکل اور استغنا کی شان
درد مندی کے نگاہوں میں گہر رکھتے ہیں آپ

قوم تہذیبی روایت کو نہ اپنی بھول جائے
یہ تمنا دل میں، قصہ مختصر، رکھتے ہیں آپ

کیوں کرے محمود مدح صاحبان اقتدار
اس کو کافی ہے، عنایت کی نظر رکھتے ہیں آپ

سائل نقوی

نظم

جو گرامی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ ایم اے ۔ ڈی لٹ پرنسپل اورینٹل کالج لاہور و معتمد عمومی انجمن ترقی اُردو پاکستان کی ساٹھ سالہ سالگرہ کے جلسہ منعقدہ ۵ اپریل ۱۹۶۶ء میں پڑھی گئی

اگر سچ ہے کہ علم و فضل ہے اک منصب والا
تو ہے ان میں سید عبداللہ کا رتبہ بہت اعلیٰ
جو تعلیم کتاب و حکمت اک کار نبوت ہے
تو ثابت حسب فرمان الٰہی ان کی عظمت ہے
اگر ایثار اور صدق و صفا ہیں شان انسانی
نہیں ممکن کہ ان کا مثل مل جائے بہ آسانی
نہ کوئی شاعری ہے اور نہ از روئے عقیدت ہے
جو کچھ میں نے کہا یہ در حقیقت اک حقیقت ہے
وقار قوم میں سرگرمی بے حد جو دیکھی تھی
نذیر احمد نے یہ سر سید احمد کو دعا دی تھی
''بچایا ڈوبنے سے کشتیٔ دین محمد کو''
''الٰہی ! نوح کی سی عمر دے سر سید احمد کو''
''مگر میں پورے ساڑھے نو سو شمسی سال گن لوں گا''
''کہ کوئی نیچری کچھ کم نہ کر دے وقت مُد کو''
یہی میری دعا ہے سید عبداللہ کی خاطر
خدائے جز و کل سے جو کہ ہے ہر بات پر قادر
کہ یا اللہ ! ان کی عمر میں بھی یوں ہی برکت دے
حوادث پر ہمیشہ آئے جو غالب وہ ہمت دے

مٹانے اک نشان قوم جب طوفان اٹھا تھا
انھی نے تب کیا تھا کام نوح و سید احمد کا

تباهی سے بچایا مشرقی کالج کی کشتی کو
رکھا دور اس سے ہر اک کوشش باطل کی زشتی کو

وهی کالج کبھی تھا جو مریض ناتواں صورت
مسیحائی سے ان کی هو گئی کامل اسے صحت

لیا جب چارج تو کل ڈیڑھ سو طلاب داخل تھے
ترقی اس طرح سے دی کہ یہ زیادہ تھے نو سو سے

سکھایا احترام عز ملت نوجوانوں کو
منور کر دیا اقدار قومی کے مکانوں کو

مگر یہ سعئی کامل جب قریب مدعا پہونچی
تو ان پر خادمان قوم کی سنت ہوئی پوری

ملا ان کو بھی آخر یہ صلہ خدمات زریں کا
اسی کو ان سے چھینا خون سے جو باغ سینچا تھا

دلوں میں اور اونچا هو گیا لیکن مقام ان کا
کہ اب هر ایک تک پہونچے گا هر فیض تمام ان کا

صلائے عزم تجدید عمل سب کو سنائیں هم
دعا یہ هے بہت سی جوبلیاں ان کی منائیں هم

دعا هی سے مگر تسکین ان کی هو نہیں سکتی
کرم فرما نہ جب تک کام میں ان کے بنیں ساتھی

فزوں اپنے ادب سے اور هوں دلچسپیاں اپنی
بڑھائیں آگے اردو کو جو هے قومی زباں اپنی

هر اک علم و ادب کو اس زباں میں اس طرح لائیں
خزانے سر بسر اردو کے مالا مال هو جائیں

شبیر نیازی - ایبٹ آباد

محافظ اردو

"ایک زندہ حقیقت"

عالی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب مدظلہ العالی

تم وہ کہ، جن کا عزم ہے اک عزم آہنی!
تم وہ کہ، جن کے دم سے عبارت ہے زندگی
تم وہ کہ، تم کو پیکر علم و عمل کہوں!
تم وہ، جنھیں حیات کا میں ماحصل کہوں

علم و ادب کے باغ کی خوشبو تمھیں تو ہو
سچ تو یہ ہے محافظ اردو تمھیں تو ہو

جب بھی کبھی زوال پہ آیا مہ ادب
جب بھی کبھی زبان پہ نازل ہوا غضب
جب بھی کبھی ادیب ہوا نذر محتسب
تم بن گئے ہو پھر ادب زیست کا سبب

لا ریب بات سب پہ یہی آشکار ہے
اردو کو تم سے اور تمھیں اردو سے پیار ہے

وہ باد تند و تیز چلی، وہ لٹی بہار
گرنے کو آشیانے پہ بجلی ہے بے قرار
ارکان سلطنت پہ نہیں ہے کچھ اختیار
ممکن اگر ہو تجھ سے تو سید کو تو پکار

جب بھی ادب پہ گردش ایام آئے گی
اک ذات خاص ان کی بڑے کام آئے گی

فکر و نظر ہے فکر و نظر، ان کی ذات سے
اخلاص کا وجود ہے ان کی حیات سے
یہ بات آپ پوچھ لیں کل کائنات سے
ٹلتے نہیں ہیں کہہ کے کبھی اپنی بات سے
ماضی کا اک حسین سبق مل گیا ہمیں!
حق تو یہ ہے کہ دوسرا حق مل گیا ہمیں!

مرتبہ ممتاز منگلوری

تعارف

پیدائش : منگلور - تحصیل مانسہرہ - ضلع ہزارہ -
۵ اپریل ۱۹۰۶ع

ڈگریاں : (۱) ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی - لٹ) ۱۹۳۵ع
(۲) ایم - اے عربی
(۳) ایم - اے فارسی ۱۹۲۵ع
(۴) سرٹیفکیٹ جرمن
(۵) سرٹیفکیٹ لائبریرین شپ
(۶) منشی فاضل

پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت
(۱۹۲۵ع سے ۱۹۶۵ع)

(الف) سابقہ : (۱) پرنسپل یونیورسٹی اوریئنٹل کالج، لاہور
(۲) صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی و پروفیسر اردو
(۳) صدر شعبۂ عربی پنجاب یونیورسٹی
(۴) استاد ایم - اے فارسی
(۵) ایڈیٹر اوریئنٹل کالج ریسرچ میگزین
(۶) عارضی صدر شعبۂ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی
(۷) عارضی صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی
(۸) آنریری لائبریرین پنجاب یونیورسٹی (پانچ سال)
(۹) مدیر شعبۂ عربی، تاریخ ادبیات مسلمانان ہند و پاکستان پنجاب یونیورسٹی
(۱۰) کیٹالاگر، پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۱۹۲۵ع تا ۱۹۲۸ع
(۱۱) ریسرچ سکالر (فارسی) ۱۹۲۸ع—۱۹۳۲ع
(۱۲) عربک اسسٹنٹ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۳۲-۱۹۳۴ع

(ب) ناظم (اعزازی) شعبۂ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی (تا حال)
موجودہ : چیئرمین اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی

دوسرے اعزازی عہدے

(الف) پنجاب یونیورسٹی :

۱- رکن اورینٹل فیکلٹی ۱۹۳۹ع تا ۱۹۶۶ع
۲- رکن سنڈیکیٹ ۱۹۵۲ع، ۱۹۵۳ع، ۱۹۵۴ع
۱۹۶۳ع، ۱۹۶۴ع، ۱۹۶۵ع
۳- رکن سینٹ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۵۰ع سے ۱۹۶۰ع تک -
۴- رکن اکیڈمک کونسل پنجاب یونیورسٹی ۱۹۴۵ع تا ۱۹۶۶ع -
۵- رکن بورڈ آف گورنرز، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اردو، پنجاب یونیورسٹی -

(ب) یونیورسٹی سے باہر :

۱- رکن انٹر یونیورسٹی بورڈ ۶۵ - ۱۹۶۴ع -
۲- جنرل سیکرٹری اردو اکیڈمی مغربی پاکستان [جس کی بناء رکھنے والوں میں ڈاکٹر بشیر احمد مرحوم ڈی - ایس سی کے ساتھ آپ بھی شامل تھے] -
۳- رکن ترقی اردو بورڈ، کراچی -
۴- رکن مرکزی اردو بورڈ، لاہور -
۵- ٹرسٹی انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی -
۶- رکن مجلس ترقی ادب، لاہور -
۷- رکن مرکزی رائٹرز گلڈ -
۸- رکن بزم اقبال، لاہور -
۹- رکن مجلس زبان دفتری حکومت مغربی پاکستان -
۱۰- ناظم اعلیٰ انجمن ترقی اردو، لاہور -
۱۱- اعزازی پرنسپل و بانی اردو کالج، لاہور -

تعلیمی اور تنظیمی سرگرمیاں

۱- جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم تاریخ کانفرنس پشاور ۱۹۴۵ع -
۲- جنرل سیکرٹری کل پاکستان بین الاقوامی اورینٹل کانفرنس ۱۹۵۵ع -

۳- جنرل سیکرٹری اردو کانفرنس پنجاب یونیورسٹی ۱۹۴۸ع -
۴- جنرل سیکرٹری اردو ذریعہ تعلیم کانفرنس لاہور ۱۹۶۰ع -
۵- صدر استقبالیہ اردو تدریس کانفرنس لاہور ۱۹۶۱ع -
۶- جنرل سیکرٹری عربی کانفرنس لاہور ۱۹۶۴ع -
۷- قومی زبان سائنس کانفرنس لاہور ۱۹۶۳ع -
۸- صدر مجلس تجاویز اردو تدریس کانفرنس کراچی ۱۹۶۴ع -
۹- صدر استقبالیہ دفتری زبان کانفرنس لاہور ۱۹۶۵ع -
۱۰- جنرل سیکرٹری عربی فارسی کانفرنس لاہور ۱۹۶۶ع -

اداروں کی ترقی

۱- شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی ' (ڈاکٹر صاحب ہی اس شعبے کے پہلے صدر تھے اور اس کے قیام کے بعد اساتذہ کی شدید کمی کے باوجود شعبے کو رواں رکھا اور اسے استحکام بخشا) -

۲- ڈاکٹر صاحب مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کے بانیوں میں ہیں ' اور اب اس کے تا حیات جنرل سیکرٹری ہیں -

اکیڈمی نے ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں قاموس الاصطلاحات' لغات قانونی' لغات طب اور سائنس کی چھوٹی بڑی بیس کتابیں شائع کی ہیں - اب سات مختلف سائنسی علوم کے انسائیکلوپیڈیا آپ کی نگرانی میں زیر تدوین ہیں -

۳- **اردو کالج لاہور** جاری کیا - (اس میں سائنس اردو میں پڑھائی جاتی ہے) -

۴- اورینٹل کالج لاہور کو ترقی دینے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی' یہاں تک کہ بڑی سخت مخالفتیں بھی مول لیں ' جب پرنسپل ہوئے تو کالج میں تقریباً ڈیڑھ سو طلبا تھے - جب رخصت پر آئے تو اس سال ۸۰۰ طلباء تھے - جب کالج کی ہستی خطرے میں تھی اس کا تحفظ کرکے اس ادارے کے وقار اور شہرت میں اضافہ کیا اور اس کو ایک بلند پایہ علمی و تعلیمی ادارہ بنایا -

۵- شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کو ترقی دے کر دنیا کے بہترین شعبوں تک پہنچا دیا - ۱۹۶۵ع میں ایم - اے اردو میں تقریباً چار سو طلباء تھے -

۶- یونیورسٹی میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اردو ' انہی کی تجویز سے شروع ہوا اور پانچ سال اس کی ابتدائی تنظیم انہوں نے کی اور اس کے پہلے کنوینر بھی رہے -

۷- یونیورسٹی میں ۱۹۴۹ع میں اردو رسم الخط کمیٹی کی بنیاد ڈالی۔

۸- ۱۹۴۷ع میں ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد انہیں آنریری لائبریرین یونیورسٹی بنایا گیا۔ اس زمانے میں انھوں نے بارہ افراد کی جگہ صرف چار کلرکوں سے کام لے کر، لائبریری کو رواں رکھا — کئی متروکہ کتب خانے حاصل کیے، ان کو محفوظ کیا اور مطالعے کے قابل بنایا۔

۹- ڈاکٹر صاحب نے علوم مشرق اور اردو کے فروغ و ترقی کے لیے طویل جد و جہد کی، اردو ذریعۂ تعلیم کے لیے مسلسل کام کیا اور اب بھی اور دفتری دائرے میں اردو کو رائج کرانے کے لیے خاموش مگر مؤثر کام کر رہے ہیں۔

(الف) مطبوعہ تصانیف:

۱- ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ	(انجمن ترقیٔ اردو، ہند)
۲- اردو ادب جنگ عظیم کے بعد	(اردو اکیڈمی، لاہور)
۳- نوادرالفاظ خان آرزو مع مقدمہ	(انجمن ترقیٔ اردو، پاکستان)
۴- Urdu Prose Urder the influence of Sir Syed.	(شیخ محمد اشرف، لاہور)
۵- لطائف نامہ فخری مع مقدمہ و حواشی	(اورینٹل کالج میگزین)
۶- شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن	(مکتبۂ جدید، لاہور)
۷- بحث و نظر	(مکتبۂ اردو، لاہور)
۸- نقد میر	(آئینۂ ادب، لاہور)
دوسرا ایڈیشن	(اردو مرکز، لاہور)
۹- تعلیم کے مقاصد	(آئینۂ ادب، لاہور)
(اردو ترجمہ Aims of Education by White Head)	
۱۰- مقامات اقبال	(ناشرین، لاہور)
طبع دوم	(لاہور اکیڈمی)
۱۱- ولی سے اقبال تک	(مکتبۂ جدید، لاہور)
دوسرا ایڈیشن	(لاہور اکیڈمی)
تیسرا ایڈیشن	نئے اضافوں کے ساتھ (مکتبہ خیابان، ادب لاہور)

۱۲- سرسید احمد خاں اور اُن کے رفقاء (مکتبۂ کاروان، لاہور)
۱۳- تذکرۂ مردم دیدہ (حاکم لاہوری) (پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور)
۱۴- نل دمن، احمد سراوی (اوریئنٹل کالج میگزین)
۱۵- ارمغان علمی (مجلس ارمغان علمی، لاہور)
۱۶- Descriptive Catalogue of Persian Manuscripts in the Pb. University Library in (2 Parts). (پنجاب یونیورسٹی)
۱۷- مباحث (مجلس ترقیٔ ادب، لاہور)
۱۸- میر امن سے عبدالحق تک (مجلس ترقیٔ ادب)
۱۹- مرآة الاصطلاح آنند رام مخلص (اوریئنٹل کالج میگزین)
۲۰- مثمر، خان آرزو (اوریئنٹل کالج میگزین)
۲۱- چند نئے اور پرانے شاعر (اردو مرکز، لاہور)
۲۲- اشارات تنقید (مکتبہ خیابان ادب، لاہور)
۲۳- اردو ادب ۱۸۵۷ع سے ۱۹۵۸ع تک (مکتبہ خیابان ادب، لاہور)
۲۴- تعلیمی خطبات (مجلس ارادت مندان سید)
۲۵- درخت اور دریچے (دارالادب لاہور)

نوٹ: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کی بیس مطبوعات ڈاکٹر سید عبداللہ کی ادارت اور نگرانی میں طبع ہوئیں۔

(ب) تصانیف و زیر طبع ترتیب:

۱- اردو نثر کا آہنگ (زیر ترتیب)
۲- اردو تنقید — کل اور آج (زیر ترتیب)
۳- اقبال مکمل (زیر ترتیب)
۴- میر — اپنے زمانے کے آئینے میں (زیر ترتیب)

(ج) مطبوعہ تحقیقی و تنقیدی مقالات:

فارسی:

عہد محمد تغلق کے مصنفین (اوریئنٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۲۷ع)
ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں فارسی کی حالت (اوریئنٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۱ع)
(انگریزی ترجمہ پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل میں شائع ہوا)
میر علی، حالات و تصانیف (اوریئنٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۲۷ع)
" (" " " ۱۹۳۱ع)
" (" " اگست ۱۹۳۴ع)

فارسی کی مثالیہ شاعری (اورینٹل کالج میگزین ، نومبر ۱۹۳۰ء)
ادبیات ایران در عصر حاضر (اورینٹل کالج میگزین ، مئی ۱۹۳۷ء)
فارسی شاعری میں صداقت (اورینٹل کالج میگزین ، مئی ۱۹۳۹ء)
فارسی شاعری اور مسائل حیات (اورینٹل کالج میگزین ، مئی ۱۹۴۰ء)
فارسی شاعری میں گل و گلزار کی
حقیقت (اورینٹل کالج میگزین ، نومبر ۱۹۴۱ء)
" (" فروری ۱۹۴۲ء)
فن انشائے فارسی (اورینٹل کالج میگزین ، ۱۹۴۷ء)

اُردو :

عہد اسلامی کے پرانے آثار (اورینٹل کالج میگزین ، مئی ۱۹۳۰ء)
کیا غزل ایک نیم وحشی صنف ادب
ہے (ادب لطیف ، فروری ۱۹۴۲ء)
قدیم عربی تصانیف میں ہندی الفاظ (اورینٹل کالج میگزین ، مئی ۱۹۴۳ء)
اُردو کی ترقی میں خان آرزو کا حصہ (اورینٹل کالج میگزین ، نومبر ۱۹۴۳ء)
اُردو کا جرمن شاعر فراسو (اورینٹل کالج میگزین ، مئی ۱۹۴۴ء)
شہر آشوب — اردو کی سیاسی اور قومی شاعری کا ایک رخ
(حصہ اول) رسالہ اُردو انجمن ترقی اُردو ہند ، جولائی ۱۹۴۵ء)
(حصہ دوم) ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین ، نومبر ۱۹۴۵ء
مسلمان اور سنسکرت (یہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی سنسکرت سوسائٹی میں پڑھا گیا تھا - مسلمانوں نے سنسکرت اور سنسکرتی علوم سے جن جن صورتوں میں اعتناء کیا یہ اس کا مطالعہ ہے) (اورینٹل کالج میگزین ، فروری ۱۹۴٦ء)
(اورینٹل کالج میگزین ، مئی ۱۹۴٦ء)
پروفیسر شیرانی کا علمی و تحقیقی کام (رسالہ اردو ، انجمن ترقی ہند ۱۹۴٦ء)
ہمارے شاعروں کا مجلسی رتبہ (شعرائے اردو و فارسی کے ماحول کا تاریخی مطالعہ) (ہمایوں جنوری ، ۱۹۴۷ء)
تخلص ، ہماری شاعری کی قدیم اور
دلچسپ رسم (اورینٹل کالج میگزین ، مئی ۱۹۴۷ء)
شعرائے قدیم کی علمی استعداد (شعرائے اُردو و فارسی کی تحصیلات کا علمی جائزہ)
(اورینٹل کالج میگزین ، اگست ۱۹۴۷ء)

تذکروں کی اہمیت تنقید کے نقطۂ نظر سے (تذکرہ دولت شاہ کا مطالعہ) (اورینٹل کالج میگزین ، فروری ۱۹۴۸ع)

قدیم تذکروں کا تنقیدی عنصر (لباب الالباب عوفی کا مطالعہ) (اورینٹل کالج میگزین ، اگست ۱۹۴۸ع)

پاکستان میں اردو کا پہلا سال (ہمایوں سالگرہ نمبر ، اگست ۱۹۴۸ع)

اردو اپنے نئے ماحول میں (ہمایوں سالگرہ نمبر ، ۱۹۴۸ع)

تذکرہ میں تنقیدی عنصر ۔ تحفہ سامی کا مطالعہ (اورینٹل کالج میگزین ، فروری ۱۹۴۹ع)

میر کا رنگ طبیعت (رسالہ اردو، انجمن ترقی اردو جولائی ۱۹۴۹ع)

غالب کے جدید تذکرہ نگار (اورینٹل کالج میگزین ، اگست ۱۹۴۹ع)

میر کا انداز (رسالہ اردو، انجمن ترقی اردو، اکتوبر ۴۹ع)

فارسی کے زیر سایہ اردو کی ترقی (" " " ")

" پین اسلام " کیا ہے؟ یہ مقالہ اسلام ریسرچ انسٹیٹوٹ کے ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا ۔ مطبوعہ ۳۴ صفحات ۔

اسلامی تربیت و تعلیم ۔ پنجاب ایجوکیشنل جرنل میں شائع ہوا ۔

مسلمانان ہند کے زوال کے داخلی اسباب ۔ 'برہان' دہلی ۔

صنائع بدائع کی نئی تقسیم جمالیاتی نقطۂ نظر سے (اورینٹل کالج میگزین ، مئی ۱۹۴۹ع)

غالب کی نثر (عالمگیر ، مارچ ۱۹۴۹ع)

دردکی شاعری کا صوفیانہ لب و لہجہ (ادب لطیف ، سالنامہ ۱۹۵۰ع)

غرائب اللغات ہانسوی کی قدر و قیمت (اورینٹل کالج میگزین ، نومبر ۱۹۵۰ع)

میر محسن کی محاکمات الشعراء میں زبان اردو کے متعلق مفید باتیں (اورینٹل کالج میگزین ، نومبر ۱۹۴۰ع)

شبلی کا اسلوب بیان (اردو ، اپریل ۱۹۵۱ع)

غالب کی غزل (ادب لطیف ، سالنامہ ۱۹۵۱ع)

اقبال صاحب (پروفیسر محمد اقبال مرحوم کے علمی کام کا تجزیہ) (اورینٹل کالج میگزین ، اقبال نمبر)

غالب اور میر کی ہم طرح غزلیں (ادب لطیف ، مارچ ۱۹۵۲ع)

میر کی مثنوی نگاری (ادب لطیف، سالنامہ نمبر ۱۹۵۲ع)

حالی کا تصور اسلوب	(اردو ، حالی نمبر ۱۹۵۲ع)
سرسید کا نیچرل بیان	(خاور ، ڈھاکہ ، جون ۱۹۵۲ع)
فارسی شاعری کی اقدار	(Orient مجلہ انٹرنیشنل کانگرس)
اردو میں سوانح نگاری سرسید کے زمانے میں	(ماہ نو ، اگست ۱۹۵۲ع)
اردو کی مزید ترقی کے امکانات	(ماہ نو ، جولائی ۱۹۵۳ع)
سرسیداحمد خاں کے افکارو تصورات	(ادب لطیف، سالنامہ ۱۹۵۳ع)
ادب کا قدیم تصور	(مشرب ، جولائی ۱۹۵۳ع)
اردو مثنوی کا دکنی دور	(اوریئنٹل کالج میگزین)
شبلی ، مؤرخ یا سوانح نگار ؟	(رسالۂ مشرب)
سرسید کی مقالہ نگاری	(رسالہ دستور)
ابوالکلام کا طرز نگارش	(رسالہ ادب لطیف)
دیوان غالب کا ایک نادر نسخہ	(ماہ نو ، کراچی)
جمال دوست، اسلوب پرست ولی	(برگ گل ، کراچی)
میر کے قبول عام کے اسلوب	(اردو کراچی)
مرزا غالب کا حاسۂ انتقاد	(ماہ نو، کراچی)
حیات جاوید (حالی) پر ایک نظر	(ادبی دنیا ، لاہور)
تقلید میر یا شارع عام	(ماہ نو، کراچی)
پروفیسر شیرانی	(نقوش لاہور ، شخصیات نمبر)
میر اور نیرنگ عناصر	(ماہ نو کراچی، مئی ۱۹۵۵ع)
ادب میں جمالیاتی عنصر	(رسالہ دو میل، گورنمنٹ کالج، مظفرآباد)
شاعری، جنون یا عمد	(سالنامہ ادب لطیف، لاہور، مارچ ۱۹۵۵ع)
سرسید کا اثر اردو ادبیات پر	(علی گڑھ میگزین ، سرسید نمبر ، ۱۹۵۵ع)
آتش—محض مرصع ساز یا شاعر بھی	(نیا دور، کراچی)
ایک صدی کی ادبی تحریکیں	(سالنامہ چٹان ، لاہور)
تہذیب الاخلاق کی اہمیت	(برگ گل کراچی، سرسید نمبر)
میر اور نقاش کا فن	(سالنامہ ادب لطیف ، ۱۹۵۶ع)
اردو شاعری کا گزشتہ ایک سال	(ماہ نو کراچی، استقلال نمبر)
خیال اور تخئیل	(تخلیق کراچی ، اگست ۱۹۵۶ع)
میر کا ایک نقاد—محمد حسین آزاد	(ادب لطیف ، لاہور)

اقبال کا ایک ممدوح—نظیری	(ماہ نو ، کراچی)
داغ کا اشک غم	(خیال ، لاہور)
اقبال و حافظ کے ذہنی فاصلے	(صحیفہ ، لاہور)
۱۹۵۷ع کا ایک مرثیہ خواں (ظہیر دہلوی)	(ماہ نو ، کراچی)
غدر ، سرسید کی نظر میں	(امروز ، جنگ آزادی نمبر)
ناسخ کی منسوخ شاعری	(نئی تحریریں ، لاہور ۱۹۵۷ع)
کاغذی پیراہن ، نئی قدریں	(حیدرآباد ، سندھ ۱۹۵۷ع)
میر کے کلام میں فکر و نظر کا عنصر	(علی گڑھ میگزین ۱۹۵۷ع)
اردو تنقید ۱۹۵۸ع میں	(سالنامہ ادب لطیف ۱۹۵۸ع)
اردو خط نگاری	(نقوش ، لاہور ۱۹۵۸ع)
محسن الملک	(نقوش ، لاہور ۱۹۵۸ع)
ادب یا دکھوں کی تجارت	(استقلال ، لاہور ۱۹۵۸ع)
انشاء و مصحفی کی نزاع	(نئی قدریں، حیدرآباد سندھ ۱۹۵۸ع)
شبلی کے کام کی مجموعی قدر و قیمت	(البصیر، اسلامیہ کالج چنیوٹ ۱۹۵۸ع)
دیباچہ، سرو چراغاں (دیوان جمیل ملک)	(گوشۂ ادب ، لاہور ۱۹۵۸ع)
غزل ، غزلیت اور تغزل	(صحیفہ، جولائی ۱۹۵۸ع)
Oriental Studies in Pakistan	(West Pakistan, Lahore)
Urdu Literature after Pakistan	,, ,, ,,
Ibne Khaldoon on Education	,, ,, ,,
حالی کی قطعہ نگاری	(نقوش ، لاہور ۱۹۵۸ع)
قصیدہ ایک فن ، ایک اسلوب تعمیر	(سات رنگ ، کراچی)
تخلیق عمل اور ذوق سلیم	(ہم قلم ، کراچی ۱۹۵۸ع)
اردو مثنویات میں قصہ پن	(قند افسانہ نمبر ، ۱۹۵۹ع)
شاعری خرافات سے سائنس تک	(ادب لطیف ، ۱۹۵۹ع)
حالی کی نثر نگاری	(فروغ اردو، لکھنئو، حالی نمبر ۱۹۵۹ع)
حقی کی غزل—ایک نیا ذائقہ	(ادب لطیف ، نومبر ۱۹۵۹ع)
امیر خسرو ایک مؤرخ	(آستانۂ زکریا ، ملتان ۱۹۵۸ع)
سیرت سے متعلق ادب اور اس کی اہمیت	(پرچم ، کراچی ۱۹۵۹ع)

ابوالکلام ، امام عشق و جنوں (سویرا ، لاہور جولائی ۱۹۵۹ع)
بخاری پر ایک دھندلی سی نظر (امروز ، اکتوبر ۱۹۵۹ع)
میر کے بعد غالب میرا دوست (ادب لطیف ، لاہور اکتوبر ۱۹۵۹ع)
اردو کی صلاحیتیں (ادب لطیف ، لاہور ۱۹۵۹ع)
مرحوم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا حکیمانہ ادب (ثقافت ، لاہور مارچ ۱۹۶۰ع)
آتش خنداں، ایک تیموری شہزادے کا کلام (ادب لطیف ، اگست ۱۹۶۰ع)
ڈاکٹر عبدالحق کا اسلوب تحریر (برگ گل ، کراچی ۱۹۶۰ع)
میر کی اہمیت ہمارے زمانے میں (صحیفہ ، لاہور اگست ۱۹۶۰ع)
تحقیق و تنقید کے مقام اتصال (ہم قلم ، مئی ۱۹۶۱ع)
ہماری تعلیم میں سائنس اور سائنسیت (لیل و نہار ، فروری ۱۹۶۱ع)
خیالات اکبر پر ایک تحریر (ادب لطیف ، لاہور فروری ۱۹۶۱ع)
اردو رسم الخط (نوائے وقت ، لاہور مارچ ۱۹۶۱ع)
Poetic Artistory of Iqbal (سول ملٹری گزٹ ، ۱۹۶۱ع)
Secularism in Islam (پاکستان ٹائمز، لاہور ۴ اگست ۱۹۶۱ع)
Good bye Arabic Numeral (سول ملٹری گزٹ ، لاہور اگست ۱۹۶۱ع)
ریاضی کی عربی روایت الوداع (نوائے وقت ، لاہور ۴ اگست ۱۹۶۱ع)
اردو رسم الخط کی فلسفیانہ بنیادیں (محور ، لاہور ۱۹۶۱ع)
مجید امجد کی شاعری (سالنامہ ادب لطیف ، ۱۹۶۱ع)
اقبال کا فن شعر (اقبال ، کراچی ۱۹۶۱ع)
بابائے اردو مولوی عبدالحق (پاکستان ٹائمز ، لاہور اگست ۱۹۶۱ع)
قصۂ آں شبے (امروز ، لاہور ستمبر ۱۹۶۱ع)

اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لیے مندرجہ ذیل موضوعات پر مقالے لکھے :

(۱) سر سید ۔
(۲) خواجہ میر درد ۔
(۳) شبلی نعمانی ۔
(۴) میر محمد تقی میر ۔
(۵) نظیری ۔
(۶) ظہوری ۔
(۷) ناسخ ۔
(۸) اردو غزل ۔
(۹) اردو مثنوی ۔
(۱۰) تخلص ۔

(د) مقالات کی نگرانی :

ایم - اے کے مقالات

۱۹۵۰ع :

مس سعدیہ	اردو رباعی کا ارتقاء
ا - د - نسیم	خواجہ میر درد اور تصوف

۱۹۵۱ع :

۱- محمد فضل قدیر	Translation of the 1st Chapter of "Meaning of Art" by Herbert Read

۱۹۵۲ع :

۲- الطاف فاطمہ	اردو میں سوانح نگاری کا ارتقاء
۳- منظورالحق صدیقی	اقبال کے کلام میں حکمرانوں کا تذکرہ

۱۹۵۳ع :

۴- قاضی نصیر احمد	مولوی نذیر احمد کی مذہبی تصانیف پر ایک تنقیدی نظر

۱۹۵۴ع :

۵- سعیدہ اختر	اسمٰعیل میرٹھی
٦- حبیبہ اختر	نذیر احمد بحیثیت انشا پرداز
۷- ایم - اے مجید یزدانی	ابوالکلام آزاد کی نثر
۸- محمد اقبال گل	اردو مثنویوں میں مثنوی زہر عشق
۹- بشیر الدین احمد	سودا کی قصیدہ نگاری

۱۹۵۵ع :

۱۰- مس سیدہ ناصرہ خاتون	ابوالاثر حفیظ جالندھری
۱۱- غلام حسین خاں	مولانا ظفر علی خاں

۱۹۵٦ع :

۱۲- عبدالغفور	شرر کی انشا پردازی
۱۳- مس شمیم اختر	اردو میں بچوں کا ادب
۱۴- مس مہرالنساء یوسف	Translation of Wordsworth's Prefaces (58 pages)

۱۹۵۷ء :

۱۵- سید بنیاد حسین شاہ	لیسنگ کی کتاب Lakoon کے سات ابواب کا اردو ترجمہ
۱٦- اظہر محمد خاں	سر عبدالقادر
۱۷- نصیر انور	میتھیو آرنلڈ کے دو مضامین کا اردو ترجمہ
۱۸- اکمل علیمی	اردو میں مضمون نگاری کا ارتقاء

۱۹٦۰ء :

۱۹- راحت افزا بخاری	ذوق کی شاعری
۲۰- صفورا سلطانہ	مکاتیب اقبال کی فکری و فنی اہمیت
۲۱- انیس ناگی	آزاد نظم سرود نو سے استانزے تک

۱۹٦۲ء :

۲۲- ساجدہ پروین	اقبال کی امیجری (اردو کلام کے حوالے سے)
۲۳- در شہوار	میر کی امیجری (پہلے تین دواوین کے حوالے سے)
۲۴- ممتاز عرشی	میر کی لفظی مصوری (دیوان چہارم، پنجم و ششم کے حوالے سے)
۲۵- خالدہ ناہید	اقبال کا شاعرانہ فن
۲٦- سید افسرحسین رضوی	میر محمد حسین تجلی

۱۹٦۳ء :

۲۷- مس اختری بیگم	اردو شاعری میں المیہ عناصر
۲۸- مس ندرت شبنم چغتائی	اردو شاعری میں خواتین کا حصہ
۲۹- انوار انجم	میرا جی

۱۹٦۴ء :

۳۰- مس تفسیر النعیم	اقبال اور غالب کا تقابلی مطالعہ
۳۱- مس پروین مسیح	میر و غالب کا تقابلی مطالعہ
۳۲- مس روزینہ احمد علی	اقبال اور مناظر فطرت
۳۳- مس قمر جبین	میر کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ

پی - ایچ - ڈی کے مقالات :

(ان میں سے بعض پر ڈگری مل گئی اور بعض پر کام جاری ہے)

۱- مہر عبدالحق آتش	ملتانی زبان اور اردو کے روابط

۲- محمد موسیٰ خاں کلیم — غالب—ایک جائزہ
۳- ا - د نسیم — اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر
۴- سید افتخار حسین شاہ — اردو نثر نگاروں کا دور بدور جائزہ اور ان کے اسالیب نثر کا خصوصی مطالعہ
۵- مسز خاور درانی — بہادر شاہ ظفر اور آن کا عہد
٦- مس صفیہ عبدالحق — غلام مصطفیٰ خاں شیفتہ اور آن کے معاصرین
۷- ارشاد احمد ارشد — اردو میں شخصی ' مذہبی اور قومی مرثیہ نگاری
۸- سید شبیر علی کاظمی — اقبال کا فلسفۂ عشق
۹- محمد اکبر علی — شمالی ہند کی منظوم داستانیں
۱۰- محمد صدیق چیمہ — اردو میں پنجاب کا حصہ
۱۱- خواجہ محمد اختر بیگ — آتش اور آن کا زمانہ
۱۲- کاظم حسین — نقد المرثیہ—بحوالہ مطالعۂ خصوصی انیس
۱۳- غلام حسین — اردو ادب کے سیاسی و عمرانی میلانات
۱۴- مہر النساء یوسف — Translation with Introduction and Marginal notes, of Lane Cooper's "Translation of Aristotle's Poetica."
۱۵- افتخار احمد صدیقی — مولوی نذیر احمد دهلوی اور آن کا ادب
۱٦- مرزا محمد منور — اردو کی دینی نثر
۱۷- راحت افزا بخاری — اردو شاعری کے ایک سو سال (۱۷۵۰ع—۱۸۵۷ع)

نوٹ : بورڈ میں پیش ہونے سے پہلے پی ایچ - ڈی کے طلبا کی رہنمائی کی تفصیل اس فہرست میں درج نہیں -

ہماری دیگر مطبوعات

اشارات تنقید
ڈاکٹر سید عبداللہ
قیمت ۸ روپے

ولی سے اقبال تک
ڈاکٹر سید عبداللہ
قیمت ۸ روپے

تعلیمی خطبات
ڈاکٹر سید عبداللہ
قیمت ۱۸ روپے

نوابی دربار
مرتبہ : ممتاز منگلوری
قیمت ۳/۵۰

اندرسبھا (امانت لکھنوی)
مرتبہ : ممتاز منگلوری
قیمت ۳/۵۰

مضامین سرسید (منتخبات تہذیب الاخلاق)
مرتبہ : ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
قیمت ۵ روپے

شاہ حاتم (حالات و کلام)
ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
قیمت ۹ روپے

باغ و بہار (میر امن)
مرتبہ : ممتاز منگلوری
قیمت ٦ روپے

ظفر علی خاں (ادیب و شاعر)
ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
قیمت ۷/۵۰

جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور